مئی 2012
جلد 40 شمارہ 1
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اُردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

مدیر

کہی سنی

خواتین ڈائجسٹ کا مئی کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

پچھلے دو ڈھائی عشروں میں جہاں بہت سی تہذیبی، معاشرتی اور مذہبی اقدار کو زوال آیا ہے۔ ان میں ایک انسانی جان کی حرمت کا ختم ہونا بھی ہے۔ کراچی شہر میں تو روزانہ دس، پندرہ افراد کا اندھی گولیوں کا نشانہ بن جانا معمول بن چکا ہے۔ ایسا معمول جس پر شاید لوگوں نے چونکنا اور سوچنا بھی چھوڑ دیا ہے۔

اپنوں کی جدائی کتنی کٹھن ہے، کتنی جان لیوا ہے۔ ایک انسان کے جانے سے کیسی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ یہ وہی جان سکتے ہیں جن کے اپنے ان سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جاتے ہیں۔

مئی کا مہینہ آتا ہے تو کتنی ہی یادیں ذہن کے پردوں پر اجاگر ہو جاتی ہیں۔ محمود ریاض صاحب کو رخصت ہوئے گیارہ سال بیت گئے لیکن ان کی کمی کا احساس آج بھی زندہ ہے۔

ریاض صاحب کی زندگی جہد مسلسل کا نمونہ تھی۔ انہوں نے عملی زندگی کا آغاز بہت کم عمری میں ہی کر دیا تھا۔ پبلشنگ سے آغاز کیا اور لارک پبلشرز کی بنیاد رکھی اور بہت سے اچھے اور معروف ادیبوں کی کتابیں شائع کیں۔

اس دور میں خواتین کے جو رسائل شائع ہو رہے تھے، وہ پرانی طرز کے تھے۔ وقت کے ساتھ زندگی میں جو تبدیلیاں آرہی تھیں، ان کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔

بہت کم وسائل کے ساتھ کوئی نیا تجربہ کرنا آسان نہیں ہوتا جبکہ بہت سی ذمہ داریاں بھی دامن گیر ہوں۔ ریاض صاحب نے خواتین ڈائجسٹ کا اجرا کیا تو حالات بہت سازگار نہ تھے۔ کئی معاشی اور دیگر پریشانیاں بھی لاحق تھیں مگر انہوں نے نہایت حوصلے اور ہمت سے اس راہ پر قدم رکھا۔

خواتین ڈائجسٹ اپنی نوعیت کا پہلا پرچا تھا جس میں خواتین کے مسائل اور عملی زندگی میں درپیش مشکلات کو سامنے رکھ کر ان کا حل پیش کیا گیا تھا۔ بنیادی طور پر یہ گھر اور چار دیواری کا پرچا تھا۔ ریاض صاحب نے اپنی نکھری ہوئی سوچوں اور مثبت انداز فکر سے جو راہ متعین کی اس نے بے شمار خواتین کی سوچوں کو وسعت دی، انہیں ایک نیا رخ اور جہت عطا کی۔ خواتین ڈائجسٹ کے بعد شعاع اور کرن اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔

یہ ماہنامے بے شمار خواتین کی تخلیقی صلاحیتیں سامنے لانے کا ذریعہ بنے۔ آج الیکٹرانک میڈیا پر جو نام سب سے زیادہ مقبول ہیں، وہ ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے ذریعے ہی سامنے آئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں کہ ریاض صاحب کے بعد ادارہ خواتین ڈائجسٹ نے ان کے متعین کردہ اصول سے انحراف نہیں کیا اور آج بھی بڑی کامیابی کے ساتھ اسی راہ پر گامزن ہے۔

10 مئی کو ریاض صاحب کی برسی کے موقع پر قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- فرحت اشتیاق کا مکمل ناول۔ جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو،
- صباحت یاسمین کا مکمل ناول۔ مزاحمت،
- رشدہ خالدہ کا مکمل ناول۔ ان ہی راستوں پر،
- نزہت شبانہ حیدر اور راحت جبیں کے ناولٹ،
- عائشہ فیاض، فارحہ ارشد، سعدیہ غزل اور امثل عزیز شہزاد کے افسانے،
- عنیزہ سید اور نگہت عبداللہ کے ناول،
- ٹی وی کی معروف فنکارہ تحریم زبیری سے ملاقات،
- خوشبو کا سفر کے اہم کردار تقی احمد سے باتیں،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر دلچسپیاں شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کے اس شمارے کے بارے میں آپ کی رائے جاننے کے لیے آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔ اپنی رائے ضرور لکھیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی [illegible] تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے [illegible] رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے۔ اس لیے ان [illegible] دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

صبر کا بیان

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا۔ "اے ایمان والو! صبر کرو اور دشمن کے مقابلے میں ڈٹے رہو۔"

اور فرمایا۔

"ہم تمہیں کسی قدر خوف سے، بھوک سے، مالوں، جانوں اور پھلوں میں کمی کر کے ضرور آزمائیں گے اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دیجیے۔" (البقرہ 155)

اور فرمایا۔

"صبر کرنے والوں کو ان کا پورا اجر بغیر حساب کے دیا جائے گا۔" (الزمر۔10)

اور فرمایا۔

"اور البتہ جس شخص نے صبر کیا اور معاف کر دیا تو یقیناً یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے۔" (الشوریٰ 43)

اور فرمایا۔

"صبر اور نماز کے ذریعے سے مدد طلب کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" (البقرہ-153)

اور فرمایا۔

"اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے، یہاں تک کہ ہم جان لیں کہ تم میں سے جہاد کرنے والے اور صبر کرنے والے کون ہیں۔" (محمد۔ 31)

اور وہ آیات جن میں صبر کرنے کا حکم اور اس کی فضیلت کا بیان ہے بہت زیادہ اور معروف ہیں۔

فوائد آیات

ان آیات میں صبر کی تاکید بھی ہے اور اس کی فضیلت کا بیان بھی۔ صبر کی کئی قسمیں ہیں۔

1۔ صبر کی ایک قسم ہے، دنیوی آفات و مصائب اور نقصانات کو قضائے الٰہی سمجھ کر برداشت کر لینا اور ان پر جزع فزع یا نوحہ و ماتم نہ کرنا اور نہ زبان ہی سے ایسی بات نکالنا جس میں اللہ کی ناراضی کا پہلو ہو۔ اس کو

تسلیم و رضا بھی کہتے ہیں۔
2۔ دوسری قسم ہے جہاد کی مشقتوں اور تکلیفوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا اور دشمن کے مقابلے میں ڈٹے رہنا' راہ فرار اختیار نہ کرنا۔ یہ شجاعت و مردانگی اور شیوہ مسلمانی ہے۔
تیسری قسم ہے اللہ کے احکامات پر عمل کرنے میں جو آزمائشیں آئیں جن لذتوں اور دنیوی مفادات کی قربانی دینی پڑے اور جو ملامتیں سننی پڑیں' ان میں سے کسی چیز کی پروانہ کی جائے' بلکہ سب کو اللہ کی رضا کے لیے برداشت کیا جائے۔ اسے استقامت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

طہارت و پاکیزگی

ابو مالک حارث بن عاصم اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"پاکیزگی نصف ایمان ہے۔ (یعنی اجر و ثواب میں آدھے ایمان کے برابر ہے۔) اور الحمدللہ کہنا میزان کو بھر دیتا ہے۔ (یعنی بہت وزنی عمل ہے جس کے اجر و ثواب سے میزان اعمال بھاری ہو جائے گی۔) اور سبحان اللہ اور الحمدللہ کہنا' یہ آسمان و زمین کے درمیانی خلا کو بھر دیتا ہے اور نماز روشنی ہے۔ (جس سے اسے دنیا میں حق کی طرف رہنمائی ملتی ہے اور آخرت میں پل صراط سے گزرتے وقت بھی یہ روشنی مومن کے کام آئے گی۔) اور صدقہ دلیل ہے۔ (اس بات پر کہ اس کا ادا کرنے والا مومن ہے۔) صبر روشنی ہے۔ قرآن تیرے لیے حجت (دلیل) ہے۔ (اگر اس پر عمل کیا جائے۔) بصورت دیگر تیرے خلاف دلیل ہے۔ ہر ایک صبح صبح اپنے کاموں میں نکلنے والا ہے اور وہ اپنے نفس کا سودا کرتا ہے' چنانچہ اسے (عذاب سے) آزاد کرنے والا ہے یا اس کو (اللہ کی رحمت سے محروم کر کے) ہلاک کرنے والا ہے۔"

فوائد و مسائل

1۔ پاکیزگی کی فضیلت۔ اس سے ہر قسم کی پاکیزگی و طہارت مراد ہے اور ایمان سے مراد' ایمان ہی کی حقیقت ہے۔ بعض کے نزدیک یہاں ایمان سے مراد نماز ہے' طہارت' نماز کے لیے ضروری ہے' اس لیے اسے آدھی نماز کہا گیا ہے۔
1۔ روز قیامت انصاف کا ترازو لگے گا اور اچھے برے اعمال کا وزن ہو گا۔ اعمال خیر میں سے ذکر الٰہی کا وزن سب سے زیادہ ہو گا۔ اس کے لیے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے' نہ کچھ خرچ ہی ہوتا ہے۔ تھوڑی سی کوشش سے انسان ڈھیروں نیکیاں ایسے وقت کے لیے جمع کر لیتا ہے' جب ایک نیکی کی کمی یا زیادتی سے جنت یا جہنم کا فیصلہ ہو گا۔ اس سے ذکر الٰہی کی فضیلت کا با آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔
3۔ کثرت نماز کی ترغیب۔ اس لیے کہ یہ ایسی روشنی ہے' جس سے مسلمان کو قدم قدم پر رہنمائی ملتی ہے۔ نیز یہ بے حیائی اور منکر کاموں سے روکتی ہے۔
4۔ صدقہ ایک مومن کے صدق اور اخلاص کی دلیل ہے۔
5۔ صبر کی فضیلت۔ یہ بھی مومن کا ایک بڑا ہتھیار ہے' جس سے اسے استقامت نصیب ہوتی ہے۔
6۔ قرآن کریم انسان کے لیے نجات کا ذریعہ بھی ہے اور ہلاکت کا سبب بھی۔ اس پر عمل کرنے میں نجات ہے اور اس سے اعراض ہلاکت ہے۔
7۔ انسان اپنے نفس کو بے کار نہ چھوڑے' بلکہ اسے عمل میں لگائے رکھے۔ عمل بھی عمل صالح' ورنہ برے عملوں کا مطلب اس کی تباہی کا باعث ہے۔
8۔ انسان اپنی حیات مستعار کو اطاعت پر صرف کرے۔

بے نیازی

حضرت ابو سعید سعد بن مالک بن سنان خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ۔
انصار کے کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ طلب کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں عطا کیا۔ انہوں نے پھر سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پھر دیا۔ حتیٰ کہ آپ کے پاس جو کچھ تھا' ختم ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت ہر چیز جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں تھی خرچ کر دی تو ان سے فرمایا۔
"میرے پاس جو مال بھی ہوتا ہے' میں وہ تم سے ہرگز بچا کر نہیں رکھتا اور جو شخص سوال سے بچنے کی کوشش کرتا ہے' اللہ اسے بچا لیتا ہے۔ جو بے نیازی اختیار کرتا ہے' اللہ تعالیٰ اسے (لوگوں سے) بے نیاز کر دیتا ہے اور جو صبر کا دامن پکڑتا ہے' اللہ اسے صبر کی توفیق دے دیتا ہے۔ کسی شخص کو ایسا عطیہ نہیں دیا گیا جو صبر سے زیادہ بہتر اور وسیع تر ہو۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جود و کرم' سماحت اور مکارم اخلاق کے بیان کے علاوہ صبر و قناعت اور استغنا اختیار کرنے' دست سوال دراز کرنے سے بچنے اور خودداری کو برقرار رکھنے کی ترغیب و تلقین ہے۔
2۔ صبر نہایت قابل تعریف وصف ہے۔ بعض نصیبے والوں کو اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل سے عنایت کر دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص کوشش کر کے حاصل کرنا چاہے تو اللہ اسے بھی نوازتا ہے' اس لیے ایک لحاظ سے یہ کسبی بھی ہے۔ احنف بن قیس کے حلم و صبر پر لوگ حیرت کرتے تو انہوں نے ایک روز فرمایا۔ "مجھے بھی اسی طرح غصہ آتا ہے' لیکن میں صبر کرتا ہوں اور میں نے یہ صبر و حلم قیس بن عاصم منقری سے سیکھا ہے۔ وہ اس طرح کہ ایک دفعہ ان کے بھتیجے نے ان کے بیٹے کو قتل کر دیا۔ پولیس قاتل کو پکڑ کر لائی اور انہوں نے اس کی مشکیں باندھ رکھی تھیں۔ قیس نے دیکھ کر کہا۔ "تم نے نوجوان کو پریشان کیا ہے۔ اسے کھول دو۔" پھر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "نوجوان تو نے نہایت برا قدم اٹھایا ہے۔ اپنی قوت کو کمزور کیا ہے اور دشمن کو ہنسایا ہے۔" پھر کہا۔ "اسے چھوڑ دو اور لڑکے کی ماں کو دیت ادا کر دو۔" کہتے ہیں وہ لڑکا چلا گیا' لیکن قیس نے اس پوری گفتگو کے دوران اپنی ہیئت بھی نہ بدلی اور نہ اس کے چہرے کے رنگ بدلے۔"

مومن کا معاملہ

حضرت ابو یحییٰ صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اس کے ہر کام میں اس کے لیے بھلائی ہے اور یہ چیز مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ اگر اسے خوش حالی نصیب ہو تو (اس پر اللہ کا) شکر کرتا ہے تو یہ (شکر کرنا بھی) اس کے لیے بہتر ہے۔ (یعنی اس میں اجر ہے) اور اگر اسے تکلیف پہنچے تو صبر کرتا ہے' اور یہ (صبر کرنا بھی) اس کے لیے بہتر ہے (کہ صبر بھی بجائے خود نیک عمل اور باعث اجر ہے۔)"

فوائد و مسائل

1۔ مصائب و مشکلات انسانی زندگی کا لازمہ ہیں' کیونکہ دنیا انسان کی آرام گاہ نہیں' بلکہ یہ مسافر خانے کی حیثیت رکھتی ہے۔ لاکھوں انسان سکون کی تلاش میں دار آخرت کو سدھار گئے۔ دنیا اسی طرح ختم ہو رہی ہے اور ہو جائے گی۔
2۔ دنیا میں دو طرح کے انسان آباد ہیں۔ ایک فرماں بردار و مومن اور دوسرے منکر۔ منکروں کے لیے مصائب دنیا بطور سزا ہوتے ہیں اور فراوانی اور خوش حالی کفر اور سرکشی میں مزید اضافہ کرنے کے لیے' جبکہ مومن کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اسے پہنچنے والے مصائب و آلام بھی اس کی تطہیر کے لیے اور اس کی خوش حالی اور فراوانی نیکیوں میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ عسر و یسر' خوش حالی و تنگی' دونوں حالتوں میں صبر و شکر سے کام لیتا ہے۔ چنانچہ خوش حالی میں اللہ کو بھول جانا' اس کی نعمتوں کا شکر کرنے کے بجائے اس کی نافرمانی کرنا' اسی طرح تکلیف اور مصیبت کے وقت صبر کے بجائے جزع و فزع' اللہ کی قضا و قدر پر برہمی کا اظہار اور گلے شکوے کرنا' مومنانہ شیوہ اور کردار نہیں ہے۔

صبر

حضرت ابو زید' اسامہ بن زید بن حارثہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب اور محبوب کے بیٹے سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی نے آپ کی طرف پیغام بھیجا کہ۔

"میرے بیٹے کا آخری وقت ہے' آپ تشریف لائیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغام بھیجا کہ وہ سلام کہتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ لے' وہ بھی اسی کا ہے اور جو دے' وہ بھی اسی کا ہے۔ اس کے ہاں ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے' اس لیے انہیں چاہیے کہ صبر کریں اور اللہ سے ثواب کی امید رکھیں۔"

صاحبزادی نے پھر پیغام بھیجا اور قسم دیتے ہوئے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور تشریف لائیں۔

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم' سعد بن عبادہ' معاذ بن جبل' ابی بن کعب' زید بن ثابتؓ اور کچھ دیگر افراد کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے۔ بچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی گود میں بٹھالیا۔ جبکہ اس کی جان بے چین اور مضطرب تھی۔ (اس کی یہ حالت دیکھ کر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو جاری ہوگئے تو حضرت سعدؓ نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ کیا ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "یہ جذبہ شفقت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھا ہے۔"

اور ایک روایت میں ہے۔ "جن بندوں کے دلوں میں (اللہ نے) چاہا (یہ جذبہ رکھا) اور اللہ تعالیٰ اپنے ان ہی بندوں پر رحم فرماتا ہے جو (دوسروں پر) مہربان ہوتے ہیں۔"

فوائد و مسائل

1۔ فوتیدگی کے وقت' تمام رشتے داروں کا حاضر ہونا ضروری نہیں' تاہم جنازے میں شرکت بطور کفایہ مستحب ہے۔

2۔ گھر والوں کی یہ خواہش جائز ہے کہ دم واپسیں نیک لوگ قریب الموت کے قریب ہوں تاکہ اس کی دعا و برکت سے یہ مرحلۂ جان کنی آسانی سے طے ہو جائے۔

3۔ جس پر اعتماد ہو' اس کو قسم دلانا اور قسم دلانے والے کا اس قسم کا پورا کرنا جائز ہے۔ اس سے باہمی اعتماد اور محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔

4۔ میت پر فطری رونا اور اہل میت کو صبر و احتساب کی تلقین کرنا جائز ہے۔

شفقت و محبت کا جذبہ' اللہ کا انعام اور اس کی رحمت کے حصول کا ذریعہ ہے اور اس سے محرومی شقاوت ہے۔

صبر

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک عورت کے پاس سے گزرے جو ایک قبر کے پاس رو رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا۔

"اللہ سے ڈر اور صبر کر۔"

اس نے کہا "تجھے وہ مصیبت نہیں پہنچی جو مجھے پہنچی ہے۔" اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پہچانا (اس لیے فرط غم میں اس نے نازیبا انداز اختیار کیا)۔ بعد میں اس کو بتلایا گیا کہ وہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ چنانچہ (یہ سن کر) وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر آئی۔ وہاں اس نے دربانوں کو نہیں پایا۔ اس نے (آکر) کہا۔

"میں نے آپ کو نہیں پہچانا تھا۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے (وعظ کرتے ہوئے) فرمایا۔

"صبر تو یہی ہے کہ صدمے کے آغاز میں کیا جائے۔ (بعد میں تو صبر آہی جاتا ہے۔")

(بخاری و مسلم)

صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں ہے' وہ عورت

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

اپنے بچے (کی قبر) پر رو رہی تھی۔

فوائد و مسائل

1۔ اولاد کا ہونا' نہ ہونا' فوت ہو جانا تمام صورتیں آزمائش کی ہیں۔ اولاد کی موجودگی میں اس کی تربیت اور معیشت کا معاملہ درپیش ہوتا ہے اور لوگ اولاد کے مستقبل کو بہتر کرنے کے لیے اپنی آخرت بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ نہ ہونے کی صورت میں انسان ناشکری کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے اور فوت ہو جائے تو جزع فزع کر کے اللہ تعالیٰ کو ناراض کر لیتا ہے۔ ان تمام صورتوں میں انسان دین کو اختیار کر کے ہی محفوظ رہ سکتا ہے اور اللہ کی ذات پر پختہ یقین ہی کی بدولت صبر کی توفیق ملتی ہے۔

2۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دکھوں کے زخم مندمل ہو جاتے ہیں لیکن ایمان والے صدمے کے آغاز میں بھی صبر کرتے ہیں۔

3۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ کا بھی اس میں بیان ہے کہ عورت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شایان شان انداز اختیار نہیں کیا۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے برہمی کا اظہار نہیں فرمایا نہ اسے سخت سست کہا' پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نصیحت ہی فرمائی۔

مجلس کے آداب

(ایک مرتبہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے اور لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے کہ تین آدمی وہاں آئے۔ (ان میں سے) دو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پہنچ گئے اور ایک واپس چلا گیا۔ (راوی کہتے ہیں کہ) پھر دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد ان میں سے ایک نے (جب) مجلس میں (ایک جگہ کچھ) گنجائش دیکھی' تو وہاں بیٹھ گیا اور دوسرا اہل مجلس کے پیچھے بیٹھ گیا اور تیسرا جو تھا وہ لوٹ گیا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اپنی گفتگو سے) فارغ ہوئے (تو صحابہؓ سے) فرمایا کہ۔

"کیا تمہیں تین آدمیوں کے بارے میں نہ بتاؤں؟ تو (سنو) ان میں سے ایک نے اللہ سے پناہ چاہی' اللہ نے اسے پناہ دی اور دوسرے کو شرم آئی تو اللہ بھی اس سے شرمایا (کہ اسے بھی بخش دیا) اور تیسرے شخص نے منہ موڑا' اللہ نے (بھی) اس سے منہ موڑ لیا۔"

تشریح:۔

ثابت ہوا کہ مجالس علمی میں جہاں جگہ ملے' جانا چاہیے۔ آپؐ نے مذکورہ تین آدمیوں کی کیفیت مثال کے طور پر بیان فرمائی۔ ایک شخص نے مجلس میں جہاں جگہ دیکھی' وہاں ہی وہ بیٹھ گیا۔ دوسرے نے کہیں جگہ نہ پائی تو مجلس کے کنارے جا بیٹھا اور تیسرے نے جگہ نہ پا کر اپنا راستہ لیا۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے اعراض گویا اللہ سے اعراض ہے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں سخت الفاظ فرمائے۔

ہمارا مُلک

اِنشاجی

ایران میں کون رہتا ہے؟
ایران میں ایرانی قوم رہتی ہے۔
انگلستان میں کون رہتا ہے؟
انگلستان میں انگریز قوم رہتی ہے۔
فرانس میں کون رہتا ہے؟
فرانس میں فرانسیسی قوم رہتی ہے۔
یہ کون سا ملک ہے؟
یہ پاکستان ہے۔
اس میں پاکستانی قوم رہتی ہوگی؟
نہیں اس میں پاکستانی قوم نہیں رہتی۔
اس میں سندھی قوم رہتی ہے۔
اس میں پنجابی قوم رہتی ہے۔
اس میں یہ قوم رہتی ہے۔
اس میں وہ قوم رہتی ہے۔
لیکن پنجابی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں۔
سندھی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں۔
پھر یہ الگ ملک کیوں بنایا تھا؟
غلطی ہوئی۔ معاف کردیجیے۔ آئندہ نہیں بنائیں گے۔

ہمارا تمہارا خدا بادشاہ

کسی ملک میں ایک تھا بادشاہ' بڑا دانش مند' مہربان اور انصاف پسند۔ اس کے زمانے میں ملک نے بہت ترقی کی اور رعایا اسے بہت پسند کرتی تھی۔ اس بات کی شہادت نہ صرف اس زمانے کے محکمہ اطلاعات کے کتابچوں اور پریس نوٹوں سے ملتی ہے بلکہ بادشاہ کی خود نوشت سوانح عمری سے بھی۔

شاہ جم جاہ کے زمانے میں ہر طرف آزادی کا دورہ تھا۔ لوگ آزاد تھے اور اخبار آزاد تھے کہ جو چاہیں کہیں' جو چاہیں لکھیں۔ بشرطیکہ وہ بادشاہ کی تعریف میں ہو' خلاف نہ ہو۔

اس بادشاہ کا زمانہ ترقی اور فتوحات کے لیے مشہور ہے۔ ہر طرف خوش حالی ہی خوش حالی نظر آتی تھی' کہیں تل دھرنے کو جگہ باقی نہ تھی' جو لوگ لکھ پتی تھے دیکھتے دیکھتے کروڑ پتی ہوگئے حسن انتظام ایسا تھا کہ امیر لوگ سونا اچھالتے اچھالتے ملک کے اس سرے سے اس سرے تک بلکہ بعض اوقات بیرون ملک بھی چلے جاتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ پوچھے اتنا سونا کہاں سے آیا اور کہاں لیے جارہے ہو۔

روحانیت سے شغف تھا۔ کئی درویش اسے ہوائی اڈے پر لینے چھوڑنے جاتے یا اس کی کامرانی کے لیے چلے کاٹتے تھے۔ طبیعت میں عفوودرگزر کا مادہ ازحد تھا' اگر کوئی آکر شکایت کرتا کہ فلاں شخص نے میری فلاں جائیداد ہتھیائی ہے یا فلاں کارخانے پر قبضہ کرلیا ہے تو مجرم خواہ بادشاہ کا کتنا ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہو' وہ کمال سیر چشمی سے اسے معاف کردیتے تھے۔ بلکہ شکایت کرنے والوں پر خفا ہوتے تھے کہ عیب جوئی بری بات ہے۔

جب بادشاہ کا دل حکومت سے بھر گیا تو وہ اپنی چیک بکیں لے کر تارک دنیا ہوگیا اور پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں' اب بھی زندہ ہے' واللہ اعلم بالصواب۔

یہ مانا زندگی فانی ہے لیکن
اگر آجائے جینا، جاوداں ہے

خوشبو سا شخص تھا

عروسہ شہوار

اس تاریخ ساز شخصیت کو کوئی کیسے بھلائے گا جو اندھیروں میں جگنوؤں کی مثال، سب کے دکھ سننے، خوشی بانٹنے، دور ہو کر بھی سب کے دلوں میں بسنے، محبتوں، چاہتوں، رواداری کا درس دینے اور پاکستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سب کو محبتوں کی لڑی میں پرونے والی ان دیکھی اور انجانی سی مگر پھر بھی کتنی اپنی سی، سب کے مان بڑھانے والی ہستی جناب محمود ریاض۔

کیسے کیسے لوگ، قلم کار گم نامی کے کوچے سے شہرت کی بلندیوں تک ان کے طفیل پہنچے۔ ایسے لگتا ہے، جیسے ہنستے مسکراتے چمن سے دائمی خوشیوں کی پھوار میں بھیگنے کوئی گھر سے چپکے سے نکل گیا ہو۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی ہے، مگر ایک خلا، جس کو پُر کرنا ناممکن ہے، کیونکہ چیزیں تو چیزوں کا متبادل ہو سکتی ہیں، مگر انسان، انسانوں کا نعم البدل کبھی نہیں ہو سکتے۔

اور محمود ریاض صاحب کا بدل کوئی ہو سکتا ہے؟

جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ ہمارے بس میں تو ان کو صرف صدا دینا ہوتا ہے۔ کیسے کیسے عزیز از جان چہرے بھی دنیا کے اسٹیج سے پس پردہ چلے جاتے ہیں۔ جب کوئی پیارا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو ذات سے جڑا یہ دکھ، ہر دکھ کو مات دے جاتا ہے، کاش! ہم وقت کو روک سکتے مگر آہ! انسان کتنا مجبور اور بے بس ہے وہ تو بس یادوں کا قیدی بن کر رہ جاتا ہے اور خوب صورت لوگوں کی یادیں تو قلب و روح میں خوشبو کی طرح سما جاتی ہیں، سو ان کی یاد کا حصار ہمیشہ ہمیں اپنے گرد محسوس ہو تا رہے گا۔ آج پھر ایسی اذیت سے دوچار ہیں ہم سب جنہوں نے اپنی ایک عزیز از جان ہستی کھوئی ہے۔ بچھڑنا تو مقدر ٹھہرا کہ جہاں میں جتنے بھی لوگ آئے، رہے، بسے اور رخصت ہو گئے۔ یہ سلسلہ ازل سے ہے اور ابد تک یوں ہی رہے گا۔

جناب محمود ریاض کا نام ادب کی دنیا میں رہتی دنیا تک جگمگاتے تارے کی صورت روشنی دیتا رہے گا۔

اک روز جدا ہو جائیں گے
نجانے کہاں کھو جائیں گے
تم لاکھ پکارو گے ہم کو
لوٹ کر ہم نہ آئیں گے

جناب محمود ریاض کے لیے کتنے ہی دل سوگوار ہیں اور دعا گو ہیں۔

"اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے آمین۔"

عکس گر

نبیلہ عزیز

محمود ریاض اس دارِ فانی کو الوداع کہہ گئے۔

یہ وہ سفاک جملہ ہے جون 2001ء کے شمارے کا سرورق پلٹتے ہی دل و دماغ کو ہلا کے رکھ گیا تھا۔ ہر حس ماؤف ہو چکی تھی۔ اس جملے کی سفاکی اس قدر اذیت ناک تھی کہ آنکھیں دھواں دھواں ہو گئی تھیں۔ اپنی ہی بصارتوں پہ شک گزرا۔۔۔ شاید غلطی سے لفظوں کا ہیر پھیر ہو گیا ہو۔ شاید یہ غلط ہو، یہ ہی سوچ کر خود کو تسلی دیتے رہے لیکن یہ غلطی کا ہیر پھیر نہیں تھا یہ تو موت تھی جو ایک بار پھر چاند نگر پہ اپنے بے رحم پنجے گاڑ چکی تھی۔ اس خبر کی حقیقت کو ماننا کہ ایک مہان، شفیق اور پُرخلوص شخص چلا گیا ہے بہت مشکل تھا۔

لیکن یہ بھی تو سچ تھا کہ وہ حقیقتاً "ہم سے کھو گئے تھے، تب ہی تو اندر دل بین کرنے لگا تھا۔

یہ کیا ہوا؟ چاند نگر کا ایک اور تارہ ٹوٹ گیا؟ زمین ایک اور آسمان نگل گئی؟ ایک اور چراغ بجھ گیا؟ ایک اور سورج افق کے اس پار جا اترا؟ ہو گیا۔۔۔

تو کیا اب چاند پر اندھیرا چھا جائے گا؟ ہر سوچ تھرا اٹھی تھی۔ ہاتھ ہلکے ہلکے لرز رہے تھے اور پوری ذات نفی پہ بضد تھی جیسے یقین ہو کہ وہ اتنی جلدی ہم سے منہ نہیں موڑ سکتے۔

ابھی تو انہوں نے کئی چراغ روشن کرنا تھے، ابھی تو

کئی شمعیں فروزاں کرتا تھیں۔
ابھی تو علم کے کئی در وا کرنا تھے، ابھی تو بہت کچھ باقی تھا اور وہ۔۔۔

دل ایک بار پھر رویا تھا۔ وہ کوئی تارہ نہیں تھے جو اتنی آسانی سے ٹوٹے اور نگاہ سے اوجھل ہو جائے۔ وہ تو بہ ذات خود ایک چاند تھے، روشن، چمکتا، اجلا چاند! جس کی روشنی نے کئی بھٹکی ہوئی سوچوں کو ایک راستہ دکھایا تھا، جس نے کئی دکھی اور تنہا دلوں پہ اپنی شفقت کا مرہم رکھا تھا۔ جس کی روشنی آج اس قدر پھیل چکی ہے کہ میں آپ کو اور آپ مجھے نہ دیکھ کر بھی دیکھ سکتے ہیں کیونکہ میں اسی گھونسلے کا ایک تنکا ہوں جسے ریاض صاحب نے تنکا تنکا کر کے جوڑا اور خود اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔

رنج کتنا بھی کریں ان کا زمانے والے
جانے والے تو نہیں لوٹ کے آنے والے

کیسی بے فیض سی رہ جاتی ہے دل کی بستی
کیسے چپ چاپ چلے جاتے ہیں جانے والے

ایک پل چھین کے انسان کو لے جاتا ہے
پیچھے رہ جاتے ہیں سب ساتھ نبھانے والے

جانے والے ترے مرقد پہ کھڑا سوچتا ہوں
خواب ہی ہو گئے تعبیر بتانے والے

انسان کے خاکی پیکر کو زوال ہے، وجود کو فنا ہے، انسان کی انسانیت کو فنا نہیں، نیکیوں اور اچھائیوں کو فنا نہیں اور نہ ہی انسان کی محبت، اپنائیت اور رشتوں کو فنا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح تارے ٹوٹ بھی جائیں تو فنا نہیں ہوتے۔ چاند گھٹ بھی جائے تو فنا نہیں ہوتا۔ سورج ڈوب بھی جائے تو فنا نہیں ہو سکتا، ریاض صاحب بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو کر بھی ہمارے درمیان ہماری محفلوں میں ہیں۔

میں کبھی ان سے ذاتی طور پر نہیں ملی مگر ان کے بارے میں جتنا بھی پڑھا اس سے اندازہ ہوا وہ نرم حلیم ٹھنڈی چھاؤں کا مزاج رکھتے تھے تو رعب اور سنجیدگی بھی انہی کی شخصیت اور گفتار کا حصہ تھی۔ وہ انسانوں کی صلاحیتوں کے جوہری تھے اللہ نے ان کی شخصیت میں بیک وقت اتنی خوبیاں رکھ دی تھیں کہ ان کا پوروں پہ بھی شمار ممکن نہیں، ان ماہناموں شعاع، خواتین اور کرن سے ہم بہت کچھ سیکھ رہے ہیں، چاہے وہ اقوال زریں، شاعری ہو یا سبق آموز کہانیاں

—

بے شک میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ آواز نہیں سنی مگر اس حد تک جانا ہے کہ میں ہمیشہ انہیں اپنے سامنے مجسم محسوس کرتی ہوں اور سوچتی ہوں میں تو احساس کے دھاگے سے بندھی انہیں ان کی محفلوں میں کھوجتی ہوں تو ان کے پاس رہنے والوں کا حال کیا ہو گا؟ ان کے دوست احباب، ان کے گھر والے، ان کا اسٹاف کیسے صبر کر پایا ہو گا؟

ان کے اتنی جلدی چلے جانے کا دکھ تو ہنوز ہے اور اللہ رب العزت سے شکوہ بھی ہے کہ! اے میرے رب! ایسے پیاروں کو اتنی جلدی اپنی قربت میں نہ بلایا کر جن کی قربت اور ضرورت تیرے حقیر بندوں کو سب سے زیادہ ہے لیکن شکوہ کریں بھی تو خیال آتا ہے، اللہ اپنی بھیجی ہوئی چیزیں واپس لیتا ہے جس کو واپس لینے کے لیے اس نے روز اوّل سے وعدہ لے رکھا ہے اب وعدے سے مکرنا کیسا؟ جانا تو ہر انسان کو ہے کیونکہ وعدہ بھی تو ہر انسان نے کیا ہے بس فرق جلد یا بدیر کا ہے۔

میں دعا کرتی ہوں اللہ تعالیٰ محمود ریاض صاحب کو جنت الفردوس میں بلند درجات اور ان کی نیکیوں کا صلہ عطا فرمائے بہشت بریں میں ان کا اعلا مقام ہو (آمین)

ڈرامہ سیریل جہیز کا اہم کردار

تحریم زبیری سے ملاقات

شاہین رشید

جب تحریم نے شوبز میں قدم رکھا تھا تو اس کا سب سے پہلا انٹرویو ہم نے خواتین ڈائجسٹ کے لیے کیا تھا، پھر جب اس کی شادی ہوئی تب بھی پہلا انٹرویو ہم نے ہی کیا۔ تحریم نے شہرت اپنے کام سے تو حاصل کی ہی ہے مگر اس سے کہیں زیادہ اس کا اخلاق ہے، جو سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور شاید اس کی ترقی میں اس کے اخلاق کا بھی بہت حصہ ہے۔

تحریم دیگر فنکاراؤں کی طرح ہر وقت اسکرین پہ نظر آنے والی فنکارہ نہیں ہے، کم مگر اچھا کام تحریم کی پہچان ہے۔ جب سے تحریم اس فیلڈ میں آئی ہے، شاید یہ پہلا موقع ہے کہ اس کے دو ڈرامے ایک ساتھ چل رہے ہیں۔ "جہیز" اور "میری بیٹی میری لاڈلی" آپ دو مختلف چینلز سے دیکھ رہے ہیں۔

"جو کچھ جہیز میں ہو رہا ہے اور جو کچھ "میری بیٹی میری لاڈلی میں ہو رہا ہے کیا وہ سب حقیقت ہے؟"

"ڈرامے انہی موضوعات پہ بنتے ہیں، جن میں کچھ سچائی ہوتی ہے۔ یہ سب ہمارے معاشرے کی کہانیاں ہیں۔ رائٹرز کی نظر وسیع ہوتی ہے۔ ان کا گہرا مشاہدہ ہوتا ہے لہٰذا وہ جو کچھ دیکھتے ہیں، اسی کا اظہار اپنی تحریر میں کر دیتے ہیں۔"

"کچھ مبالغہ بھی تو ہو سکتا ہے؟"

"کچھ ہو سکتا ہے، زیادہ نہیں۔ بہت سی چیزیں ہماری نظروں سے اوجھل ہوتی ہیں، اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ مگر ہمارے معاشرے میں شاید اس سے بھی کہیں زیادہ برا ہو رہا ہوتا ہے۔"

"تم ہو کہ چپ" میں تمہارا کردار تو اچھا ہے ہی، اس سے زیادہ تمہارے بولنے کا انداز بہت عمدہ تھا۔ لہجہ بدلنے میں مشکل ہوئی؟"

"نہیں، کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ بلکہ مجھے تو بہت مزا آیا۔ اب دیکھیں، اس میں بھی جو کہانی پیش کی گئی، اس کے لیے بھی یہی کہا گیا کہ ایسا نہیں ہوتا لیکن جب وہاں کے رہنے والے قبائلیوں سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ہمارے یہاں تو دکھائے جانے والے مظالم سے کہیں زیادہ ظلم ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ رائٹر کا مشاہدہ وسیع ہوتا ہے۔"

"لکھنا ایک ذمہ داری کا کام ہوتا ہے۔ ایسے موضوعات جو بہت ہی حساس ہوتے ہیں، رائٹر بہت ذمہ داری کے ساتھ لکھتا ہے۔"

"بالکل۔۔۔ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ تحریر اچھی ہو۔ حقیقت کے قریب ہو تو اسے مقبولیت مل ہی جاتی ہے۔ آپ خود محسوس کریں گی کہ جو کہانیاں معاشرے کے قریب ہوتی ہیں لوگ انہیں زیادہ پسند کرتے ہیں کیونکہ ان کہانیوں میں یا تو انہیں اپنا عکس نظر آ رہا ہوتا ہے یا دوسروں کا عکس نظر آ رہا ہوتا ہے۔"

"میں نے دیکھا ہے کہ تمہارے زیادہ تر کردار مقبول ہوتے ہیں۔ تم جب کوئی کردار لیتی ہو تو کس نظریے سے لیتی ہو؟"

"میں کوئی کردار اس لیے نہیں لیتی کہ یہ مقبول ہو گا، میں اس نظریے سے لیتی ہوں کہ میں اس کردار

میں لوگوں کو کتنا متاثر کر سکتی ہوں۔ پھر ڈائریکٹر کا بھی کمال ہوتا ہے کہ وہ ہم سے کس طرح کام لے گا۔ میں ہمیشہ اپنے کام پہ فوکس کرتی ہوں۔ یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ لوگ میرے کام کو پسند کرتے ہیں۔"

"کبھی ایسا ہوا کہ کسی کردار کے لیے تم نے بہت محنت کی اور وہ مقبول نہیں ہوا اور جس پر محنت نہیں کی وہ مقبول ہو گیا؟"

"میرے ساتھ تو اللہ کا شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا لیکن اکثر لوگوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ جس کردار کو نبھانے کے لیے وہ بہت محنت کرتے ہیں' وہ اتنا مقبول نہیں ہوتا جتنا ایک عام کردار مقبول ہو جاتا ہے۔"

"آج کل ہر چینل پہ ڈراموں کی بھرمار ہے۔ یہ اچھی بات ہے یا بری؟"

"اچھی بات ہے۔ لوگوں کو روزگار مل رہا ہے۔ چینلز آجانے سے بہت سے لوگوں کا بھلا ہوا ہے۔"

"مگر معیار پر تو بہت فرق پڑا ہو گا؟"

"کسی بھی زمانے میں تمام کام پرفیکٹ نہیں ہوتا تھا اور ایسا اب بھی ہے۔ اچھا کام بھی ہو رہا ہے اور برا کام بھی ہو رہا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ لوگ اب بہت باشعور ہو گئے ہیں۔ انہیں اندازہ ہے کہ کون سا پروگرام معیاری ہے اور کون سا غیر معیاری ہے۔"

"شوبز کے کون سے شعبے میں بہت زیادہ بہتری کی ضرورت ہے؟"

"ہر شعبے میں بہت زیادہ بہتری کی ضرورت ہے۔ خواہ ڈائریکشن ہو' پروڈکشن ہو یا اداکاری۔ محنت اور بہتر سے بہتر ہونے کی ضرورت تو اب ہر وقت ہے۔"

"اس فیلڈ میں صلاحیت کا ہونا تو ضروری ہے' کیا سفارش کا ہونا بھی ضروری ہے؟"

"میرا نہیں خیال کہ باصلاحیت انسان کو سفارش کی ضرورت ہے' کیونکہ صلاحیت اپنی جگہ خود بناتی ہے۔ ہاں! ہم کسی کے لیے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا آڈیشن لے لیں۔ کچھ نظر آئے تو قبول کر لیں اور نہ نظر آئے تو نہ کریں۔ باقی کے لیے کوئی سفارش کام نہیں آتی۔"

"اگر میڈیا میں بہت اچھے تعلقات ہوں تو کیا اس کے ذریعے بھی جگہ بنائی جا سکتی ہے؟"

"نہیں... میں نہیں مانتی کہ تعلقات سے جگہ بنائی جا سکتی ہے' شوبز ایسا میڈیا ہے' جہاں صرف اور صرف صلاحیت سے جگہ بنائی جا سکتی ہے۔"

"ایک فنکار اس فیلڈ میں کس طرح اپنے آپ کو منوا سکتا ہے؟"

"اپنے منفرد کرداروں سے۔ اگر وہ ہمیشہ ایک جیسا کردار کرے گا۔ ہمیشہ مرکزی کرداروں کو ہی ترجیح دے گا تو پھر وہ کبھی بھی اپنے آپ کو نہیں منوا سکتا۔ فنکار تو وہ ہے جو یہ نہ دیکھے کہ کردار کتنا مختصر یا طویل ہے۔ یہ دیکھے کہ کردار کتنا پاور فل ہے' کتنا چیلنجنگ ہے۔ فنکار وہی اچھا ہے جو ہر طرح کے رول کرنے میں مہارت رکھتا ہو۔"

"تم نے ہمیشہ سنجیدہ کرداروں کو ترجیح دی' کیوں؟"

"اس لیے کہ مجھے سنجیدہ کردار یا ہلکے پھلکے کردار کرنے میں مزا آتا ہے۔ مجھے مزاحیہ کردار پسند نہیں' کیونکہ اب مزاحیہ کرداروں کا پہلے جیسا معیار نہیں رہا ہے۔"

"تم نے مارننگ شو بھی کیے۔ کیسا رہا یہ تجربہ' اور پھر چھوڑ کیوں دیا؟"

"مارننگ شو کا تجربہ بہت اچھا رہا۔ مزا آیا کرنے میں۔ روز نئے نئے لوگوں کے ساتھ ملاقات ہو جاتی تھی اور چھوڑا اس لیے کہ گھریلو مصروفیات کی وجہ سے مارننگ شو کو ٹائم دینا مشکل ہو گیا تھا۔"

"گھریلو مصروفیات کی وجہ سے ہی کام کم کرتی ہو؟"

"اب تو پھر کرنے لگی ہوں۔ بیٹی تھوڑی سی بڑی ہو گئی ہے اور پھر اداکاری میرا شوق ہے۔ اپنے شوق کے لیے تھوڑا بہت وقت نکالنا پڑتا ہے۔ اور ویسے بھی میں نے یہ اصول بنایا ہوا ہے کہ اتوار کو کوئی شوٹ نہیں کرواتا اور عام دنوں میں رات نو بجے کے بعد کوئی کام نہیں کرتا۔"

"اکثر فنکار ماڈلنگ کے لیے کہتے ہیں کہ ماڈلنگ میں وقت بھی کم لگتا ہے اور پیسہ بھی زیادہ ملتا ہے۔ ایسا

ہے؟"

"ہاں... ایسا ہے لیکن میری تو پہلی ترجیح اداکاری ہی ہے۔ مجھے اداکاری میں زیادہ مزا آتا ہے بہ نسبت ماڈلنگ کے' اور ہر چیز پیسہ نہیں ہے' اپنا اطمینان بھی بہت بڑی چیز ہے۔"

"ویسے پیسہ خرچ کرنے میں کون بہت ماہر ہے تم یا فیصل؟"

"فیصل بہت ماہر ہیں... پیسہ ہاتھ میں ٹکتا نہیں۔ جو چیز پسند آجائے بس خریدنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ان کے مقابلے میں' میں کافی کفایت شعار ہوں۔"

"تم تو کافی لوگوں کے ساتھ یعنی کافی ڈائریکٹرز کے ساتھ کام کر چکی ہو' کس کو زیادہ اور کس کو نمبر کم دو گی؟"

"یہ تو بہت مشکل کام ہے... آج کل زیادہ تر بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ ڈراما ڈائریکٹرز میں آج کل سید کھوسٹ اور یاسر نواز بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ باقی بھی کافی لوگ ہیں' جو بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ میں کسی کو برا نہیں کہہ سکتی۔"

"تم بھی کافی عرصے سے اس فیلڈ میں ہو۔ کبھی ڈائریکٹر کے کام سے اختلاف ہوا یا کوئی رائے دی؟"

"نہیں۔ مجھے کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ اچھا ڈائریکٹر وہی ہوتا ہے' جو سب کی سنے اور جو بات اس کے دل کو لگے اسے ضرور آزمائے۔ کیونکہ سینئرز بھی اپنے تجربے سے ہی رائے دیتے ہیں۔"

"میں نے دیکھا ہے کہ جب فنکار کا عروج ہوتا ہے تو وہ بہت اچھا کما رہا ہوتا ہے۔ پھر جب کام کم ہونا شروع ہوتا ہے تو مالی حالات برے ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس میں فنکار کا قصور ہے یا پیسے کا استعمال غلط ہوتا ہے؟"

"بہت نازک مسئلہ ہے' لیکن یہ حقیقت ہے کہ ساری ذمہ داری فنکار پر عائد ہوتی ہے کہ وہ پیسے کو بہت احتیاط کے ساتھ خرچ کرے اور اسے کہیں نہ کہیں انویسٹ کرے۔ سدا دن ایک سے نہیں رہتے۔

انسان کو اپنے فیوچر کے بارے میں ضرور' ضرور سوچنا چاہیے اور اچھے دنوں کا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔"

"اب کچھ گھریلو باتیں ہو جائیں۔ کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"میں 20 مارچ کو پیدا ہوئی کراچی میں۔ تعلیمی قابلیت گریجویشن ہے۔ میرا ایک بھائی اور ہم چار بہنیں ہیں اور میرے علاوہ کوئی اس فیلڈ میں نہیں ہے۔"

"فیلڈ میں آئیں تو کوئی اعتراض ہوا؟ فنی سفر کا آغاز؟"

"نہیں! اللہ کا شکر ہے کہ کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ کسی نے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کیا۔ ماڈلنگ سے فنی سفر کا آغاز کیا۔ فلم بھی کی اور جب ڈراموں سے آفر آئی تو ڈراموں میں کام شروع کیا اور اب تک کر رہی ہوں اور ان شاء اللہ جب تک لوگوں نے پسند کیا' کرتی رہوں گی۔"

"شادی...؟"

"آپ کو معلوم ہی ہے کہ جولائی 2008ء میں میری شادی فیصل خان سے ہوئی' جو کہ خود بھی

پروڈیوسر' ڈائریکٹر اور اداکار ہیں۔ اگر آپ کو یاد ہو تو ڈراما سیریل "بول میری مچھلی" میں انہوں نے بھی اداکاری کی تھی۔ آج کل زیادہ تر برانڈڈ شو کرتے ہیں۔"

"دونوں کا تعلق ایک ہی فیلڈ سے ہے' دونوں ایک دوسرے کی مشکلات سے واقف تو ہوں گے؟"

"بالکل واقف ہیں اور میرے خیال میں اگر میاں بیوی ایک ہی شعبے سے ہوں تو بہت سے کام آسان ہو جاتے ہیں۔ لیکن شادی کی کامیابی کا یہ کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ میاں بیوی میں انڈر اسٹینڈنگ ہو اور دونوں ایک دوسرے کی ضروریات کا خیال بھی رکھیں۔"

"لڑائی ہوتی ہے آپ دونوں میں؟"

"کیوں نہیں۔ دنیا کے کون سے میاں بیوی ہیں کہ جن کے درمیان لڑائی نہ ہوتی ہوگی۔ ہمارے درمیان بھی ہوتی ہے اور پھر دوستی بھی ہو جاتی ہے۔ یہ سب کچھ تو چلتا ہی رہتا ہے۔"

"تم جوائنٹ فیملی میں نہیں رہتیں۔ کیونکہ ساس' سسر حیات نہیں اور انہی سے جوائنٹ فیملی بنتی ہے۔ اس لحاظ سے تم کیا سمجھتی ہو۔ بہتر ہے علیحدہ رہنا یا مل جل کر رہنا؟"

"میرے خیال میں شادی کے بعد لڑکی کو جوائنٹ فیملی میں ضرور رہنا چاہیے۔ اس طرح جب بچے ہوتے ہیں تو انہیں رشتوں کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ دادا' دادی' پھوپھی' خالہ' ماموں۔ ان سب کی میری نظر میں بہت اہمیت ہے۔ یہ پیار والے رشتے ہیں۔ بچوں کو ان کے درمیان کچھ عرصہ ضرور رہنا چاہیے۔ بچوں کی اچھی تربیت کے لیے بڑوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔"

"لڑائی کے بعد صلح میں پہل کون کرتا ہے عموماً؟ لڑائی کس بات پر ہوتی ہے؟"

"صلح میں پہل تو فیصل ہی کرتے ہیں۔ بہت خیال رکھتے ہیں میرا اور لڑائی کسی ایک بات پر نہیں ہوتی۔ مختلف باتوں پر ہوتی ہے اور ہم دونوں میں سب سے اچھی بات یہ ہے کہ ہم لڑائی کے دوران نہ ایک دوسرے سے بدتمیزی کرتے ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے کا دل دکھاتے ہیں۔ اختلاف رائے والی لڑائی ہوتی ہے۔"

"ویسے غصے کا کون تیز ہے؟"

"غصے کی تو میں ہی تیز ہوں۔ فیصل کو تو زیادہ غصہ نہیں آتا۔ میرا غصہ تو یہ ہے کہ کوئی بات دل میں نہیں رکھتی۔ منہ پر کر کے کلیر کر دیتی ہوں۔ میں دل کی بہت صاف ستھری ہوں۔"

"فیصل کی کون سی بات بہت متاثر کرتی ہے آپ کو؟"

"فیصل کی ساری باتیں بہت اچھی ہیں۔ میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے فیصل جیسے اچھے انسان ملے۔ میں بہت خوش ہوں اپنی ازدواجی زندگی سے۔ فیصل کی سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ ایک تو ہم ماں' بیٹی کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ وقت کی پابندی کرتے ہیں۔ گھر آنے کے لیے جو وقت کہتے ہیں' اسی پہ آتے ہیں' بلکہ جلدی ہی آجاتے ہیں۔"

"شادی کے بعد سب سے اچھا دن کون سا تھا؟"

"جس دن میری بیٹی اس دنیا میں آئی۔ ایسا لگا کہ میں ایک دم چینج ہو گئی ہوں۔ سب کچھ بدل گیا۔ ماں بننے کا جو احساس تھا' اس کو کبھی نہیں بھلا پاؤں گی۔"

"چھٹیاں ملک میں گزارتی ہیں یا ملک سے باہر؟"

"زیادہ تر ملک سے باہر۔ کیونکہ مجھے بھی دنیا گھومنے کا شوق ہے اور فیصل کو بھی اور میں شادی سے پہلے بھی ملک سے باہر جا چکی ہوں۔"

"میوزک اور فیشن سے کتنا لگاؤ ہے آپ کو؟"

"میوزک سے بہت لگاؤ ہے۔ جس وقت جیسا موڈ ہوتا ہے' اسی حساب سے میوزک سنتی ہوں اور جہاں تک فیشن کی بات ہے تو فیشن سے بھی لگاؤ ہے' مگر حدود میں رہ کر کہ کسی کے آگے شرمندگی نہ ہو۔"

"کوئی خواہش جو پوری نہ ہوئی ہو؟"

"اللہ نے بہت نوازا ہے۔ ویسے خواہشات کی کوئی حد نہیں ہوتی۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے تحریم زبیری سے اجازت چاہی۔

٭

نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

مسرت شاہین۔ گورنمنٹ کالج لاہور

اپریل 2012ء کا خوب صورت شمارہ پورا ختم کر کے اس پر تبصرہ لکھنے بیٹھی ہوں تو الفاظ جیسے کم پڑ گئے ہیں۔ بے اختیار دل سے نکلتا ہے۔ زبردست' بہت اچھا اور دیدہ زیب ٹائٹل ہے اس بار۔

سب سے پہلے فرحت اشتیاق کا انٹرویو پڑھا اور ان کے ذاتی تجربات اور زندگی کے بارے میں جان کر اچھا لگا اور بہت مسرت ہوئی۔ ان سے ملاقات کر کے اس کے بعد جو دل پر نقش ہیں' سروے دیکھا اور اپنا نام نہ دیکھ کر انتہائی دکھ ہوا "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" پڑھا شہریار سکندر کے بدلتے جذبات نے ناول ایک انتہائی اہم موڑ پر لا کر رکھ دیا ہے۔

دل و نظر کے سلسلے سائرہ رضا کا گھریلو موضوع پر اچھا انداز اور اچھی کردار نگاری کے ساتھ بہت پسند آیا۔ دانیہ کا بے ساختہ انداز اور مونا کی بیوگی کے بعد حالات میں فیصلے کی گھڑی تک آنا بہت اچھا تھا۔ کزنز والی اسٹوری تو مجھے ویسے بھی اچھی لگتی ہے۔

عفت سحر پاشا بالآخر میرٹ کے ساتھ آن پہنچیں اور بہت اچھا لکھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کی طرح ہی تھا۔

پربت نگر کا شہزادہ سدرۃ المنتہیٰ کی ایک بہترین کاوش تھی۔ اتنے افسانوی انداز میں ادب تحریر کرنا اور کہانی پر گرفت رکھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ الفاظ ایسے پُر تاثیر کہ سیدھے دل پہ جا لگے۔ افسانے تمام کے تمام اچھے تھے۔ بلکہ یہ کہنا کہ اس ماہنامے کی خوبی اور خوب صورتی اس دفعہ افسانوں نے دوبالا کر دی تھی۔ رخسانہ نگار کے سیلانی بھیا اور ضیا کے درمیان بندھنے والا رشتہ انوکھا بندھن ہی لگا۔

کنیز نبوی نے حساس طریقے سے حساس لوگوں کو محسوس کیا اور خوب کیا۔ مجھے بہت پسند آیا۔ واقعی محبت میں جسم کے بجائے روح سے رشتہ ہونا چاہیے جیسے بشریٰ رحمان نے اپنے افسانے میں چند گھڑیوں کے رشتے کو ابدی کر دیا۔

سرشت عشق میں ثمینہ عظمت نے لفظوں کی اہمیت خوب بتائی۔ جو مزا خط لکھنے میں آتا ہے وہ مختصر ایس ایم ایس سے بالکل نہیں آتا۔

میمونہ الکبریٰ کا "ایسا بہروپ" بھی اچھا لگا۔ باقی تمام مستقل سلسلے اچھے تھے۔ آپ کا باورچی خانہ میرا خاص پسندیدہ ہے۔

ج: پیاری مسرت! سب سے پہلے تو معذرت کہ آپ سروے میں شامل نہ ہو سکیں۔ یقین کریں کہ ہمیں خود بے حد افسوس ہے۔ ہماری اتنی ذہین قارئین اتنے اچھے خط لکھتی ہیں۔ مختلف سلسلوں میں حصہ لیتی ہیں اور صفحات کی مجبوری کی بنا پر شامل نہیں ہو پاتیں ہمارا دل بھی بہت دکھتا ہے۔

تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔"

روا صابر کاظمی، نازیہ برکات۔۔۔ منڈی بہاؤالدین

خواتین ڈائجسٹ ہمارے گھر تب سے آرہا ہے۔ جب میری بڑی آپی 8th کلاس میں تھیں اور اب ان کی شادی کو ماشاءاللہ 10 سال ہوگئے ہیں۔ ہم سب بہنیں ہی خواتین کی دیوانی ہیں۔ فرحت اشتیاق، نگہت عبداللہ، رخسانہ نگار رائٹرز تو میری فیورٹ ہیں۔

ج روا اور نازیہ! خواتین کے ساتھ آپ کی طویل رفاقت کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی۔ ہماری دعا ہے کہ خواتین ڈائجسٹ سے آپ کی دلچسپی اسی طرح قائم رہے۔ (آمین)

فروا سجاد۔۔۔ ٹیکسلا کینٹ

خواتین کی محفل میں پذیرائی کی منتظر ہوں۔ خط لکھنے کی اصل وجہ فرحت اشتیاق کا ناول ہے۔ "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو۔" براہ کرم اس مصرعے کا مطلب سمجھا دیجیے۔ اس ناول میں مجھے لیزا کا کردار بہت پسند ہے۔ اب ٹائٹل کی بات ہوجائے تو جناب خواتین کے ٹائٹل میں روز بروز جدت اور خوب صورتی آرہی ہے۔ عنیزہ سید کا ناول بھی اچھا ہے۔ بشریٰ رحمان، کنیز نبوی کے افسانے بہترین تھے۔ راحت جبیں کا ناول خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔

ج پیاری فروا! فرحت اشتیاق نے اپنی کہانی کا عنوان "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" فیض احمد فیض کے اس شعر سے لیا ہے۔ آپ پورا شعر پڑھیں گی تو مفہوم واضح ہوجائے گا۔

نہ گنواؤ ناوک نیم کش دل ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تن داغ داغ لٹا دیا

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو کا لفظی مفہوم یہ ہے جو کچھ باقی رہ گیا ہے۔ اسے سنبھال کر رکھا جائے۔

عالی کا کردار کرنے والے اداکار کے بارے میں آپ کا تبصرہ فرحت اشتیاق تک پہنچا دیں گے۔

خواتین ڈائجسٹ پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

رضیہ چوہدری، مہرین چوہدری اور فوزیہ بلوچ۔۔۔ نئی نہر میاں چنوں

ہمارے خط تین سے چار مرتبہ شائع ہونے کے بعد نہ جانے کہاں غائب ہوگئے ہیں۔ اب آپ خود بتائیں کہ میں بیس روپے کا خط کا لفافہ بھیجتی ہوں۔ پھر اتنی محنت سے خط لکھتی ہوں۔ وہ بھی دو دن میں رسالہ پڑھ کر اور پھر ناصر لالہ کی منتیں کرتی ہوں کہ وہ اتنی دور یعنی میاں چنوں جا کر خط پوسٹ کرکے آئیں۔ وہ پورے پچاس روپے لے کر میرا خط پوسٹ کرتے ہیں۔ پھر پچاس روپے کا رسالہ لا کر دیتے ہیں۔ وہ بھی کرایہ لے کر تو میرے غریب کے پورے ڈیڑھ سو خرچ کرنے کے بعد بھی خط شامل نہ ہو تو آپ سب خود سوچیں مجھ غریب پر کیا گزرتی ہوگی۔ ایف ایم 94.6 شالیمار کے آر جے اور کمپیئر یاسر قاضی کراچی سے عتیق الرحمان بھٹی اور زاہدہ آنٹی، اسلام آباد سے بیا آپی، لاہور سے انٹرویو بمعہ تصویر شائع کریں۔ ورنہ خط کا بائیکاٹ۔ لیکن رسالہ ضرور پڑھیں گے۔ کیونکہ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

سرور علم ہے کیف شراب سے بہتر
کوئی رفیق نہیں ہے کتاب سے بہتر

ج رضیہ، مہرین اور فوزیہ! افسوس کے ساتھ ساتھ شرمندہ بھی ہیں کہ آپ اتنی محنت کرکے ہمیں خط بھجواتی ہیں اور آپ کے خط اور سروے شامل نہیں ہوپاتے۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ فرمائشیں شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں اور آپ سے پکا وعدہ آئندہ آپ کے خط اور دوسرے سلسلے ضرور شامل کرنے کی کوشش کریں گے۔

صدف انور۔۔۔ گڑھی حبیب اللہ (ہزارہ)

پہلی بار خط لکھنے کا سبب "چراغ آخر شب" تھا اور اب دوسری بار بھی اسی تحریر کی وجہ سے قلم اٹھانے کا سوچا ہے۔ دراصل ہم لوگ اتنی جلدی اس کا اختتام ایکسپیکٹ نہیں کررہے تھے۔ گو کہ میں نے رفعت آپی سے اسے زیادہ لمبا نہ کرنے کی درخواست بھی کی تھی۔ لیکن۔۔۔ اگر فروری کے شمارے میں ہی آخری قسط کا تذکرہ کردیا جاتا تو ہم لوگ ذہنی طور پر تیار ہوجاتے۔ مجھے تو ایک بات سمجھ میں آرہی ہے کہ چونکہ رفعت بہت سے لوگوں کو بے نقاب کررہی تھیں تو ان پر پریشر ہوا ہوگا شاید اس لیے۔ میں جانتی ہوں یہ ناول روایتی کہانیوں سے تھوڑا ہٹ کر تھا، لیکن اگر فاروق اور عبیر کا ساتھ ذرا طویل دکھایا جاتا اور شہریار اور عثمان کو اس قدر افسردہ نہ دکھایا جاتا۔ مجھے یہ ناول ابھی بھی بہت بہت پسند ہے۔ مگر انجام کار میں ہوں تو نازک جذبات و احساسات کی مالک ایک لڑکی ہی۔۔۔ بخدا میں مصنفہ پر تنقید بالکل نہیں کررہی، کرہی نہیں سکتی۔ بس ذرا اپنی خواہشات بتانا چاہ رہی تھی۔ میں پھر یہی کہوں گی کہ یہ ناول میرے پسندیدہ ناولز میں ٹاپ آف دا لسٹ ہے۔ بس تھوڑی تشنگی سی رہ گئی ہے۔ باقی قارئین سے ایک ناول کے متعلق پوچھنا تھا۔ جس کا پہلا صفحہ نہ ہونے کے باعث میں نام نہیں پڑھ سکی۔ (ورنہ مجھے اچھی تحریر اور رائٹر کا نام ضرور یاد رہتا ہے) اس ناول میں ہیرو کا نام روشن توقیر تھا۔ جسے کزنز روشن چراغ کہہ کر بلاتے ہیں اور ہیروئن کی آنکھیں اپنے چچا (ہیرو کے والد) کے جیسی ہوتی ہیں۔ اگر کوئی یہ بتادے کہ یہ ناول کس نے لکھا تھا اور کب شائع ہوا تھا، تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ اس کے علاوہ میں نے اپنے پہلے خط میں وائس آف امریکہ کے اینکر اسد حسن کے بمع تصویر انٹرویو کی فرمائش کی تھی۔

ج پیاری صدف! شاہین رشید تک آپ کی فرمائش پہنچا دی گئی ہے۔ اگر اسد حسن سے کونٹیکٹ ممکن ہوا تو آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گی۔

"چراغ آخر شب" کے اچانک اختتام سے ہماری بہت ہی قارئین کو دھچکا لگا ہے، لیکن پریشر والی بات ممکن نہیں، کیونکہ رفعت ناہید سجاد کو جس حد تک ہم جانتے ہیں وہ اس طرح کی شخصیت نہیں ہیں جو کسی کا پریشر قبول کرسکیں۔ آپ نے جس ناول کے بارے میں پوچھا ہے، ممکن ہے قارئین میں سے کسی کو یاد ہو اور وہ بتا سکیں کہ یہ ناول کس مصنفہ کا تھا۔

شیما فیضان علوی۔۔۔ کراچی

بارہ سال تک سوائے بچوں کی تعلیم و تربیت کے کچھ نہ کرسکے۔ البتہ جب غم زندگی سے گھبرانے لگتے تو شاعری میں یا افسانوں میں اپنا دکھ انڈیل دیتے۔ یہ کہانی بھجوا رہی ہوں، اتنے طویل ساتھ میں کئی رائٹرز بہنیں نئی بھی آئیں اور چھا گئیں اور کچھ کا ساتھ بھی چھوٹ گیا۔

اکثر خطوط میں یہ پڑھتی ہوں کہ لڑکیوں کو منع کرتے ہیں رسالے پڑھنے سے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے ایک عمر آجانے کے بعد لڑکیوں کو اجازت دے دینی چاہیے۔ کیونکہ یہ سب کہانیاں ہمارے اردگرد کی ہوتی ہیں۔ جن سے ہم کو سبق بھی ملتا ہے اور مسائل کو جھیلنے کی ہمت بھی سیکھتے ہیں۔

ج شیما! آپ نے بالکل صحیح کہا۔ مطالعہ بہترین عادت ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے جو لوگ رسالے پڑھنے سے منع کرتے ہیں۔ ان کے گھروں میں ٹی وی، وغیرہ ہیں۔ جن پر تمام چینل آرہے ہوتے ہیں اور آج کل جو ماحول ہے۔ وہ سب ہی جانتے ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ کہانی کے لیے معذرت۔ اگر ذرا سی بھی گنجائش ہوتی تو ہم ضرور شائع کرتے۔

عالیہ بتول۔۔۔ حویلی بہادر شاہ

ماڈل گرل کا انداز اچھا تھا۔ جھکی نگاہیں۔ فرحت اشتیاق صاحبہ بہت خوب صورتی سے کہانی بڑھا رہی

سانحہ ارتحال

بھوجا ایرلائن کے بدقسمت طیارے کے حادثے میں تحریم عقیل کی والدہ فہمیدہ زبیر شہید ہوگئیں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سب کے دلوں میں اپنی یادیں چھوڑ گئیں۔

اناللہ وانا الیہ راجعون

فہمیدہ زبیر بہت ذہین، خوش اخلاق، نیک طبع اور رشتوں کو نبھانے والی خاتون تھیں۔ عزیز رشتہ داروں کے دکھ درد میں پورے دل سے شریک ہوتیں۔ ان کی شہادت ان کے متعلقین کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں صبر جمیل سے نوازے اور مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین) قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

ہیں۔ دل و نظر کے سلسلے میں سائرہ رضا نے کچھ خاص متاثر نہیں کیا۔ تایا جی کی باتیں بہت خوب صورت تھیں۔ عنیزہ سید کی — پہلی قسط ہی ہمیں گرفت میں لے چکی ہے۔ "ساری بھول ہماری تھی" بہت اچھا لگ رہا ہے۔ افسانے سارے اچھے تھے۔ تمینہ عظمت ویلڈن آج کے مشینی دور میں انٹرنیٹ اور موبائل سے توجہ ہٹا کے خط وکتابت کی طرف توجہ دلائی۔ فرحت جی کا انٹرویو پڑھ کر جو خوشی ملی وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔

ج پیاری عالیہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں۔ اس لیے اس کے بارے میں بتانے سے قاصر ہیں۔

بنت عمر۔۔۔ کراچی

یہ میرا پہلا خط ہے۔ گو کہ خواتین کی قاری میں 1999ء میں بنی۔ میں نے پہلی تحریر "شہرذات" عمیرہ احمد کی پڑھی۔ بس اس کے پڑھتے ہی میں خواتین' شعاع دونوں کی فین ہو گئی۔ ہر سال خواتین کا معیار بلند سے بلند ترین ہوتا جا رہا ہے۔

مجھے سلسلے وار ناول میں "اندازے" لگانے میں بہت مزا آتا ہے۔ اب یہ ہو گا' اب وہ ہو گا' وغیرہ وغیرہ۔ جیسے فرحت اشتیاق کے ناول "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" میں مجھے لگتا ہے لیزا کی بہن مریم' ہاشم کی بیوی مریم اور زرین کی ام مریم ایک ہی ہے۔ ام مریم' لیزا اپنی بہن کی سکندر کے حوالے سے دیوانگی دیکھ کر سکندر کو بے گناہ ثابت کرے گی۔ وہی لیزا کی محبت میں سکندر کو اپنے ماں' باپ اور بھائی کی نظروں میں سرخرو کرے گی۔ اس کے علاوہ ساری بھول ہماری تھی۔ راحت جبیں ویلڈن' حکمت عبداللہ کو پانچ سال بعد دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔

ج بنت عمر! آپ نے اپنا نام نہیں لکھا۔ اپنا نام بھی لکھ دیتیں تو اچھا تھا۔ نام انسان کی شناخت ہوتی ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ شازیہ چوہدری کی تحریر ان شاء اللہ آئندہ ماہ شامل ہو گی۔ فرحت کے ناول میں آپ کے اندازے کہاں تک درست ہیں۔ یہ تو آگے چل کر ہی پتا چلے گا۔

رقیہ نظامانی۔۔۔ راجو خانانی بدین

اس سال ماہ فروری سے ہی آپ کے "شعاع" اور "خواتین" کی قاری بنی ہوں اور آپ کے رسالوں نے قلم اور کاغذ اٹھانے پہ مجبور کیا۔ پچھلے ماہ یعنی فروری کے شمارے میں "ضبط عشق" بہت اچھا لگا۔ خواتین کے فروری کے شمارے میں "توبہ" بھی بہت اچھا لگا۔ میں جو بھی کہانی پڑھتی ہوں۔ اس میں ہر کردار حقیقی کردار لگتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں اور کانوں سے سن بھی رہی ہوں۔ فرحت اشتیاق کی کہانی "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" اتنی اچھی لگ رہی ہے کہ اگلے شمارے کا بڑی بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ "میرے خواب لوٹا دو" بھی بہت اچھا ناول ہے۔ ان میں ہمیں بہت سی معلومات ملتی ہیں۔ خاص کر پیارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور "تاریخ کے جھروکوں" سے بہت معلومات ملتی ہے۔

میں ضلع بدین کے ایک چھوٹے سے شہر راجو خانانی میں رہتی ہوں۔ چھوٹا شہر ہونے کے باوجود کپاس اور چاول کی تجارت کی وجہ سے اس شہر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ تعلیمی لحاظ سے بوائز اسکول' گرلز اسکول اور ایک پرائیویٹ اسکول بھی ہے اور بہت ہی رائس ملیں بھی اس شہر میں موجود ہیں۔ کھوسکی کی طرح شاید اس شہر کا نام بھی آپ پہلی مرتبہ سن رہی ہوں۔ اس شہر میں آپ کے شماروں کی ایک پرانی قاری بھی رہتی ہے۔ جو بیس برس سے آپ کے دونوں شمارے پڑھ رہی ہے۔ وہ تب سے پڑھتی ہے جب اس کی عمر صرف دس سال تھی۔

میں بھی ایک ٹیچر ہوں۔ اسی شہر میں ہی پڑھاتی ہوں۔ میری دوست بھی ٹیچر ہے۔ پہلے تو میں ان سے وہ شمارے لے کر سرسری مطالعہ کر لیتی تھی۔ کبھی کوئی سلسلہ وار کہانی نہیں پڑھی۔ اب اس عمر میں آکر پڑھنا شروع کیا ہے۔ اس سے نوجوان لڑکیاں' میرے گھر میں پڑے شمارے دیکھ کے ہنستی ہیں اور کہتی ہیں کہ آپ رومانٹک ہو رہی ہو کیا' جواب خوان لڑکیوں والے چونچلے کرنے لگی ہو۔ میرا جواب یہ ہوتا ہے کہ کچھ بھی پڑھنے کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں۔

اس کے علاوہ میری ایک چھوٹی سی عرض ہے کہ میں اپنی ایک دوست کو یہ دونوں شمارے ہر ماہ گفٹ کرنا چاہتی ہوں۔ جیسا کہ میں سندھ میں رہتی ہوں اور وہ پنجاب میں رہتی ہے۔

ج پیاری رقیہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کا اندازہ صحیح ہے ہم نے آپ کے شہر کا نام پہلی بار سنا ہے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کے چھوٹے سے شہر میں تعلیم کی سہولیات مہیا ہیں اور آپ خود بھی تعلیم کے مقدس شعبہ سے وابستہ ہیں۔ آپ نے ٹھیک کہا۔ علم اور مطالعہ کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی ہے۔ مطالعہ کرنے سے انسان کے ذہن میں وسعت آتی ہے اور ایک اچھی مصروفیت اسے بہت سے فضول کاموں سے دور رکھتی ہے۔

اپنی دوست کو خواتین ڈائجسٹ جاری کرانے کے لیے 1200 روپے درج ذیل ایڈریس پر منی آرڈر کر دیں۔

خواتین ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی

اپنی دوست جس کو پرچہ جاری کرانا چاہتی ہیں' اس کا صحیح ایڈریس لکھنا نہ بھولیں۔

پروین ارشد۔۔۔ اتووالہ تحصیل کھاریاں

میں نے 7th کلاس سے خواتین ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا تھا۔ میٹرک کر کے اب میں بارہویں جماعت میں پڑھ رہی ہوں۔ آج تک خط اس لیے نہیں لکھا کہ ہمت نہیں تھی۔ میں نے اس رسالے سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ کرن کرن روشنی کی کئی کرنیں میری ڈائری کو منور کر رہی ہیں اور میری زندگی کو بھی۔ آپی! میں اس خط کے ذریعے اپنی بہنوں سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں کہ جس طرح اپنے گھر کو صاف رکھتی ہیں اسی طرح اپنے محلے کو' علاقے کو بھی صاف رکھیں۔ بچوں کو شروع سے ہی عادت ڈالیں کہ کچرا' کچرا دان میں ڈالا کریں۔ اپنے گھر کا کچرا باہر مت پھینکا کریں۔ فائزہ افتخار اور فرحت اشتیاق میری پسندیدہ رائٹرز ہیں۔

ج پروین! زندگی میں ہمت اور حوصلہ نہ ہونے کی بنا پر ہم بہت سے ایسے کام نہیں کر پاتے جو ہم تھوڑی سی کوشش سے کر سکتے ہیں۔ اب یہی دیکھ لیں اتنے عرصے سے آپ نے خط شائع نہ ہونے کے خوف سے ہمیں خط نہیں لکھا۔ اب ہمت کی تو خط شائع ہو گیا نا۔

آپ کا پیغام قارئین تک پہنچا رہے ہیں۔ اگر ہم اپنے گھروں کی طرح اپنی گلی' شہر اور محلہ کو صاف رکھنے کی کوشش کریں تو اس سے مچھر اور مکھیاں کم ہوں گی اور بیماریوں سے نجات ملے گی اور صاف ستھرا اور اچھا بھی لگے گا۔

مہرین احمد۔۔۔ لاہور

پہلے کرن کرن روشنی پڑھا۔ دل کو نور اور سرور حاصل ہوا۔ فرحت اشتیاق سے ملاقات اچھی لگی۔ ان کی عاجزی اور اللہ سے محبت پسند آئی۔

عنیزہ سید ہمیشہ کی طرح میچور لگیں اور خوب لکھتی ہیں۔ رخسانہ نگار کے پاس کیا کوئی جن ہے جو نئی نئی کہانیاں ان سے لکھواتا ہے۔ سیلانی بھائی اور ضیا دونوں اچھے لگے۔ "دل و نظر کے سلسلے" کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہی پرانی کزن کزن والی کہانی۔

"پچھلے پہر کی چاندنی" ایسی گیانی عرفانی عورت سے مرد عورت والا نہیں' مرید مراد والا عشق ہونا چاہیے۔

"ساری بھول ہماری تھی" عریشہ ناسمجھ اور معصوم ہے۔ یتیم — بچوں میں بہت سی کمیاں رہ جاتی ہیں۔ جب کوئی ان سے پیار سے پیش آتا ہے اسی کو اپنا سمجھنے لگتے ہیں۔ واقعی عادلہ کی غلطی تھی کہ انہوں نے اسے ان لوگوں کا اصل چہرہ نہیں دکھایا۔ کوئی غیر اس کو ورغلاتا تو اس کو برا کہہ سکتے تھے۔

کنیز نبوی کی کہانی میں سحر کا خودکشی کرنا برا لگا۔ وہ ذاتی طور پر بہت میچور تھی۔ یہ واقعہ اس کی شخصیت کو مضبوط کرنے کا باعث ہونا چاہیے تھا۔ نہ کہ اسے توڑنے کا۔ جب بندے اور لوگوں کے درمیان دروازے بند جاتے ہیں تو بندے اور اللہ کے درمیان والا دروازہ کھل جاتا ہے۔ سحر کو اس دروازے سے اللہ تک جانا چاہیے تھا' جہنم تک نہیں۔

"جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" ام مریم یہ لڑکی Personality disorder میں ہے۔

"خواہشوں کی مسافت" سبق آموز تھی۔ اچھی تھی۔

"ایسا بہروپ" انگلش کے ناول طرز اینڈ بون کی سمری لگا۔ بہت امیچور تھا۔

"حیرت نگر کا شہزادہ" اچھی تھیم تھی۔ مگر اچھے طریقے سے لکھی نہیں گئی۔ پڑھنے میں مزا نہیں آیا۔ فلاسفی جھاڑی ہوئی تھی۔

ج مہرین! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ آپ کی تعریف

و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

یاسمین کنول راجپوت۔۔۔ پسرور

دلکش دحسین دلہن سے سجا سرورق اچھا لگا۔ فرحت اشتیاق کا انٹرویو زبردست رہا۔ کوہ گراں تھے ہم عنیزہ سید کی بہترین تخلیق رہی۔ افسانوں میں پریت نگر اور بساط نے متاثر کیا۔ مستقل سلسلے اے ون ہیں۔

بس ایک گلہ ہے رسالہ خواتین کا اور نظمیں 'غزلیں میں صرف ایک خاتون کو شامل کیا گیا۔ کیا یہ ایک لطیفہ نہیں؟

ج یاسمین بہن! پورا رسالہ ہی خواتین کی تخلیقات اور انتخاب پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر نظمیں 'غزلیں میں تین مرد شعراء کو شامل کرلیا گیا تو ہمارے خیال میں اسے لطیفہ نہیں کہنا چاہیے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

عائشہ۔۔۔ ٹنڈو محمد خان

ٹائٹل اچھا لگا۔ سب سے پہلے سروے دیکھا۔ اپنا نام شامل نہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی۔ بہنوں نے بہت اچھے جوابات دیے۔ اچھا لگا پڑھ کر۔ فرحت اشتیاق کا انٹرویو پڑھ کر بہت مزا آیا۔

سب سے پہلے "ساری بھول ہماری" پڑھا' واحد یہ ناولٹ ہے جسے پڑھتے ہوئے بالکل بوریت نہیں ہوئی۔ ہر پیراگراف میں کہانی تھی۔ بہت اچھا لکھ رہی ہیں راحت! ویلڈن۔

سائرہ رضا کا "دل و نظر کے سلسلے" بہت اچھا بہت پیارا لگا۔ فرحت اشتیاق کا "جو بچے ہیں سنگ" بہت اچھا جارہا ہے۔ نگینہ عظمت کا مرشت عشق اقبال بانو کا بساط بھی اچھا لگا۔

ج ! آپ کا خط اور سروے دونوں ہی بہت اچھے تھے۔ شائع نہ ہوسکے۔ اس کا سبب صفحات کی کمی کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ معذرت خواہ ہیں کہ آپ کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

حمیرا ناصر۔۔۔ بھاولپور

میں نے خواتین اور شعاع تب سے پڑھنا شروع کیا تھا۔ جب میں چوتھی جماعت کی طالبہ تھی۔ سچ بتاؤں تو میں نے زندگی سے سمجھوتہ کرنا' اپنے شوہر کی عزت کرنا اور رشتوں کی اہمیت و قدر کو جاننا خواتین و شعاع سے ہی سیکھا ہے۔ اک بات بتاؤں۔ مجھے آپ سے اور آپ کے سارے اسٹاف سے بے پناہ محبت ہے' میرے لیے دعا کریں کہ میں صاحب اولاد ہو جاؤں' میرے شوہر پولیس میں ملازم ہیں' انہیں گھر آنے کا ٹائم مشکل سے ملتا ہے۔ ایسے میں جب تنہائی ستاتی ہے تو خواتین و شعاع کو ہی اپنا دوست سمجھتی ہوں۔ لیکن آپی میں آج کل بہت پریشان رہتی ہوں۔ اپنوں کے رویوں سے' تلخ زبان کے لہجے سے۔ میں جسے بھی پیار دیتی ہوں وہ مجھے بھولا اور معصوم سمجھ کر مجھ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میں اس خط کے ذریعے لوگوں کو پیغام دینا چاہتی ہوں کہ بہو بھی بیٹی ہوتی ہے۔ اگر وہ محبت کرتی ہے تو محبت چاہتی بھی ہے۔

باقی میری طرف سے عمیرہ احمد' فرحت اشتیاق' نمو احمد' نمو بخاری' رخسانہ نگار عدنان' کنیز نبوی کو بہت بہت پیار اور دعائیں۔

ج پیاری حمیرا! آپ کا طویل خط پڑھا۔ ہم سب آپ کی دوست ہیں اور آپ کے لیے دل سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی پریشانیاں دور کرکے آپ کو بے حساب خوشیوں سے نوازے۔ (آمین) حمیرا لوگوں کے رویوں سے اپنا دل چھوٹا نہ کریں۔ جو لوگ دوسروں کا دل دکھاتے ہیں خوش وہ بھی نہیں رہتے۔ آپ کے خوش رہنے کے لیے کیا یہ کافی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس قابل کیا ہے کہ دوسرے لوگ آپ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ آپ دوسروں کو خوشیاں دیتی ہیں۔ کسی کو دکھ دینے کا باعث نہیں ہیں۔ ہمارے خیال میں زندگی میں اس سے زیادہ اطمینان کا باعث کوئی بات نہیں ہوسکتی۔

عنیزہ سید

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی۔ وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے' تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں سعد کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

۲
دوسری قسط

"وہ کافی کمزور ہو رہی ہے" دوسرے کمرے میں آکر اس نے سیمی آنٹی سے کہا۔ "اس کی ڈائٹ بہتر کرنے کی کوشش کریں۔" اس نے اپنے بٹوے سے کچھ پیسے نکال کر ان کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔

"سب موجود ہے۔ دودھ، پھل، گوشت، مکھن، پنیر سب۔ وہ سب جس سے صحت بہتر ہوتی ہے۔" انہوں نے میز پر دھرے نوٹوں سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔ "مگر کھانا زبردستی تو کسی کے اندر نہیں ٹھونسا جاسکتا۔"

"نہوں!" سعد نے سرہلایا۔ "اس سلسلے میں بھی کوئی ترکیب سوچتے ہیں۔"

"اچھا۔" پھر اس نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ "اب میں چلوں، کوئی مسئلہ ہو یا کوئی ضرورت، مجھے فون کریجیے گا۔"

"گڈبائے ٹیک کیئر۔" سیمی آنٹی بڑبڑائیں۔

"سنا ہے 'انسانوں کے روپ میں فرشتوں کے وجود' والی بات غلط ہے۔" سعد کے جانے کے بعد سیمی آنٹی نے میز پر دھرے نوٹ سمیٹتے ہوئے کہا۔ "فرشتوں اور انسانوں کی بناوٹ میں بہت فرق ہوتا ہے۔" پھر انہیں یاد آیا۔

"پھر یہ خاص انسان ہوں گے، عام انسانوں سے ذرا مختلف، ذرا اونچے۔"

وہ یہ سوچتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھیں۔

"ذرا نہیں بہت مختلف، بہت اونچے۔" پیسے الماری کی دراز میں رکھ کر دراز کے تالے کی چابی گھماتے ہوئے انہوں نے اپنے دل میں حتمی اور آخری رائے دی۔

☆ ☆ ☆

"میں تے راتیں ستا ای نئیں جناب! بابے منگو دے میلے دل جان دا سن کے" (میں تو رات کو سویا ہی نہیں جناب! جب پتا چلا کہ بابے منگو کے میلے پر جانا ہے)

ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا کھاری اپنی انوکھی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"چل خیر! آرام نال بیٹھ، چھالاں کانوں مار دا پیاں ایں"۔ (چلو پھر آرام سے بیٹھو، چھلانگیں کیوں مار رہے ہو۔) ڈرائیور نے گھر کا۔

ماہ نور پچھلی سیٹ پر بیٹھی اونچے، نیچے راستوں، دھول سے اٹی فضا، گرد آلود سبزے اور موسم کی تمازت سے پریشان لوگوں کے چہرے دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل میں رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ وہ اس میلے پر کیوں جارہی تھی۔ اسے اس میں کیا دلچسپی تھی، مگر وہ اپنے ذہن و دل کو کوئی جواب دیے بغیر جیسے کوئی نئی دنیا دریافت کرنے کی امید میں یہ سفر کررہی تھی۔

"جلیب بڑے ودھیا ہوندے نیں میں سنیا بابے منگو دے میلے تے۔"

(جلیبیاں بہت عمدہ ہوتی ہیں بابے منگو کے میلے پر میں نے سنا ہے)

اس کے کان میں کھاری کا نیا ارشاد پڑا۔ ماہ نور کو کھاری کا پرشوق چہرہ بہت دلچسپ لگا۔ کھاری نے اسے بتایا تھا کہ وہ سحری کے وقت کا جاگا ہوا تھا، اس نے اپنی بہترین شلوار قمیص نہا دھو کر پہنی تھی، یہ اور بات کہ اس کی یہ شلوار قمیص تھی ایسی جیسے اپنے چھوٹے بھائی کی پہن آیا ہو۔ اس نے سبز رنگ کی ہوائی چپل پہن رکھی تھی اور سر پر کروشیے سے بنی سفید ٹوپی تھی۔ اس کے لباس سے اٹھتی سستے عطر کی مہک نے گاڑی کے ایئر کنڈیشنڈ ماحول کو خاصا ناقابل برداشت بنا رکھا تھا، مگر ماہ نور کو اس کی معصومیت اچھی لگ رہی تھی۔ یہ یتیم یسیر لڑکا بچپن سے ہی سردار چاچا کے ہاں پلا بڑھا تھا اور فارم ہاؤس کی ڈیری پر کام کرتا تھا۔ اس کے لیے یہ اتنی بڑی تفریح کا موقع تھا کہ ماہ نور کو اس کی کوئی بھی بات بری نہیں لگ رہی تھی۔

"لو جی میلہ شروع ہو گیا جے۔" پھر اسے کھاری کی آواز آئی جس میں خوشی کی واضح لہر دوڑ رہی تھی۔

ماہ نور نے شیشے سے باہر دیکھا۔ یہ کسی گاؤں کی طرف جانے کا داخلی راستہ تھا اور باہر دیکھنے پر ایسا لگ رہا تھا جیسے ساری خلقت اسی گاؤں کی طرف امڈ آئی ہو۔ نئے کپڑے اور رنگ برنگے کپڑوں سے ڈھکے سروں والے مرد، چادروں، برقعوں میں ملفوف خواتین، رنگ برنگے کپڑوں اور چمکتے زیورات سے مزین بچیاں، تیزی سے بھاگ کر گاؤں کی طرف جاتے بچے، یوں جیسے سب کسی جشن میں شریک ہونے والوں کا مجمع تھا۔ کسی کے ہاتھ میں تھیلے تھے، کسی کے ہاتھ میں ٹوکری اور کوئی یوں ہی پھول اور مزار پر چڑھانے کی چادریں لیے گاؤں کی سمت رواں تھا۔ داخلی راستے سے گزرنے کے بعد وہ ایک کھلے میدان کے سامنے آگئے، یہاں اکا دکا گاڑیاں، سائیکلیں اور موٹر سائیکلیں کھڑی تھیں، ڈرائیور نے ایک طرف گاڑی کھڑی کی اور کھاری نے نیچے اتر کر ماہ نور کے لیے دروازہ کھولا۔

"تنبو قناتاں وی لگیاں نیں، اید ا مطلب ایس واری بوہت تماشے ہو رہے نیں۔"

(شامیانے بھی لگے ہوئے ہیں، اس کا مطلب ہے کہ کئی قسم کے تماشے ہو رہے ہیں۔)

کھاری نے اس کے گاڑی سے باہر آتے ہی اسے اہم اطلاع دی۔ باہر شدت کی گرمی تھی۔

"آو جی! آو ادھر آو" ادھر ایسہ سارے ہوندے نیں، باندراں والے تے کتیاں دی دوڑ والے تے جھولیاں والے۔ (ادھر آئیں جی! ادھر وہ سارے ہوتے ہیں، بندروں، کتوں کی دوڑ والے اور جھولے والے۔) کھاری اسے گائیڈ کرتا ایک ایسی جانب لے گیا جہاں لوگوں کا ازدحام تھا، گرمی اور حبس تھا۔

وہ بمشکل دیکھ پائی۔ وہاں بندر کے تماشے والا بھی تھا، مٹی کے رنگ برنگ برتن بیچنے والا بھی، نت نئے پکوانوں کے اسٹال لگائے دکان دار بھی اور مختلف دیسی ہینڈی کرافٹس بیچنے مرد و زن بھی۔ ہجوم اتنا تھا کہ بار بار دھکے لگ رہے تھے، مگر بمشکل نظر آنے والے ان ہنرمندوں کے چہروں کو ماہ نور ایک ہی نظر ڈالنے پر دیکھ چکی تھی۔

"ناحق آئی۔" اس کا دل بار بار کہہ رہا تھا۔ اسے گائیڈ کرتا کھاری کسی تماشے میں اتنا محو ہو چکا تھا کہ اسے شاید بھول ہی گیا تھا، وہ کس کے ساتھ اور کیوں یہاں آیا تھا۔

"او کھے پینڈے لمیاں نیں راہواں عشق دیاں۔" وہ اس ہجوم سے باہر نکل کر نسبتاً کسی خالی اور سایہ دار جگہ کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھ ہی رہی تھی، جب اس کے کانوں میں یہ آواز پڑی۔ اس نے گھوم کر دیکھا لوگوں کا ایک جم غفیر تھا جو اس جگہ جمع تھا، جہاں سے یہ آواز آرہی تھی۔

پچھلاں ورگی جنڈری عشق رُلا چھڈ دا
سرباز ار جا لے عشق نچا چھڈ دا

آواز میں ایک عجیب سا سرور تھا۔ ماہ نور بے اختیار ادھر بڑھتی گئی۔ اس کی نظر ایک طرف پڑے بانسوں کے ڈھیر پر پڑی۔ وہ اس ڈھیر پر چڑھ کر کھڑی ہو گئی۔ اب حلقہ باندھے ہجوم کے درمیان کا منظر کچھ صاف نظر آرہا تھا۔

وہ ایک عام سا نوجوان تھا، جس نے کالے رنگ کا کرتا اور سبز شلوار پہن رکھی تھی۔ سر پر کالی پگڑی جس کے اندر سے نکلتے اس کے بال شانوں تک آرہے تھے۔ اس نے کانوں میں بالے پہن رکھے تھے اور اکتارہ پکڑے اس کے ہاتھوں کی انگلیوں میں موٹے نگینوں کی انگوٹھیاں موجود تھیں۔ اس نے پاؤں میں ہوائی چپل پہن رکھی تھی اور وہ لوگوں کی فرمائش پر بار بار یہی کافی سنا رہا تھا۔ ماہ نور کو خود بھی پتا نہیں چلا کہ وہ کتنی دیر تک وہاں کھڑی اسے سنتی رہی۔

ککھ نہ چھڈے دیکھ وفاواں عشق دیاں
او کھے پینڈے لمیاں نیں راہواں عشق دیاں

کھاری اس روز اپنے کھیل تماشوں سے فارغ ہونے کے بعد کتنی دیر ماہ نور کو ڈھونڈتا رہا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ماہ نور کا پتا نہ چلا تو اس کی نوکری خطرے میں پڑ جاتی تھی اور چوہدری صاحب کی جوتیاں الگ اس کا مقدر بن سکتی تھیں۔

دوپہر ڈھلے ماہ نور اسے بانسوں کے ڈھیر پر بیٹھی ملی۔ سورج کی تمازت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور پسینے کے قطرے اس کے چہرے پر چمک رہے تھے۔ کھاری تیزی سے ماہ نور کی طرف بڑھا۔

"وبی بی جی! تسی ادھر بیٹھے او میں ساری دنیا وچ لبھدا پھریا۔"

(او بی بی جی! آپ یہاں بیٹھی ہیں میں پوری دنیا میں ڈھونڈتا رہا۔)

اس نے بے اختیار اپنی جھلاہٹ کا اظہار کیا۔

ماہ نور نے ایک نظر کھاری کے گرد آلود کپڑوں اور چپلوں پر ڈالی۔

"اوہ! بے چارے کی تیاری سب خاک ہوئی۔" اسے دل میں افسوس ہوا۔

"او آئی ایم سوری کھاری!" ماہ نور نے کہا۔ "مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ تم کو بتاؤں' میں ادھر ہوں۔" اس کا لہجہ واقعی معذرت خواہانہ تھا۔ "مگر تم کہاں غائب ہو گئے تھے ہجوم میں؟" پھر اسے اچانک یاد آیا کہ خود اس کے ادھر چلے آنے سے پہلے کھاری غائب ہوا تھا۔

"میں تہاڈے واسطے ٹھنڈی بوتل لیاؤندا آں۔ تسی کدھرے چھاں وچ بیٹھو۔"

(میں آپ کے لیے ٹھنڈی بوتل لاتا ہوں۔ آپ کہیں سائے میں بیٹھیں۔) کھاری نے اس کی بات ان سنی کر دی۔ اسے ماہ نور کی حالت دیکھ کر فکر ہو رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ بی بی موسم کی ایسی سختی سہنے کی عادی نہیں تھی۔

"ٹھہرو! رکو کھاری۔" ماہ نور اسے روکنا چاہتی تھی۔ اس کے پاس ٹھنڈے پانی کا فلاسک تھا' اسے بوتل نہیں پینی تھی' مگر کھاری سیکنڈوں میں چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا تھا۔

مائے نی میں کینوں آکھاں
درد وچھوڑے دا حال نی

اس کا دھیان اپنے سامنے موجود ہجوم کے درمیان سے آتی آواز کی طرف چلا گیا۔ اس آواز میں ضرور کچھ ایسا جادو تھا جس نے اسے اب تک اپنے سحر میں جکڑ رکھا تھا۔ وہ اس آواز کو پہلی بار سننے کے بعد سے لے کر اب تک وہیں بیٹھی صرف اسی کو سن رہی تھی۔ وہ کون تھا جو بغیر توقف کے گا رہا تھا اور اس کی آواز کا سحر ارد گرد لوگوں پر چھا رہا تھا۔ ماہ نور کو بڑے بڑے کنسرٹس میں آنے والے مشہور و معروف گلوکار یاد آ رہے تھے جو اسٹیج پر آکر پس منظر موسیقی اور آواز پر صرف ہونٹ ہلاتے تھے اور لاکھوں روپے لے کر رخصت ہوتے تھے۔ یہ کون تھا جو دس' بیس روپے کے عوض آواز کا جادو جگائے چلا جا رہا تھا۔ بانسوں کے ڈھیر پر چڑھ کر بدقت اندر جھانکنے پر اسے یہ بھی نظر آیا تھا کہ اس کے ساتھ دو خواتین اور ایک مرد بھی تھا جو اپنے حلیے سے خانہ بدوش لگ رہے تھے۔ وہ اس کی آواز سننے والوں سے دس' دس' بیس' بیس روپے وصول کر رہے تھے اور اتنے ہوشیار تھے کہ شاید ہی کوئی سننے والا بغیر پیسے دیے سن پایا ہو۔

"سائیں ہے' درویش ہے۔" کچھ لوگ گانے والے کا تعارف اپنے طور پر دے رہے تھے۔

"ریڈیو ملتان سے سنتا ہوں اس کی کافی۔" کوئی کہہ رہا تھا۔

"نہ جی نہ۔ یہ تو بس میلوں' ٹھیلوں پر نظر آتا ہے۔ سائیں سرکار کا ماننے والا ہے۔" کسی نے رائے دی تھی۔

"اس کے گلے میں سُر ہے' اس کی انگلی تار ایسے بجا رہی ہے جیسے سالوں کی مشق کر رکھی ہو۔" ماہ نور نے خود اپنی رائے بھی قائم کی۔

"وبی بی جی! تسی ہلے ایدھرای بیٹھے او۔" (او بی بی جی! آپ ابھی ادھر ہی بیٹھی ہیں۔) کھاری نے آکر اسے اس کی سوچ سے جگایا۔ ماہ نور نے دیکھا' کھاری کے ہاتھ میں کولڈ ڈرنک ــــــ تھی' جو یقیناً "خاصی ٹھنڈی تھی۔ بوتل کے باہر پانی کے قطرے چمک رہے تھے۔

"وبی بی! بوتل پیو تے کدھرے چھاں وچ ہو جاؤ۔" (لیں بی بی! بوتل پئیں اور کہیں چھاؤں میں آجائیں) کھاری نے بوتل اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"شکریہ کھاری!" ماہ نور نے بوتل سے گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "مگر یہاں سے دور نہیں جانا ناں۔"

کھاری نے حیرت سے اس جگہ کو بغور دیکھا' جہاں ماہ نور بیٹھی تھی اور پھر ارد گرد دیکھا۔ اسے وہاں کوئی قابل توجہ چیز نظر نہیں آئی۔ پھر اس نے اس ہجوم کی طرف دیکھا جس کے اندر اس وقت خاموشی تھی۔

"اتھے باندر والا اے اندر؟" (ادھر بندر کے تماشے والا ہے۔) کھاری نے سوالیہ نظروں سے ماہ نور کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سائیں ہے ادھر' اس سے مل کر جائیں گے' جب یہ فارغ ہو گا۔" ماہ نور نے مسکرا کر کھاری کی غلط فہمی دور کی۔

کھاری کی سمجھ میں یہ جواب قطعی نہیں آیا تھا کہ یہ بی بی بندر والے سے سائیں سے ملاقات تک کیسے آن پہنچی تھی۔ اس نے سمجھ میں کچھ نہ آنے کے سے انداز میں شانے اچکائے۔

"میں تہاڈے واسطے نان تے پکوڑے لیاواں۔ بڑے مشہور ہیں ایس میلے دے۔" (میں آپ کے لیے نان اور پکوڑے لاؤں۔ یہاں کے نان پکوڑے بہت مشہور ہیں۔) اس نے ماہ نور سے پوچھا۔ ماہ نور نے نفی میں سر ہلا کر منع کر دیا۔

"تم خود کھا آؤ جا کر۔" ماہ نور نے کھاری کے چہرے پر مایوسی اترتے دیکھ کر کہا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور دائیں سمت مڑ گیا۔ یہ اجازت اس کا پیٹ بھرنے والی تھی جو صبح سے دہائی دے رہا تھا۔

دھوپ کی تمازت آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہوئی اور شام کے سائے اترنے لگے۔ میلے کی چہل پہل میں قدرے کمی آنے لگی۔ ماہ نور کے سامنے موجود بھیڑ بھی رفتہ رفتہ کم ہو رہی تھی۔ اب صرف اتنی تعداد میں لوگ گھیرا باندھے کھڑے تھے جن کے درمیان سے بآسانی اندر کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔

اوکھے پینڈے لمیاں نیں راہواں عشق دیاں
ککھ نہ چھڈے ویکھ وفاواں عشق دیاں

اندر موجود سائیں آنکھیں بند کیے گاتا نظر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ موجود خواتین اور مرد ـــ تقریباً" آخری ہجوم سے پیسے وصول کر رہے تھے۔ ان کی پیسوں والی گٹھڑیاں بھر چکی تھیں۔

"یہ کمائی کے لحاظ سے بہت اچھا دن ثابت ہوا ہو گا۔" ماہ نور نے سوچا اور پھر سامنے کھڑے کھاری کی طرف دیکھا جو اب تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

"میں اندر جا کر سائیں نال ملاقات دا انتظام کرواں۔" (میں اندر جا کر سائیں سے ملاقات کا انتظام کرتا ہوں۔) کھاری لوگوں کے گھیرے کے اندر داخل ہو گیا۔ اب وہ سائیں کے ساتھ موجود مرد سے مذاکرات کرتا نظر آ رہا تھا۔

سائیں بھی کافی ختم کر کے اس گفتگو کو سننے میں مشغول ہوا۔ کچھ دیر بعد ماہ نور نے سائیں کا سر اثبات میں ہلتا ہوا دیکھا۔ وہ کھاری سے یقیناً "یہ کہہ رہا تھا کہ وہ اس کی بی بی سے مل لے گا۔

اس وقت شام بھی ڈھل چکی تھی جب اردگرد روشن ہوتی بتیوں کی روشنی میں ماہ نور نے خود کو سائیں کے سامنے کھڑا پایا۔

"آپ کی آواز میں لوچ ہے' سحر ہے' جادو ہے۔" وہ سائیں سے کہہ رہی تھی۔ "یہ تو بڑے فنکاروں والی خصوصیات ہیں۔ آپ کا نام کیا ہے؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

"سرکار کے سائیں بہتیرے اور سب ایک جیسے سائیں۔" اس کی بات سن کر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "نام میں کیا رکھا ہے؟"

"آپ کی آواز میں اتنے سحر کی وجہ؟" ماہ نور نے اپنی بات پر اصرار کرنے کے بجائے دوسرا سوال کیا۔ اب کے سائیں کی نظریں جیسے زمین پر ہی جم گئیں۔ خاصے توقف کے بعد سائیں نے نظریں اٹھائیں اور بولا۔

"عشق۔"

اس کی نظریں ماہ نور کے چہرے پر جمی تھیں۔ ڈھلتی شام کے سایوں اور اردگرد جلتی روشنیوں کے درمیان سائیں نے ماہ نور کو اور ماہ نور نے لمبی زلفوں اور گھنی داڑھی میں چھپے سائیں کو جیسے پہچان لیا تھا۔

☆☆☆

"یہ انیس سو بہتر کی بات ہے یا پھر شاید انیس سو تہتر کی۔" خدیجہ نے اپنے سامنے بیٹھی فاطمہ کو مخاطب کیا جس کے ہاتھ میں پکڑی کروشیے کی سلائیاں آپس میں تیزی سے چڑچڑ کر رہی تھیں۔

"خاصی پرانی بات ہے پھر تو۔" فاطمہ نے عینک کے شیشوں کے اوپر سے خدیجہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے یاد نہیں ہوگا پھر۔"

"ہاں! تم تو جیسے منی کاکی ہو۔" خدیجہ چمک کر بولیں۔ "انیس سو بہتر تہتر کچھ اتنے بھی دور کے سال نہیں ہیں بی بی! یاد کرو' وہ زمانہ جب احمد رشدی کے گانے سنا کرتے تھے اور وحید مراد کی ادائیں دیکھا کرتے تھے۔" اس نے یاد دلاتے ہوئے کہا۔ "کچھ یاد آیا؟"

"ہاں خیر! احمد رشدی اور وحید مراد کو کون بھول سکتا ہے۔" فاطمہ نے کروشیے کے پھندے ڈالتے ہوئے سکون سے جواب دیا۔

"اور قصوری کی نیلو فر علیم اور شکیل بھی یاد ہوگا؟ کیا شاندار جوڑی تھی۔" خدیجہ نے مزید یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی! اس زمانے میں کیا یہ فنکار' فنکارائیں ہی تھیں جو صرف ان ہی کی یاد دلا رہی ہو۔" اب کے فاطمہ کچھ جھنجلا گئیں۔

"وہ تو میں تمہاری یادداشت جو کھو گئی ہے' اسے واپس لانا چاہ رہی تھی۔ اس لیے آغاز فنکاروں اور فنکاراؤں سے کیا۔" خدیجہ نے فاطمہ کو تنگ کرتے ہوئے کہا اور زور سے ہنس دیں۔

"اصل میں تو تم کو یاد دلانا تھا انیس سو اکہتر یا بہتر کا آغا جان کا وہ دورہ پاکستان' جب ہم ان کی اور ان کی بیٹیوں کی ادائیں دیکھ دیکھ کر یوں متاثر ہوتے تھے جیسے کوئی خلائی مخلوق آگئی ہو ہمارے گھر میں۔" پھر خدیجہ نے سنجیدہ ہوتے ہوئے اصل بات کی۔

"وہ ہاں!" فاطمہ نے ہاں کو ذرا کھینچتے ہوئے کہا۔ "اس وقت میں پانچ اور تم آٹھ سال کی تھیں۔"

"توبہ ہے فاطمہ! اب آپس میں تو جھوٹ نہ بولو۔" خدیجہ نے منہ بنایا۔ "اس وقت تم دس اور میں پندرہ سال کی تھی۔ پتا نہیں! تم کو چھوٹا بننے کا شوق کیوں چرا تا ہے۔" خدیجہ جھنجلا کر بولیں۔

"ارے بی بی!" فاطمہ نے اون اور سلائیاں ایک طرف رکھ کر آنکھوں سے عینک اتارتے ہوئے کہا۔ "دماغ کے ضعف اور یادداشت کی کمزوری کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ ورنہ اتنے برسوں میں گزرے حادثوں، سر میں اترتی چاندی اور دل کا اجاڑ پن خود سے ہی عمر ظاہر کر دیتا ہے۔ ہماری تمہاری' بلکہ اپنی اصل عمر سے کچھ زیادہ ہی کی دکھتی ہوں گی ہم دونوں۔"

"ایک راز کی بات یہ ہے کہ اگر تم اب بھی بال رنگ لو' فیشن کے مطابق کپڑے پہننے لگو اور خود پر سے اداسی اور چڑچڑاہٹ کا لبادہ اتار پھینکو تو تم اپنی عمر سے کم از کم دس سال کم کی لگنے لگو۔" خدیجہ نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ فاطمہ مسکرا دیں۔

"اور تم مجھ سے بھی کوئی دو' تین سال کم کی لگو۔" انہوں نے کہا۔

"آکا جان کے اسی دورے کے دوران تو ہمارے گھر میں اکیس انچ اسکرین اور لمبی پتلی ٹانگوں والوں وہ بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی آیا تھا جس پر ہم شہزوری اور بعد میں کرن کہانی دیکھا کرتے تھے۔" فاطمہ نے پھر یاد کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں! ہاں وہی زمانہ۔" خدیجہ خوش ہو کر بولیں۔ "تمہیں یاد ہے آکا جان کی شہناز کو دیکھ کر ہم کیسا امپریس ہوتے تھے؟"

"تو اور کیا!" فاطمہ کو بھی یاد آیا۔ "یہ لمبے بال کالے سیاہ' ستواں ناک' بڑی بڑی آنکھیں۔"

"اور اس کی آواز۔" خدیجہ نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ "یاد ہے ہم اس سے فرمائشیں کر کے نعتیں بھی سنتے تھے اور غزلیں بھی؟"

"سلیم چاچا نے لے جا کر ریڈیو پر اس کا آڈیشن بھی دلوایا تھا۔" فاطمہ کو یاد آیا۔

"اور وہیں سے اس بے چاری کی زندگی کی کہانی پلٹ گئی۔" خدیجہ کے چہرے پر تاسف چھا گیا۔

"او ہو۔" فاطمہ کا لہجہ بھی غمزدہ سا ہو گیا۔

"نہ وہ آڈیشن دیا جاتا' نہ شہناز سلیکٹ ہوتی۔ نہ یہیں رہ جانے کی ضد کرتی' نہ ہی اس کی زندگی برباد ہوتی۔" خدیجہ جیسے خلاؤں میں ماضی دیکھ رہی تھیں۔

"انیس سو اکہتر' بہتر سے لے کر انیس سو بانوے' کتنے سال بنے؟" فاطمہ نے انگلیوں کی پوروں پر گنتے ہوئے کہا۔

"محض اکیس' بائیس سال پر محیط کہانی کا مرکزی کردار بنی شہناز۔" گنتی کر لینے کے بعد فاطمہ نے کہا۔

"خاک سے خاک ہوئی بے چاری۔" خدیجہ مایوس انداز میں بولیں۔ "اور اس کی اپنی سگی بہن رئیسہ اور اس کی اولاد آکا جان کی سب جمع جائیداد کی مالک بن کر عیاشی کر رہی ہے۔"

"کچھ سراغ نہ لگا شہناز کا' کہاں غائب ہوئی؟" فاطمہ نے بھیگی آنکھیں دوپٹے کے پلو سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"اے ہے! سراغ کیا لگنا تھا۔" خدیجہ تیز آواز میں بولیں۔ "سنا نہیں تھا' چھری پھیر کر گلا کاٹ دیا تھا اس کے ظالم شوہر نے۔"

"تو! یہ سنا ہی تھا نا' آنکھوں سے دیکھا تو نہیں تھا نا۔" فاطمہ حقیقت پسند تھیں۔

"ایسے ہی خبریں نہیں اڑا کرتیں۔" خدیجہ نے دلیل دی۔ "اور آکا جان کا یاد ہے؟ کیسا کلیجہ پتھر ہوا تھا۔ کہتے تھے' ہرگز پتا نہیں کروں گا اس کا کہ زندہ ہے یا مر گئی' کیونکہ میرے لیے تو وہ برسوں پہلے ہی مر گئی تھی۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آیا آج تک کہ ہوا کیا تھا اس کے دماغ کو' جو ماں' باپ' بہن چھوڑ کر' زندگی کا عیش آرام چھوڑ کر خاندان کے نام پر بٹا لگانے چل پڑی تھی موسیقی کی دنیا میں نام پیدا کرنے۔" فاطمہ کا دل سخت رنجیدہ ہو گیا تھا۔

"اور کسی کو تو شاید یاد بھی نہ ہو' خاندان بھر میں سے ہم دونوں ہی رہ گئی ہیں' بیتی کہانیاں اور المناک افسانے یاد کرنے کو۔" خدیجہ نے آنسوؤں کے درمیان مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ ہم دونوں کو ہی نہ کوئی کام ہے نہ کاج' نہ فکر نہ فاقہ' نہ اولاد' نہ شوہر' نہ کوئی آگا' نہ پیچھا۔" فاطمہ بھی آنسوؤں کے درمیان مسکرا دیں۔

"چلو! گرد میں اٹی کہانیوں قصوں کی گرد جھاڑنے کا کام تو رہتا ہی ہے نا ہمیں۔" خدیجہ نے ہنس کر کہا۔ "سو کرتے رہیں گے۔" وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے بولیں۔

"ایک تو یہ جاڑوں کی آمد' جس کا انتظار بھی رہتا ہے' مگر عمر کے تقاضے یہ ہیں کہ سردی سے بچا جائے۔" انہوں نے کہا۔

"سوپ پیو گی' بنا لوں؟" انہوں نے فاطمہ سے پوچھا۔

"ہاں!"

فاطمہ نے کہا۔ خدیجہ مسکرا کر کچن کی طرف چل دیں اور فاطمہ میز پر بکھری چیزیں سمیٹنے لگیں۔ دھوپ ڈھل کر بیرونی دیواروں تک پہنچ چکی تھی۔ لان میں ڈھلتی دھوپ اور اترتی شام کے سائے باہم رقصاں تھے۔ اس فضا اور اس منظر کو دیکھ کر انہیں نجانے کیا کیا کچھ یاد آ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بندر کے تماشے دکھانے والا اور ریچھ نچانے والا شخص لوک گلوکار کیسے ہو سکتا ہے؟" اس روز میلے سے واپس آتے ہوئے ماہ نور کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا۔

"مگر یہ بھی تو حتمی بات نہیں کہ یہ وہی شخص تھا۔" پھر اس نے دوسری بات سوچی۔

"آواز میں سحر کی وجہ؟" پھر اس کے کانوں میں اپنی ہی آواز کی بازگشت سنائی دی۔

"عشق۔"

ایک مختصر جواب اس کے ذہن پر دستک دینے لگا۔ کتنا مختصر جواب تھا یہ' مگر اس کے کتنے معنی تھے۔ اس جواب کو کتنے معنوں میں سمجھا جا سکتا تھا۔ یہ مبہم جواب تھا یا با معنی' مختصر تھا یا جامع۔ ماہ نور سارا راستہ اسی قسم کی باتیں سوچتی آئی تھی۔ وہ کوئی خاص امید لے کر "بابے منگو" کے میلے پر نہیں گئی تھی' مگر وہاں سے واپسی پر اس کا دل خوش تھا اور ہلکا بھی۔ اسے لگا وہ اس میلے سے بہت کچھ لے کر واپس لوٹی تھی۔ اگرچہ چاچا سردار اور چاچی صابرہ کو افسوس ہوا تھا کہ وہ میلے سے کوئی ایسی سوغات خرید کر نہیں لائی تھی جو اپنے گھر والوں کو دکھا سکے۔

"سوغات چھڈ' نکی بی بی نے اوتھوں کجھ کھادا پیتا وی نئیں۔ بھکھی پیاسی واپس آ گئی۔" (سوغات چھوڑیں بی بی نے وہاں سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں' بھوکی پیاسی واپس آ گئی) کھاری نے چاچی صابرہ کو خصوصی اطلاع دی تھی۔

"وے مر نیا! توں کادے واسطے نال گیا سیں؟" (کم بخت تم کس لیے ساتھ گئے تھے) چاچی صابرہ نے جواب میں کھاری کو ڈانٹا تھا۔

"میں تے جلیبیاں دکھائے' نال پکوڑیاں دا پچھیا' ٹھنڈی بوتل لیا کے دیتی۔ پوچھو بی بی نوں۔" (میں نے جلیبیاں دکھائیں' ساتھ پکوڑوں کا پوچھا' ٹھنڈی بوتل لا کر دی۔ پوچھ لیں بی بی سے۔) کھاری نے اپنی صفائی دیتے

ہوئے بتایا تھا۔

"او رے! اس کو مت ڈانٹیں چاچی!" ماہ نور نے کھاری کی طرف نرمی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ہی تو مجھے وہاں لے جانے کا وسیلہ بنا۔"

"میں تے شرطیہ کہندا ساں کہ اوتھے تہانوں بڑا مزا آئے گا۔" (میں نے تو شرط لگا کر کہا تھا کہ آپ کو وہاں بہت مزا آئے گا) کھاری اپنی تعریف اور ماہ نور کے لہجے کی نرمی پر خوش ہو کر بولا۔

میلے سے واپسی کے دو دن بعد ماہ نور، سردار چاچا اور صابرہ چاچی سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلی گئی۔ اس کے جانے کے دو ہفتے بعد کھاری کو اپنے گھر کی چھت کی صفائی کے لیے مٹی کی گھائی کرتی ماسی شریفاں کی مدد کرتے اچانک نہ جانے کیا یاد آیا کہ وہ ماسی شریفاں کو بتانے لگا۔

"او جیہڑی بی بی سی ناں شہر والی، چوہدری صاحب دی بھتیجی، او بڑی اللہ لوک بی بی سی، اوس میلے والے دن اوس نے نہ کج کھادا نہ پیتا بس! مٹی دی ڈھیری تے بیہہ کے سائیں دے گیت سندی رہی۔" (وہ جو شہر والی بی بی تھی ناں، چوہدری صاحب کی بھتیجی، وہ بڑی اللہ لوک بی بی تھی۔ اس میلے والے دن اس نے نہ کچھ کھایا نہ پیا بس مٹی کے ڈھیر میں بیٹھی سائیں کے گیت سنتی رہی۔)

"تے ایہہ" (اور یہ) پھر کھاری نے اپنی شلوار میں سلی جیب سے پانچ پانچ سو کے چار سبز نوٹ نکال کر چاچی شریفاں کو دکھائے۔ "جاندی واری میتوں دے گئی اے۔ ایہہ روپے، بئی کھاری! اپنے واسطے کوئی لیڑا سوالئیں اے جتی وی لے لئیں۔" (جاتے ہوئے مجھے یہ پیسے بھی دے گئی کہ کھاری! اپنے لیے کپڑے سلوانا اور جوتی بھی لے لینا)

"وے جھلیا (او بے وقوف)" ماسی شریفاں نے کھاری کے اس ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے دھکا دیا جس میں اس نے پیسے پکڑے ہوئے تھے۔ "سانبھ کے رکھ، نمیش نہ کر۔ پے کوئی کھوندا ای سائیں لوکا۔" (سنبھال کر رکھ نمائش نہ کر ان کی)۔ (ابھی کوئی چھین لے گا بھولے انسان)

کھاری نے گھبرا کر نوٹ واپس شلوار کی جیب میں رکھ لیے۔

"او کون سی؟" (وہ کون تھا) کچھ دیر تک خاموشی سے کام کرنے کے بعد ماسی شریفاں نے کھاری سے پوچھا۔

"او سائیں۔" (وہ سائیں) کھاری کے سوالیہ نظروں سے دیکھنے پر اس نے اپنا سوال مکمل کیا تھا۔

"رب جانے!" کھاری نے شانے اچکا کر کہا۔ "پر جد بی بی نے پچھیا کہ ایہہ ای سوہنی آواز، ایہہ ای مٹھری آواز کدوں پائی، تے سائیں بولیا عشق۔" (بی بی نے پوچھا کہ اتنی اچھی اور میٹھی آواز کیسے پائی؟ تو سائیں بولا عشق۔)

"چل! چھتی کم مکا چل۔" (چل جلدی کام ختم کر) ماسی شریفاں اس بات کو سن کر لمحہ بھر کو ٹھٹکی پھر بولی۔

لیکن کھاری کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس لفظ کو سننے کے بعد پہلے بی بی اور پھر ماسی شریفاں ٹھٹھکی کیوں تھیں۔ وہ کئی دن اس بات پر غور کرتا رہا۔

☆ ☆ ☆

"آج میں تمہیں اپنا فیورٹ سونگ سناؤں گا۔" سعد نے سارہ سے کہا۔ "مگر ایک شرط ہے پہلے تم اپنے لنچ میں موجود ہر چیز ختم کرو گی۔"

"پھر ایک شرط میری بھی ہے۔" سارہ نے جواب میں کہا۔

"ہاں بولو۔" سعد نے اپنا لیپ ٹاپ آن کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"تم وہ سونگ خود بھی مجھے گنگنا کر سناؤ گے۔" سارہ نے خود کو تھوڑا پیچھے کھسکاتے ہوئے تکیوں کا سہارا لے کر کہا۔

"کون میں؟" وہ اس کی طرف دیکھ کر بے اختیار ہنس دیا۔

"تم ہنستے ہوئے بہت اچھے لگتے ہو، پہلے کبھی تمہیں کسی نے بتایا؟" سارہ نے بے اختیار کہا۔

"نہیں!" اس نے سر ہلا کر کہا۔ "اتنی فرصت اور دھیان سے کبھی کسی نے مجھے ہنستے دیکھا ہو تو کہے نا۔" وہ مسکرایا۔

"خیر!" سارہ نے تکیے سے سر ٹیکتے ہوئے کہا۔ "بات ٹالنے کی کوشش نہ کرنا۔ تم یہ گانا مجھے گنگنا کر بھی سناؤ گے۔"

"ارے بابا! کیوں اس گھر سے نکلنے کا سامان کرنا چاہ رہی ہو۔" وہ سر جھٹک کر بولا۔ "تمہارے سب ہمسائے دستک دینے لگیں گے تھوڑی دیر بعد اور کہیں گے کہ گھر خالی کردو۔" سارہ خاموش رہی۔

"اتنی بھونڈی ہے میری آواز۔" اپنی بات کے جواب میں سارہ کی خاموشی پر سعد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"میں نے تو کبھی باتھ روم میں بھی گنگنانے کی جرات نہیں کی، کہیں چیزیں کیبنٹ سے نیچے نہ گرنے لگیں ڈر کے مارے۔" وہ مزید بولا۔

"تم مجھے گنگنا کر سنانے کے وعدے پر ہی مجھ سے لنچ ختم کرا سکتے ہو۔" وہ اپنی بات پر اڑتے ہوئے بولی۔

"اوکے بیوٹی فل! جیسے تم بولو۔" وہ فوراً مان گیا۔ اسے سارہ کو ہر حال میں لنچ کرانا تھا۔ ڈاکٹرز اس کے لو بلڈ پریشر اور گرتے ہوئے وزن کی وجہ سے پریشان تھے۔

"میں جانتی ہوں سعد! کہ میں خوب صورت تو چھوڑ قبول صورت بھی نہیں ہوں۔" لنچ کرتے کرتے سارہ نے کہا۔

"وہ رئیلی!" اس کے لیے پلیٹ میں مزید کیچ اپ ڈالتے ہوئے سعد نے ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں!" سارہ نے یوں کہا جیسے اسے اپنی بات پر پورا یقین ہو۔ "پھر تم مجھے کبھی بیوٹی فل، کبھی گورجیس، کبھی پریٹی گرل (پیاری لڑکی) کہہ کر کیوں بلاتے ہو۔" سارہ نے بیک کیے ہوئے آلو کا قتلہ منہ میں ڈالتے ہوئے بات مکمل کی۔

"ہوں۔" سعد اپنا ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر کچھ سوچنے لگا کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے سارہ کی طرف دیکھا۔ "اس لیے اچھی لڑکی کہ مجھے اپنے الفاظ پر کوئی شک نہیں۔ میں پورے یقین کے ساتھ تمہیں یہ سب کہتا ہوں۔"

"تم صرف میرا اعتماد بحال کرنا چاہتے ہو۔" سارہ نے پلیٹ سے گرلڈ چکن کا آخری ٹکڑا اٹھاتے ہوئے کہا۔ "مگر یقین جانو! کہ ایسے خوش کن اسٹیٹمنٹس کے بغیر بھی تم میرا اعتماد بحال کر سکتے ہو۔"

سعد نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ "وہ کیسے۔"

"زندگی پر، خود اپنے آپ پر اور لوگوں پر میرا اعتماد بحال کرنے کو یہ حقیقت کیا کم ہے کہ تم جیسا انسان میرا اتنا خیال رکھ رہا ہے۔" سارہ نے گلاس اٹھا کر پانی کا ایک گھونٹ لینے کے بعد کہا۔

"میں بچپن سے لوگوں کے درمیان رہی ہوں۔" کچھ توقف کے بعد وہ بولی۔ "مختلف قسم کے انسان جن میں سے اکثر مطلبی، بدذات، خود غرض اور کمینے تھے، وہ جنہیں مجھ میں صرف اتنی دلچسپی تھی کہ میری ذات، میرے کرتب، میرے کھیل تماشے ان کی جیبیں گرم کروانے میں کتنے کام آسکتے تھے، کتنے ہی ایسے تھے جو تماشائی تھے، میرے کرتب پسند آنے پر تالیاں بجاتے سیٹیاں بجاتے اور سکے اچھالتے لوگ۔" وہ تواتر اور تسلسل کے ساتھ

بہت دنوں کے بعد بول رہی تھی۔ سعد کو خوشی ہوئی۔

"کئی مہربان بھی تھے' ہمدردی کرنے والے' نرمی سے بات کرنے والے' میری غلطیاں معاف کردینے والے۔" پھراس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ وہ لوگ تھے جو اس وقت میرے ساتھ تھے' جب زندگی متحرک تھی' جب زندگی میں رنگ تھے اور گرم جوشی بھی۔" وہ سانس لینے کو رکی۔ اس نے لحہ بھر کو سعد کی طرف دیکھا۔

سعد محویت سے اس کی بات سن رہا تھا۔

"لیکن تم۔" پھر وہ بولی۔ "تم نے اس وقت مجھے اسپاٹ کیا' جب زندگی رک گئی تھی۔ جب کوئی رنگ بچا تھا' نہ گرم جوشی' کوئی آس تھی نہ امید' ہر طرف اندھیرا تھا اور ناامیدی' اپنی غرض کے لوگوں کے لیے میں ناکارہ ہوچکی تھی' تماشائیوں کی تالیاں' سیٹیاں اور سکے میرے لیے بند ہوچکے تھے' مہربان اور ہمدرد لوگوں کا ذخیرہ بھی ختم ہوچکا تھا۔ جب تم نے مجھے اسپاٹ کیا اور مجھے زندگی کی طرف واپس لانے کی ترکیب کرنے لگے۔"

"اگر یہی کافی ہوتا تو تم زندگی کی طرف لوٹ آئی ہوتیں اب تک۔" سعد نے ٹرے اٹھا کر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم کو ابھی تک یقین نہیں آیا کہ زندگی ہے اور زندگی بہت خوب صورت ہے۔ تمہیں یہ بات بھی ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی کہ زندگی صرف ایک بار ہی ملتی ہے۔"

"جب میں ایکروبیٹ روپ (بازی گروں کی رسی) پر چلتے ہوئے گری تھی' اس وقت مجھے لگا تھا کہ میری ساری ہڈیاں ٹوٹ کر چکنا چور ہوچکی ہیں اور میں گوشت کا ایک چرامرا سالوتھڑا بن چکی ہوں۔ وہ لوتھڑا بھی قریب الختم نظر آرہا تھا' جب میں نے اپنے جسم کے ہر حصے سے بہتے ہوئے خون کو ادھرادھر بکھرے دیکھا۔ صرف میرا ذہن زندہ تھا جو محسوس کراتا تھا اور میری آنکھیں زندہ تھیں جو دیکھ رہی تھیں۔"

"پھر بھی تمہیں زندگی اور زندگی دینے والے پر اعتبار نہیں آیا؟" سعد نے بے ساختہ سوال کیا۔ "وہ جسم جس کی ہڈیوں کا سارا ڈھانچہ ٹوٹا پھوٹا محسوس ہورہا تھا اور جو صرف ایک لوتھڑے میں بدل کر رہ گیا تھا' اس کے دوبارہ جسم بننے کے عمل کے دوران بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آیا کہ زندگی دینے والا کیسے ہڈیوں میں دوبارہ جان ڈال دینے پر قادر ہے؟ بہتا خون رکا اور دوبارہ سے اسی جسم کی شریانوں میں دوڑنے لگا تو بھی تمہیں یقین نہیں آیا کہ زندگی دینے والا جب تک نہ چاہے زندگی جا نہیں سکتی' موت آ نہیں سکتی؟"

"ادھوری زندگی' مفلوج جسم' ناکارہ وجود' محتاجی' ترس' ترحم۔" سارہ نے بلند آواز میں کہا۔ "دینے والے کی شان کے صدقے۔"

"غلط۔" سعد نے تیزی سے کہا۔ "دینے والے نے دوبارہ دیا' یہ تمہارے سوچنے کا انداز ہے جو دیے ہوئے کو ادھورا' مفلوج' ناکارہ' محتاج اور ترس کا مارا ہوا سمجھتا ہے۔ پھر بھی تم کہتی ہو کہ تمہارا اعتماد بحال ہوسکتا ہے؟"

"اگر تم سمجھتے ہو کہ نہیں ہوسکتا تو کوشش کیوں کرتے ہو؟" سارہ کا لہجہ ترش ہوگیا۔

"اس لیے کہ مجھے زندگی دینے والے پر بھی یقین ہے اور اس کی دی ہوئی زندگی پر بھی۔" سعد نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "اور میں اس وقت تک کوشش کرتا رہوں گا جب تک کامیاب نہ ہوجاؤں۔"

"لیکن کیوں؟ میں ہی کیوں؟" سارہ نے بہت بار پوچھا ہوا سوال دوبارہ پوچھا۔ "اس دنیا میں' اسی ملک میں' اسی شہر میں کئی اور بے بس' معذور' مدد اور توجہ کے مستحق لوگ موجود ہیں' پھر میں کیوں؟"

"اس لیے کیونکہ مجھے وہی کام کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ کو مجھ سے کروانا ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر میں چاہوں تو ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔" سعد نے اٹھ کر لیپ ٹاپ پر کوئی کام کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے Bruno Mars بہت پسند ہے۔ اس کے گانوں کے الفاظ بہت خوب صورت ہوتے ہیں۔

معصوم' چھوٹے چھوٹے' بے ریا' مگر بہت پاورفل۔" سعد نے مگن سے انداز میں کہا۔ "جذبات کی عکاسی کرتے الفاظ۔" اس نے اپنی پلے لسٹ سے ایک گانا نکال کر آن کرتے ہوئے کہا۔

"تم بھی سنو!" اس نے لیپ ٹاپ سارہ کی گود میں رکھ دیا۔

If you ever find yourself stuck in the middle of he sea
I will sail the world to find you
If you ever find yourself lost in the dark and you can't see
I will be the light to guide you
Find out what we are made of what we are called to help
our friends in need
you can count on me like
one two three
I'll be there.

(اگر کبھی تم خود کو سمندر میں پھنسے ہوئے پاؤ۔
میں پوری دنیا کے سفر کرتے ہوئے تم تک پہنچوں گا۔
اگر تم کبھی اندھیرے میں یوں گم ہوجاؤ کہ تمہیں کچھ دکھائی نہ دے۔
میں ایک راہ نما روشنی بن کر تمہارے پاس آؤں گا۔
ذرا سوچو! ہمارا مقصد کیا ہے' جب ہمیں ہمارے دوست پکارتے ہیں۔
تم صرف گنتی گنو گے
ایک۔۔ دو۔۔ تین
تم مجھے اپنے پاس پاؤ گے۔)

Bruno Mars اپنی دوست کو یقین دلا رہا تھا اور سارہ جیسے ان لفظوں کے سحر میں جکڑی گئی تھی۔ سعد زیر لب مسکراتا اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا وہ جو پیغام سارہ کو دینا چاہ رہا تھا وہ اس تک پہنچ رہا تھا۔ وہ سارہ کو گانے میں مگن بیٹھے چھوڑ کر آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے کھڑکی کے قریب آیا۔ شہر کے بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کی تہ گہری ہو رہی تھی۔ نیچے سڑک پر چلتے لوگ گرم کپڑوں میں ملبوس تھے۔ سرما اپنی تمام خوب صورتیوں کے ساتھ آرہا تھا۔ وہ موسم جو اسے ہمیشہ سے بے حد پسند رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

سردار چچا کے ہاں سے واپسی کے بعد ماہ نور کو سنجیدگی سے اپنی پڑھائی میں مگن ہو جانا تھا اور وہ بظاہر ہو بھی چکی تھی۔ شاید وہ گھر والوں کو اس لیے پہلے سے زیادہ سنجیدہ نظر آتی تھی کہ یہ اس کا فائنل سمسٹر تھا۔ لیکن یہ صرف ماہ نور جانتی تھی کہ سردار چاچا کے پاس قیام کے دوران اس کا ذہن و دل کہیں اٹک گیا تھا۔ ایک عجیب سی الجھن تھی جو جاتی نہیں تھی۔

"کیا مصیبت ہے بھئی! میں بھول کیوں نہیں جاتی؟" کئی بار کتابیں سامنے رکھے ان کے صفحات پر نظر ڈالتے ہوئے اس کا ذہن جب سوچ میں بھٹکنے لگتا تو وہ تنگ آکر سوچتی۔

"اب ایسا بھی کیا کہ بندروں کے تماشے دکھانے والے اور میلوں ٹھیلوں میں اکتارے بجاتے گیت سناتے لوگ یوں ذہن سے چپک جائیں کہ انسان ہر کام سے ہی جائے۔" اس نے کئی بار خود کو جھڑکا تھا۔ مگر عجیب بات تھی کہ جب وہ سنجیدگی سے پڑھنے بیٹھتی گاؤں میں بندر کا تماشا دکھاتا اور میلے میں کافی سناتا سائیں' دونوں ہی اس کے پردہ ذہن پر ابھر آتے اور وہ لاشعوری طور پر سوچنے لگتی کہ ایک کی دوسرے سے کیا مشابہت تھی۔

"دونوں کا ہنر مختلف' حلیے مختلف' مقام مختلف' پھر میں کیوں مماثلت تلاش کرنے میں الجھی ہوئی ہوں۔" پھر وہ خود کو ڈانٹ دیتی۔

"صوفی ازم' آج کل فیشن میں ہے ماہی! اور تم اس فیشن کی تقلید کرنے لگی ہو۔" اس کا بھائی اسے مذاق سے کہتا۔

"وہ کیسے؟" وہ چونک کر کہتی۔

"تمہارے کمرے سے آج کل Enrique یا Akon وغیرہ وغیرہ کے بجائے سائیں ظہور اور عارف لوہار کی آوازیں سنائی دیتی ہیں مس ٹرینڈ فالوور!" وہ کہتا تو ماہ نور کو خواہ مخواہ لگتا جیسے اس کے دل کا چور پکڑا گیا ہو۔ وہ اس بات پر بھائی سے بحث نہیں کرتی۔ اسے لگتا وہ اس کا مذاق بنا کر رکھ دے گا اور اسے جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔

☼ ☼ ☼

"شہر کی آبادی ہماری آنکھوں کے آگے بڑھی اور بڑھتے بڑھتے آبادی کا ازدحام ہر طرف پھیل گیا۔" خدیجہ چولہے پر رکھے برتن میں ابلتے پانی میں ادھر ادھر پھدکتی چائے کی پتی کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔

"دیکھتے ہی دیکھتے بے شمار ٹاؤنز بنے اور یہاں وہاں تاحد نگاہ گھر ہی گھر' عمارتیں ہی عمارتیں نظر آنے لگیں۔" وہ کپ پر رکھی چھلنی میں چائے انڈیلتے ہوئے سوچتی رہیں کہ پہلے کون سا ٹاؤن بنا اور بعد میں کون سا معرض وجود میں آیا۔ اسی دم انہیں کچن سے ملحق چھوٹے برآمدے کی گرل کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

"ارے! یہ کون داخل ہوا؟" وہ لرز گئیں۔ گلے میں بڑی زنجیر سے جڑا چشمہ آنکھوں سے لگا کر وہ کچن کی کھڑکی سے باہر جھانک ہی رہی تھیں، جب انہیں اپنے کان کے پیچھے "ہاؤ" کی آواز آئی۔ وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔

"اوہو! یہ تم ہو۔" پھر انہوں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

"میرے علاوہ یوں دبے پاؤں صرف بلی ہی آسکتی ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔

"جاؤ! ہم تم سے نہیں بات کر رہے۔" خدیجہ نے مصنوعی غصہ دکھاتے ہوئے کہا۔

"ارے! کیوں؟" وہ اپنی بڑی بڑی کالی آنکھیں مزید کھولتے ہوئے بولی۔

"ارے بابا! ان کو تو مت پھیلاؤ۔ خوامخواہ ڈر لگنے لگتا ہے۔" خدیجہ ہنسیں۔

"اچھا! یہ تو بتایئے ناراض کیوں ہیں؟" وہ بے تکلفی سے کچن اسٹول پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"کہاں غائب تھیں اتنے دنوں سے؟" خدیجہ نے پین میں ایک کپ چائے کے لیے پانی ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"میں سردار چاچا کے پاس گئی ہوئی تھی۔ بتایا تو تھا آپ کو جانے سے پہلے۔" اٹھ کر فریج کھولتے ہوئے ماہ نور نے کہا۔

"ارے ہاں!" خدیجہ کو یاد آیا۔ "وہ تمہاری اماں بتا رہی تھیں کہ وہاں اپنے چچا کے فارم پر تم کوئی فوک ایونٹس پر ریسرچ کر رہی ہو؟"

"فوک ایونٹس۔" فریج سے پیسٹریز کی پلیٹ نکال کر شلف پر رکھتے ہوئے ماہ نور نے زیر لب دہرایا۔

"ریسرچ" اس نے سوچا اور بے اختیار ہنس دی۔ "ماما کو بھی باتوں میں اٹریکشن پیدا کرنے کے کیا کیا ڈھنگ آتے ہیں۔" اس نے سوچا۔

"بس اسی ریسرچ میں لگی رہی اتنے دن۔" اس نے چاکلیٹ فج پیسٹری نکال کر ایک علیحدہ پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "ویسے اب تو واپس آئے کافی دن ہو گئے مجھے۔"

"اچھا! مجھے خبر نہیں ہوئی۔" خدیجہ نے چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ فاطمہ خالہ کہاں ہیں؟" ماہ نور نے ادھر ادھر دیکھا۔ "وہ چائے نہیں پئیں گی۔"

"نہیں! تم جانتی تو ہو اسے یہ مکس چائے پسند نہیں۔" خدیجہ ماہ نور کے سامنے ہی کچن ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ "وہ کہتی ہے۔ تم لوگ چائے کا سانس گھونٹ دیتے ہو اسے ابال کر۔"

"فاطمہ خالہ! بہت سوفسٹی کیٹڈ ہیں، بہت ارسٹوکریٹک۔" ماہ نور نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"ہاں!" خدیجہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "فاطمہ نے وقت کے ساتھ خود کو بدلنے سے مکمل انکار کر دیا۔

اچھا! تم بتاؤ، کیسی رہی تمہاری ریسرچ۔" خدیجہ نے بات بدلی۔

"ہوں!" ماہ نور نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اچھی رہی۔ ویسے سچ تو یہ ہے کہ ریسرچ وغیرہ میں نے کیا کرنی تھی بس مجھے لوک تماشے اور لوک میلے دیکھنے کا شوق تھا۔"

"ارے! اس کے لیے کسی گاؤں جانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو اب ہر بڑے شہر میں بھی تھوک کے حساب سے لگتے ہیں۔" خدیجہ نے برتن سنک میں رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں خدیجہ خالہ! یہاں شہروں میں وہ ماحول پیدا نہیں ہوتا جو گاؤں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔"

"مثلاً؟" خدیجہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"گاؤں کے بچوں کی ایکسائٹمنٹ کا تو کوئی جواب نہیں۔" ماہ نور یاد کر کے مسکرائی۔

"ان کا اشتیاق، اتنی خوشی ہوتی ہے ان کے چہروں پر کہ بیان نہیں کی جا سکتی اور وہاں کے مرد و خواتین...... وہ بھی اسی تجسس اور شوق سے یہ تماشے دیکھتے ہیں جیسے انہوں نے پہلی بار دیکھا ہو گا۔"

"اچھا تو یہ بڑھتے ہوئے کمیونیکیشن مینز اور سب ہتھیاروں سے لیس میڈیا نے ان لوگوں کے اوپر کچھ اثر نہیں کیا؟" خدیجہ خالہ مسکرائیں۔

"پتا نہیں!" ماہ نور نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "ویسے مجھے نہیں محسوس ہوا۔"

"ایک بات بتائیں خالہ!" پھر کچھ سوچنے کے بعد اس نے خدیجہ کو مخاطب کیا۔

"ہاں پوچھو۔" خدیجہ نے کچن کا دروازہ کھول کر لاؤنج میں جھانکتے ہوئے کہا۔ فاطمہ لاؤنج میں نہیں تھیں۔

"ایک بندہ ایک وقت میں کتنے فنون کا ماہر ہو سکتا ہے؟" ماہ نور کو خود بھی پتا نہیں تھا کہ وہ یہ سوال کیوں کر رہی تھی۔

"پتا نہیں!" خدیجہ نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد کہا۔ "مگر میں نے سنا ہے کہ جو زیادہ فنون کے جیکس ہوتے ہیں وہ کسی بھی فن کے ماسٹر نہیں ہوتے۔"

ماہ نور نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ "واہ خدیجہ خالہ! آپ سے ہی اس وٹ (مزاح) کی توقع کی جا سکتی تھی۔"

"کیوں؟ تم نے کیوں پوچھا؟" خدیجہ نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے سوال کیا۔

"بس یوں ہی۔" ماہ نور نے اس سوال کا جواب ٹال دیا۔

"اچھا! اب میں چلوں۔" پھر وہ اچانک جانے کو تیار ہو گئی۔

"ارے! فاطمہ سے نہیں ملو گی؟" خدیجہ نے اسے روکنا چاہا۔

"وہ آرام کر رہی ہیں میں پھر کسی وقت آجاؤں گی۔" وہ تیزی سے کچن کے پچھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔

"کیسی اچھی زندگی سے بھرپور اور محبت کرنے والی لڑکی ہے۔" خدیجہ نے کھڑکی کے پار اسے شاگرد پیشہ کے کوارٹرز کے قریب سے گزر کے پچھواڑے کے گیٹ کے قریب جاتے دیکھ کر سوچا۔ "آج کل کی بچیاں کہاں اپنی عمر سے بڑے لوگوں کے ساتھ وقت گزارتی ہیں اور یہ کہتی ہے کہ اس کا دل جتنا ہم دونوں کے ساتھ لگتا ہے اتنا کسی کے ساتھ نہیں لگتا۔"

"یہ کتنے مزے کا گھر ہے۔" دوسری طرف ماہ نور برآمدہ عبور کر کے شاگرد پیشہ کے کوارٹرز کے قریب سے گزرتی ہوئی سوچ رہی تھی۔ "اب کہاں ایسے طرز تعمیر پر بنے گھر دیکھنے کو ملتے ہیں۔"

اس نے سبزی کی کیاریوں کو دلچسپی سے دیکھا۔ مٹر، پالک، گاجر اور مولی کے ننھے ننھے پتے زمین سے سر اٹھا رہے تھے اور سرونٹ کوارٹرز کو "شاگرد پیشہ کے کوارٹرز" کہنے والے لوگ بھی اب تو کہیں کہیں ہوں گے۔

اس نے سر اٹھا کر سامنے بنے کوارٹرز کو دیکھا۔ "اسی لیے تو مجھے یہاں آنے میں مزا آتا ہے۔"

ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان کر لینے کے بعد کہ کوئی اسے دیکھ نہیں رہا، اس نے امرود کے پیڑ پر لگے امرودوں میں سے ایک کچا پکا بڑا سا امرود توڑا اور اپنی قمیص کے دامن سے رگڑ کر صاف کرنے کے بعد مزے سے اسے کھاتے ہوئے پچھلے گیٹ سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

"اُفوہ! ایک تو یہ وقت۔" نادیہ نے تیزی سے موزے پاؤں پر چڑھاتے ہوئے بھنا کر سوچا۔ اسے روزانہ صبح نکلتے ہوئے دیر ہو جاتی تھی اور تیاری کے دوران اس کی نظریں گھڑی پر ہی رہتی تھیں۔ موزے پہننے کے بعد اس نے اپنے لانگ شوز کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

"ابھی کل شام ہی تو آکر اتارے تھے۔" اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ جوتے کہاں اتارے تھے۔

"ایک تو سردی کی شدت دماغ اور یادداشت کو بالکل ہی منجمد کیے دیتی ہے۔"

پھر اسے بیڈ کے نیچے گھسے جوتے نظر آئے۔ اس نے جوتے نکال کر انہیں سیدھا کیا اور جلدی جلدی پہننے لگی۔ اپنا بیگ، فون اور کمرے کے دروازے کی چابیاں اٹھاتے اٹھاتے میز پر رکھے ٹیبل فریم میں جڑی ایک تصویر دیکھ کر وہ پل بھر کو مسکرا دی۔

"تم نے تو مجھے بالکل ہی بھلا دیا۔" اس نے تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ "چلو آج تو ویک اینڈ نائٹ ہے۔ آج تمہیں ایک لمبی سی میل بھیجتی ہوں اور پھر دیکھتی ہوں کہ تم جواب دیتے ہو یا نہیں۔"

اس نے تصویر کی طرف پیار بھری مسکراہٹ اچھالی اور تیزی سے چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆ ☆

ہاتھ میں تھامی چھوٹی سی گڑگڑی کا کش لگانے کے بعد اختر نے کہا۔

"گل صرف اتنی سی ہے باؤ صیب! کہ صرف فقیر ہی جانتا ہے۔ فقیر کا دیس کون سا ہے۔ فقیر کا بھیس کیا ہے' اس کا پتا کسی کو نہیں چلتا۔ وہ کبھی بھی کدھر بھی موجود ہو سکتا ہے۔"

"اچھا! تو پھر اس کا مطلب ہے کہ جوگی کا' فقیر کا کوئی دیس نہیں ہوتا۔ اس کی ذات اور صفات کیا ہوتی ہیں جن سے کوئی کوتاہ نظر اندازہ ہی لگانے کی کوشش کرے کہ وہ کون ہے۔" اختر کے مخاطب نے سوال کیا۔

"دیا باؤ جی! اٹھنشن ہو گیا ہی سمجھاتے' فقیر کی کوئی ذات نہیں ہوتی' کوئی ایسی صفات نہیں ہوتیں کہ پہچانا جائے۔ مولے کو دیکھا ہے کبھی؟" اختر نے اپنی سرخ سرخ نظریں اپنے مخاطب کے چہرے پر گاڑتے ہوئے سوال کیا۔

"لڑادے مولے کو شہباز سے" والا!" اس کے مخاطب نے اپنے ساتھی کو کہنی مار کر اپنے جواب کی تائید چاہی۔

"کونجیں کس طرح سفر کرتی ہیں' دیکھا ہے کبھی؟" اختر نے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر پوچھا۔ اس کے مخاطب نے اپنی لاعلمی پر شرمندہ ہوتے ہوئے سر کھجایا۔

"کائنات کے نظام میں باؤ جی!" اس کی لاعلمی پر اختر نے مسکرا کر کہا۔ "ان گنت مخلوق موجود ہے' جو اپنے اپنے طریقے سے زندگی گزارتی ہے۔ انسان' حیوان سے مختلف' حیوانوں کے اپنے اپنے درجے' کچھ درندے' کچھ بے ضرر' کچھ دوپائے' کچھ چارپائے' کچھ جنگلوں کے باسی' کچھ شہروں کے پالے ہوئے' پرند آسمان پر اڑتے' پانی کی مخلوق پانی اندر تیرتی' کبھی پانی کے نیچے سانس لیتے پیڑوں کی' درختوں کی' جھاڑیوں اور بیلوں کے الگ الگ ضابطہ حیات۔" اختر دم لینے کو رکا۔

"جس کی باریکیوں پر نظر ہوئی۔" دم لینے کے بعد اس نے ایک بار پھر گڑگڑی کا کش لگاتے ہوئے کہا۔ "وہ کائنات کا راز پا گیا اور جو کائنات کے راز پا گیا' وہ آپ سے آپ فقیری لائن میں چلا گیا۔" اختر نے جھونپڑی کے باہر جلتے الاؤ کے دھویں سے آنکھوں میں اترتے پانی کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"اور...." پھر اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ "یاد رکھنا! کائنات کے راز سمجھ جانے والا دیسوں' بھیسوں' ذاتوں' صفاتوں کی حد سے بالا ہو جاتا ہے۔"

"Thank you for your interpretatoin sir!"

اختر کے مخاطب نے جواب تک پنجوں کے بل فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا' اٹھتے ہوئے کہا۔

"فقیر کو القاب یا خطاب سے بھی کوئی سروکار نہیں ہوتا۔" اختر نے تیزی سے جواب دیا۔ "ماسٹر' سر' سردار' آقا' بادشاہ سلامت' ہز ہائی نس' میڈم' میم' مس' محترمہ' ہر ہائی نس' یہ بڑے لوگوں کی تسلیاں ہوتی ہیں۔ فقیر اس حد سے بھی آگے جا چکا ہوتا ہے۔"

"اوہ! آئی ایم سوری۔" اختر کا مخاطب اختر کے جھڑک کر بولنے پر خجالت سے بولا۔

"لیکن یاد رکھو' فقیر کہیں بھی کدھر بھی موجود ہو سکتا ہے' سرکی کے جھونپڑے میں یا مٹی کی کٹیا میں ہی نہیں'

بڑے بڑے دفتروں میں سوٹ بوٹ پہن کر رنگ برنگی ٹائیاں لگا کر فائلوں میں سر کھپانے بھی ایسے ہو سکتے ہیں۔ یہ صرف مولا ہی جانتا ہے کہ اس نے کس کو کون سے کام لگا کر یہ لائن چلانی ہے۔"

"اوکے! تھینک یو۔" اختر کے مخاطب کو جیسے اب ادھر سے نکلنے کی جلدی تھی۔

"اچھا جاؤ' خیر رب راکھا۔" اختر نے ہاتھ ہلا کر کہا اور آنکھیں بند کر کے گڑگڑی سے کش لگانے لگا۔

"کدھر سرکار؟" جھونپڑی سے باہر جلتے الاؤ پر دیگچہ رکھ کر چائے بناتے شخص نے ان دونوں کو میدان کے دوسری طرف کھڑی گاڑی کی طرف بڑھتے دیکھ کر آواز لگائی۔

"کاڑھے دا پیالہ پی کر جائیو سرکار!" اس نے ان دونوں کے رکنے پر دیگچے میں ابلتے ملغوبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھائی! بہت شکریہ' پھر کبھی سہی۔" ان میں سے ایک نے جواب دیا۔

"خالص دودھ تے دوھری پتی' چٹی چینی نہیں' گڑ دا شیرہ' ایس تو ودھیا کاڑھا تہانوں کدھرے نئیں لبھنا باؤ جی!" (خالص دودھ' زیادہ پتی اور سفید چینی کی جگہ گڑ کے شیرے سے بنی اس چائے سے بہتر چائے تمہیں کہاں مل سکتی ہے باؤ جی!) اس شخص نے انہیں لالچ دیا۔

"لو! پیالہ پیالہ پی لو' ساری تھکاوٹ لہہ جائے گا۔" (لو! ایک ایک پیالہ پی لو' ساری تھکن اتر جائے گی۔) پھر اس نے تیزی سے دو بڑے بڑے مٹی کے پیالے اس ملغوبے سے بھرتے ہوئے کہا۔

اس کے دونوں مخاطبین نے بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پیالے اس سے لے لیے۔ ایک ہی گھونٹ میں ان دونوں کے چہرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ انہوں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے پیالے نیچے رکھے اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

"فقیر دے لنگروں کوئی فرق نئیں پیندا بدبختو!" (فقیر کے لنگر کو کوئی فرق نہیں پڑتا بدبختو!) اس شخص نے دونوں کے زمین پر رکھے پیالوں کو واپس دیگچے میں الٹتے ہوئے کہا۔ "فقیر دے لنگروں رجن والی مخلوق دا گھاٹا کائی نا۔" (فقیر کے لنگر سے سیر ہونے والی مخلوق کی کوئی کمی نہیں۔) وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

"وہ بددعائیں دے رہا ہے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"فکر نہ کرو! فقیر کی بددعائیں بھی دعائیں بن کر لگتی ہیں۔" دوسرے نے قہقہہ لگا کر جواب دیا۔ ان کی گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور پل بھر میں پکی سڑک پر چڑھ کر نظر سے اوجھل ہو گئی۔

"بھرے پیالے نوں اونجے ای چھڈ کے جان والے کدے فیض نئیں پاندے۔" (بھرے پیالے کو یوں ہی چھوڑ کر جانے والے کبھی فیض نہیں پا سکتے۔) الاؤ پر بیٹھا شخص ابھی بھی اس سمت دیکھتے ہوئے چیخ رہا تھا جہاں ان کی گاڑی گئی تھی۔

"عقل دے انھے' بدقسمت' بے فیض' نامراد!" وہ نہ جانے کس سے مخاطب تھا۔

☆ ☆ ☆

"اواخر خزاں کی شامیں مجھے ان دنوں کی یاد دلاتی ہیں' جب میں بورڈنگ میں رہتی تھی۔" نادیہ کی انگلیاں کی بورڈ پر متحرک رہی تھیں۔ "سرما کی چھٹیوں کے لیے گھر جانا ہوتا تھا اور صبح سے ہی انتظار ہوتا تھا۔ گھر سے کس وقت کوئی لینے آئے گا۔ اپنا اپنا سامان باندھے سب لڑکیاں طویل راہداریوں میں' باہر کھلے میدان میں رکھے بینچوں پر یا کلاس رومز کے باہر بنے برآمدوں میں انتظار سے بوجھل آنکھیں گیٹ پر جمائے بیٹھی رہتی تھیں۔ صبح' دوپہر میں ڈھلتی اور پھر سورج کی روشنی غروب ہونے لگتی' اس وقت کہیں جا کر شرافت بلو کرولا چلاتا گیٹ سے

اندر داخل ہوتا۔ اس وقت تک انتظار کرتے کرتے چھٹیوں کی ساری خوشی ہوا ہو رہی ہوتی تھی۔ پیچھے رہ جانے والی اکا دکا لڑکیوں اور سسٹرز کو خدا حافظ کہہ کر بیگ گھسیٹتی جب میں گاڑی کی طرف جا رہی ہوتی تھی تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہوتا تھا جیسے میں گھر جا نہیں رہی' وہاں سے واپس آ رہی ہوں۔"

وہ لمحہ بھر کو کچھ یاد کر کے مسکرائی اور پھر دوبارہ ٹائپنگ میں مصروف ہو گئی۔

"مگر پھر جب اپنے شہر کے مضافاتی منظر نظر آنے لگتے اور شرافت مجھے بتاتا کہ اب تک تم بھی گھر پہنچ چکے ہو گے تو ساری خوشی' سارا جوش واپس آ جاتا اور میں آنے والے دنوں میں کیے جانے والے مزوں کے تصور میں کھو جاتی ـــــ چاکلیٹ اور خستہ مونگ پھلیوں' رس بھرے میٹھے سنگتروں اور آپا کے ہاتھ کے کھانوں کا ذائقہ زبان پر محسوس ہونے لگتا۔ تمہارے ساتھ درختوں پر چڑھنے' سائیکلنگ کرنے' درختوں میں چھپتی نکلتی گلہریوں کا خاموش بیٹھ کر نظارہ کرنے اور پھر انہیں قابو کرنے کا ایڈونچر یاد آنے لگتا۔

اوہ! کتنے یادگار' کتنے حسین تھے وہ دن جب "کس کا رویہ کیسا ہے" جیسا احساس ذہن میں کبھی نہیں ابھرتا تھا۔ "ہم کون ہیں اور کیا ہیں" جیسے سوال دل میں کبھی نہیں اٹھتے تھے۔ سگے' سوتیلے کی تفریق کا علم نہیں تھا۔ زندگی صرف ایک مزا تھی اور دنیا ایک ونڈر لینڈ ـــــ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ بچپن سے لڑکپن میں داخل ہونا جنت سے بے دخل کر کے حضرت آدم کی طرح زمین پر آبسنے کا سا تجربہ تھا۔ کاش! زندگی بچپن ہی میں رہتی یا کاش! لڑکپن اور پھر تو جوانی آنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی۔"

نادیہ کی انگلیاں یہ جملے ٹائپ کرنے کے بعد رک گئیں۔

"اوہ!" پھر اس نے لکھنا شروع کیا۔ "میں بھی کیا افسردہ کر دینے والی یادوں کا ذکر لے بیٹھی۔ تم بتاؤ! پاکستان میں موسم کیسا ہے۔ یہاں تو بھئی منجمد کر دینے والی ٹھنڈ ہے۔ تم آج کل کیا کر رہے ہو؟ یقیناً "مزے میں ہو گے۔ بابا سے تعلقات کیسے چل رہے ہیں؟ تم نے اپنی اوٹ پٹانگ حرکتیں بند کی یا نہیں؟ یار اب بڑے ہو جاؤ۔ بہت ہو گئیں اوٹ پٹانگ حرکتیں۔ اب سنجیدگی سے زندگی گزارنا شروع کر دو۔ میری مانو! کوئی اچھی سی لڑکی ڈھونڈ کر اس سے شادی کر لو۔ زندگی میں ٹھہراؤ بھی آ جائے گا اور نظم و ضبط بھی ـــــ مجھے پتا ہے یہ بات پڑھ کر تم ہنسو گے مگر یقین جانو! یہ ایک مخلصانہ مشورہ ہے اور اچھی زندگی گزارنے کے لیے ایک نادر نسخہ بھی۔" وہ لکھتے لکھتے مسکرائی اور پھر دوبارہ لکھنے لگی۔

"دیکھو! اب میں تم کو اتنی طویل اور تفصیلی میل بھجوا رہی ہوں' تم پر لازم ہے کہ اس کا جواب بھی اتنا ہی طویل اور تفصیل سے بھیجو۔ کسی دن فون کر کے یہ تو بتاتا کہ کیا کسی ایک وقت پر ہم ویک اینڈ پر ہی سہی' اکٹھے آن لائن ہو کر بات کر سکتے ہیں؟ مجھے پتا ہے کہ تمہارے پاس اس کا وقت شاید ہی نکلے' پھر بھی ہو سکے تو ضرور بتانا۔ تم اتنے بے ایمان اور کنجوس ہو کہ کبھی ایک کال کرنے کی زحمت تک نہیں کرتے۔ تم اتنے امیر کبیر شخص ہو اور میں ٹھہری ایک غریب طالبہ جو وظیفے پر تعلیم حاصل کر رہی ہے اور اس غریب الوطنی میں مشکل سے گزارہ کر رہی ہے' ورنہ میں تمہیں اکثر و بیشتر کال کر لیا کرتی۔" وہ مسکرائی۔

"چلو! دیکھتے ہیں تم کب اس میل کو پڑھتے ہو' کب جواب دیتے ہو' چھ ماہ تو لگ ہی جائیں گے۔" نادیہ ایک بار پھر مسکرائی۔

"اپنا بہت خیال رکھنا ـــــ ایک بات کہنی تو بھول ہی گئی' ایک بہت ضروری بات ـــــ اور وہ یہ کہ میرے پیارے بھائی! مجھے تم سے شدید محبت ہے۔"

تمہاری بہن نادیہ ـــــ

لکھنے کے بعد نادیہ نے صفحے کو اوپر نیچے کرتے ہوئے ایک دفعہ پھر پڑھا اور send کا بٹن دبا دیا۔

☼ ☼ ☼

ماہ نور نے آسمان پر اڑتے پرندوں کو کاہلی سے دیکھا۔ کئی دن کے بعد سورج نے اپنی شکل دکھائی تھی اور اپنی حرارت سے ٹھٹھرے جسموں کو گرمائش پہنچائی تھی۔ ماہ نور بھی کینٹین سے چائے کا کپ اور کلب سینڈوچ لے کر گراؤنڈ میں بیٹھ گئی تھی' جہاں اس کے گروپ کی باقی لڑکیاں پہلے سے بیٹھی تھیں۔ اس نے بے فکری سے بیٹھی گپیں لگاتی لڑکیوں کو دیکھا جو ادھر ادھر ٹولیوں کی شکل میں بیٹھی تھیں۔ ان میں سے اکثر اپنی کلاسز بنک کر کے دھوپ کا لطف اٹھانے آئی تھیں اور کچھ کا وہ پیریڈ فری تھا۔

"زندگی کتنی حسین ہے۔" اس نے چائے کا آخری گھونٹ بھرنے کے بعد کاغذی گلاس کو زمین پر رکھتے ہوئے جیسے فیصلہ صادر کیا۔

"یہ تم اس وقت اس لیے کہہ رہی ہو بیٹا کہ تمہاری پریزنٹیشن اچھی رہی اور تمہارا یہ پیریڈ فری ہے۔ دھوپ کئی دن بعد نکلی ہے اور تم کو اس سنہری دھوپ سے لطف اندوز ہونے کا پورا موقع مل رہا ہے۔" شاہ بانو جو اس کی سب سے قریبی دوست تھی' نے نوٹس بناتے بناتے ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

"کیا کسی اور وقت میں میں یہ بات نہیں کہوں گی؟" اس نے حیرت سے شاہ بانو سے پوچھا۔

"ہمارے سارے تجربے ہمارے موڈز کے تابع ہوتے ہیں۔" شاہ بانو نے کاغذ اور قلم گھاس پر رکھ دیے۔

"ہو سکتا ہے۔" ماہ نور نے شانے اچکائے۔ "مگر آج تو مجھے سب کچھ اچھا لگ رہا ہے۔"

"آج میں کیا خاص بات ہے؟" شاہ بانو مسکرائی۔

"شاید میرا موڈ اچھا ہے آج۔" ماہ نور نے چمکتے سورج کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے رنگ برنگ دائرے چمکنے لگے۔

"سورج کی روشنی میں چیزیں کیسے ریفلیکٹ کرتی ہیں۔" اس نے سوچا۔

"تم فوک میوزک کی جو سی ڈیز اکٹھی کر رہی تھیں' ان کی تعداد کہاں تک پہنچی؟" شاہ بانو نے اس کا پسندیدہ سوال کیا۔

"ان گنت۔" ماہ نور ہنسی۔ "میرے کمرے میں کبھی آ کر دیکھو! تمہیں فوک سونگز کی سی ڈیز ہر طرف بکھری ہوئی ملیں گی اور میری USB بھی گھر لے جا کر چیک کرو' تمہیں اندازہ ہو جائے گا کیا خزانہ بھرا ہے اس میں۔"

"نہیں بھئی۔" شاہ بانو نے کہا۔ "مجھے اس فارم آف میوزک میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں۔" جواب میں ماہ نور نے برا سا منہ بنایا اور ادھر ادھر پھرتی لڑکیوں کو دیکھنے لگی۔

"لیکن ایک اچھی آفر ہے میرے پاس۔" کچھ دیر بعد شاہ بانو نے خاموشی توڑی۔

"وہ کیا؟" ماہ نور نے اپنی توجہ شاہ بانو کی طرف مبذول کی۔

"سید پور گاؤں میں فوک میلہ ہو رہا ہے اور عبید بھائی اس کے آرگنائزر میں سے ایک ہیں۔ جانا چاہو تو انویٹیشن کارڈز منگوا دوں؟" شاہ بانو نے اپنے تئیں بہت اہم خبر اس کو دی۔

"فوک میلہ۔" ماہ نور نے زیر لب کہا اور پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ "یا بے منگوا میلہ۔" اسے اچانک کھاری اور اس کے بتائے میلے کے مناظر یاد آنے لگے۔

"تمہیں پتا ہے شاہ بانو! کچھ لوک فنکار ایسے بھی ہیں جنہیں کبھی کوئی بڑا چانس نہیں ملتا۔" ماہ نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ "ایسا چانس جس سے ان کا ٹیلنٹ ابھر کر سامنے آئے' ان کو شناخت ملے' ان کا فن سراہا جا سکے۔ وہ ساری زندگی یوں ہی میلوں ٹھیلوں میں گا بجا کر گزار دیتے ہیں' اپنا فن چند سکوں کے عوض بیچتے پھرتے ہیں۔ اور وہ

میلے ٹھیلے یوں بڑے لوگوں کے آرگنائز کیے ہوئے نہیں ہوتے۔" یوں ہی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں کبھی کسی پیر فقیر کے عرس پر، کبھی گندم کی کٹائی کے موقع پر اور کبھی بہار کی آمد پر ہونے والے چھوٹے چھوٹے گمنام بیانوں کے میلے ٹھیلے ہوتے ہیں وہ۔"

"مجھے کچھ زیادہ تو نہیں پتا۔" شاہ بانو نے اپنی بکھری کتابیں سمیٹتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ جو لوک فنکار ٹی وی اسکرین پر متعارف کرائے جاتے ہیں ان کے بارے میں اکثر یہی دعوا کیا جاتا ہے کہ وہ اسی طرح کے میلوں ٹھیلوں پر "ہنٹ" کیے گئے ہیں۔"

"ہاں! یہ بھی ہے۔" ماہ نور کو ایک خیال نے چونکایا۔ کیا خبر وہ الا سائیں بھی اچانک کسی دن ٹی وی اسکرین پر نمودار ہو جائے۔

"چلو بھئی! مسز ادریس کا پیریڈ شروع ہونے کو ہے۔ ایک منٹ کی بھی تاخیر ہو گئی تو کلاس میں داخل نہیں ہونے دیں گی۔" شاہ بانو نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ماہ نور نے بھی کھڑے ہو کر کپڑوں سے چپک جانے والی گھاس کے تنکے جھاڑے اور سینڈوچ کا ریپر اور ڈسپوزایبل گلاس سنبل کے درخت کے نیچے رکھے بڑے ڈسٹ بن میں ڈالنے کے بعد وہ شاہ بانو کی طرف مڑی۔

"سید پور کے میلے کے کارڈز کب منگواؤ گی پھر؟" اس نے شاہ بانو سے پوچھا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس دن صبح اس کی آنکھ تقریباً" آٹھ بجے ہی کھل گئی۔ مگر طبیعت میں کسل مندی اتنی تھی کہ وہ آنکھیں موندے دیر تک بستر میں ہی لیٹا رہا۔ دس بجے زمان نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"صاحب ناشتے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" زمان نے اسے اطلاع دی تھی۔

"ایسی اطلاع اسے کافی عرصہ بعد ملتی تھی۔ سال میں دس، بارہ صبحیں ہی ایسی ہوتی تھیں جب وہ اور ڈیڈی اکٹھے ناشتا کرتے تھے۔

"باپ رے۔" وہ یہ پیغام سنتے ہی سیکنڈوں میں بستر سے اٹھا تھا۔ جب تک وہ نہا کر اور کپڑے بدل کر نیچے پہنچا، ڈیڈی کا انتظار جاری تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ انتظار کی کوفت برداشت نہ کر سکنے کے باعث ناشتا کر کے آفس جا چکے ہوں گے۔ سعد کو نیچے آتا دیکھ کر انہوں نے فضل سے ناشتا لانے کا کہا تھا۔

"خیریت؟" سعد نے کچھ دیر ان کے کوئی بات کرنے کا انتظار کرنے کے بعد پوچھا۔

"کیوں؟" انہوں نے کانٹا ٹوسٹ کے ٹکڑے میں کھبوتے ہوئے پوچھا۔

"توپوں کے دہانے خاموش ہیں اس لیے۔" سعد نے نیچی آواز میں کہا اور سر جھکا کر چائے کا سپ لینے لگا۔

"تمہاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔" انہوں نے اس کی بات نظرانداز کی۔ "کیا رات بھر جاگتے رہے ہو؟"

"تقریباً"۔" سعد نے اپنے سامنے کی دیوار پر سجی پینٹنگ پر نظریں جمائیں۔ کسی مغل بادشاہ کے مطبخ کی منظر کشی کی گئی تھی۔

"استغفار۔ ایک وقت کے کھانے کے لیے اتنا اہتمام۔" وہ دل میں سوچ رہا تھا۔

"کسی نئے کام پر ہاتھ ڈالنے کا سوچتے رہے ہو رات بھر کیا؟" انہوں نے یقیناً "ہوا میں تیر چلانے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں! ایک دلربا حسینہ کے تصور میں کھویا ہوا تھا۔" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"اوہ!" وہ بے اختیار بولے۔ "پھر تو ٹھیک ہے۔" سعد ان کی حرکات و سکنات پر غور کر رہا تھا۔ انہوں نے اس کی آخری بات سننے کے بعد میز پر رکھا اخبار اٹھا کر نظروں کے سامنے کر لیا تھا۔ سعد کو لگا اب اسے ناشتا کرنے میں مزا آ رہا تھا۔

"اس روز تم اکارڈ کہاں لے کر گئے تھے؟" سعد کو معلوم تھا اب وہ کوئی ایسی بات ہی نکالیں گے جس پر اس کی باز پرس کر سکیں۔

"اس گردا اور کیچڑ نے خود ہی بتا دیا ہوگا۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

"چیزوں کو استعمال کرنے کا بھی کوئی میرٹ ہوتا ہے صاحبزادے!" وہ سنجیدہ سا چہرہ بنا کر بولے۔

"یہاں میرٹ کو کوئی سمجھتا کیا ہے۔" سعد ہنس کر بولا۔ "یہ آپ ہی کے الفاظ ہیں ویسے۔"

"تم بھول رہے ہو میں تمہارا ابھی باپ ہوں۔" انہوں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"میں جینیٹکس پر ہی ریسرچ کر رہا ہوں آج کل۔" اس نے فوراً" جواب دیا۔

"آج کے زمانے میں زندہ ہوتا ناں ڈارون تو اپنی ہی تھیوری کو ریجیکٹ کر دیتا۔"

"ہاں! وہ ایک نئی تھیوری پر سب کے ووٹ لینے کی کوشش کرتا۔ تغیر زمانہ کے ساتھ انسانی نسلوں میں عوارض دماغی بڑھتے جاتے ہیں۔ عقل نیچے آتے آتے گھٹنوں میں پھنس کر رہ جاتی ہے اور اگر انسان اس کو زیادہ استعمال کرے تو ٹخنوں تک بھی چلی جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ کا نظریہ پیش کرتا۔" سعد نے کہا تو وہ ایک بار پھر سر جھٹک کر اخبار بینی میں معروف ہو گئے۔ سعد نے اطمینان سے ناشتا ختم کیا اور ادب سے پوچھا۔

"مجھے اجازت ہے اب۔"

"آج شام کو تم پشاور جا رہے ہو۔ جلیل وہیں ہوگا۔ البرٹ سے ملنا ہے تمہیں۔" انہوں نے اسے ناشتے پر مدعو کرنے کا عقدہ حل کرتے ہوئے کہا۔ "سات بجے کی فلائٹ ہے غالباً"۔ چیک کر لینا۔"

"جلدی بتا رہے ہیں۔ چھ، ساڑھے چھ بجے کا انتظار کر لیتے تو بہتر نہ ہوتا؟" سعد ان کی اطلاع پر بھنا کر سوچ رہا تھا کہ وہ اس کے سارے وار ایک ہی جملے میں چکا گئے تھے۔

"غلطی ہو گئی۔" وہ مزے سے کہہ کر اخبار کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"ویسے۔" سعد نے اٹھ کر اپنی کرسی آگے کھسکاتے ہوئے کہا۔ "جس حسینہ دلبر کا ذکر آپ کو دل ہی دل میں کھٹک رہا ہے اور جس کی وجہ سے میں رات بھر جاگتا رہا، آپ کے اطمینان کے لیے عرض ہے کہ اس کا نام نادیہ بلال ہے۔" ڈیڈی کے چہرے کے تاثرات سیکنڈز میں بدلتے دیکھ کر سعد کو یہ سوچ کر کچھ دیر پہلے کی کوفت بھولنے لگی کہ اس نے اپنے پوائنٹس مہارت سے اسکور کر لیے تھے۔

(باقی آئندہ شمارے میں ان شاءاللہ)

عائشہ فیاض

ساس جیسی

"دیکھا نا! بالکل اپنی ساس جیسی ہے' میں نے کہا تھا ناں۔"

ثمینہ کے پیچھے کھڑی عورت نے اپنے ساتھ والی سے بڑا جتاتا ہوا لہجہ بنا کر کہا اور یہ سنتے ہی گندم سے بھری بالٹی' ٹھڑاپ کر کے اس کے ہاتھوں سے گر گئی تھی۔

"ساس جیسی۔" یہ دو لفظ کسی نیزے کی انی بن کر اس کے کانوں میں کھب گئے تھے۔

پیچھے کھڑی عورت نے تیزی سے آگے بڑھ کر دانوں کا بورا اٹھایا' جس میں ثمینہ کے ہاتھ سے گرنے والی بالٹی بھی اوندھے منہ پڑی تھی۔ اس میں موجود گندم کو بھی اس عورت نے بڑے آرام سے اپنے حصے میں شامل کیا اور پھر ثمینہ کو اونچی آواز میں بہت سی دعائیں دیتے ہوئے چل پڑی تھی۔ اور گندم کے دانوں کی کوٹھی کے ساتھ ہونق کھڑی ثمینہ یوں ہو گئی تھی جیسے کبھی سانس ہی نہ لیتی تھی۔

"ساس جیسی۔ اپنی ساس جیسی۔" اسے لگا کوٹھی میں پڑے پچاس من گندم کا ہر دانہ چیخ چیخ کر بس یہی ایک بات کہہ رہا ہے۔ اس نے گھبرا کر کوٹھی کے کواڑ زور سے بند کر دیے مگر کچھ ہی دیر بعد یہ آواز جیسے اس گھر کی دیواروں سے بھی آنے لگی تھی۔ ثمینہ نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پہ رکھ لیے اور پھر جانے کیا ہوا۔ وہ زمین پہ سر رکھ کر چیخ چیخ کر رونے لگی۔

حالانکہ آج کا دن جب شروع ہوا تو ثمینہ بے حد بے حساب خوش تھی۔ آزادی اور فراغت کا ایک عجیب سا نشہ اسے رگ و پے میں سماتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ نماز اور تلاوت تو اس کا معمول ہی تھا۔ پھر ناشتے کے بعد انور کو کھیتوں پر اور بچوں کو اسکول بھیجا اور ہمیشہ کی طرح جلدی جلدی سارے گھر کی صفائی ستھرائی کر کے آئینے کی طرح چمکا ڈالا تھا اور پھر خود بھی وہ دل و جان سے تیار ہو کر بڑی شان سے ماں جی والے بڑے نواڑی پلنگ پر دو دو گاؤ تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔

آج وہ پوری طرح سے آزاد تھی۔ ہر طرح کی روک ٹوک' جواب دہی اور پوچھ گچھ سے آزاد۔ گاؤ تکیوں کے غلاف جاپانی ریشم کے تھے' روئی جیسے نرم و ملائم۔ وہ بار بار ان پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

اسے آج اپنی زندگی بھی ایسی ہی نرم و ملائم اور ہلکی پھلکی لگ رہی تھی۔ ظاہر ہے لگنی ہی تھی۔ اس کی ساس کا انتقال جو ہو گیا تھا۔ ابھی پرسوں شام ہی تو چہلم تھا ان کا۔ خدا خدا کر کے رات گئے تک سارے مہمان رخصت ہوئے تھے۔ کل کا سارا دن تو بکھرے' الجھے گھر کو سنوارنے میں لگ گیا تھا اور آج کا دن.....

آج کا دن تو کسی خواب جیسا تھا۔ تین کنال پر محیط وسیع و عریض گھر' آتی سردیوں کی بہت خوشگوار سی دھوپ میں' اس کے سامنے سرسوں کے پھول جیسا کھلا پڑا تھا۔

"میرا گھر۔ میرا اپنا پیارا گھر' جہاں اب میری مرضی چلے گی' صرف اور صرف میری مرضی۔"

احساس ملکیت کا غرور اس قدر کیف آفریں تھا کہ ثمینہ کو اپنی آنکھیں بند ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور اس سے پہلے کہ وہ ریشم کے تکیے پہ سر رکھے سو ہی جاتی' وہ عورت گندم لینے چلی آئی تھی۔

پہلے تو ثمینہ کے جی میں آئی کہ رہنے دو' نہ ہی دوں تو بہتر ہے۔ مگر پھر کچھ سوچ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس کے بس کچھ ہی دیر بعد یہ عالم تھا کہ تک تک سے تیار ثمینہ' کچی مٹی کے فرش پر مٹی میں ہی اٹی پڑی ہچکیوں کے ساتھ روتی جاتی تھی اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ ہاں مگر اس کے دل کو تو سب خبر تھی۔

ثمینہ جب بیاہ کر اس گھر میں آئی تو بہت جلد ہی ان دونوں میں روایتی ساس بہو کا رشتہ بن گیا تھا۔ اگرچہ یہ رشتہ یک طرفہ تھا۔ یعنی صرف ثمینہ کی طرف سے مگر سچ تو یہی تھا کہ شیشے میں بال آ ہی چکا تھا اور اس کی چبھن بھی سب سے زیادہ تو خود ثمینہ کو ہوتی تھی۔

حالانکہ جب انور سے بات پکی ہوئی تھی' وہ کتنی خوش تھی۔ ان کی برادری کے سب سے خوش حال

گھرانے کی عورت نے اس کا انتخاب کیا تھا۔ وہ جتنا بھی اٹھلاتی، کم تھا۔ ایک دوپہر جب وہ ململ کے سفید دوپٹے پر چھلنی سے آٹا بکھیرے جلدی جلدی بڑیاں بنا کر ڈال رہی تھی، اس کی ہونے والی ساس آگئیں۔ اماں کے تو ہاتھ پیر پھول گئے۔ ابھی پچھلے جمعہ تو وہ منگنی کا شگن کرکے گئی تھیں پھر اب۔

”کوئی ایسی ویسی بات، کسی بھاری بھرکم جہیز کا مطالبہ۔“

ثمینہ تو بھاگ کر پچھلے گھر میں رہنے والی بتول خالہ سے چینی کی پیالیاں لینے چلی گئی تھی۔ خاص الخاص مہمان کو چائے جو پلانی تھی اور اماں نے لپک کر بان کی کھری چارپائی پر نیلی سفید ڈبیوں والا کھیس بچھا دیا۔

اور جب چائے پی جا چکی تھی، ثمینہ برتن بھی اٹھا لائی تھی تو اس کی ماں نے کھیس کی ڈبیوں کو جانے کتنی بار گنتے ہوئے ہولے سے پوچھ ہی لیا۔

”ویسے آپ آئی تو خیر سے ہی ہو ناں، بہن جی!“

تو ان سے بس پانچ قدم پیچھے کھڑی ثمینہ نے اپنی بائیں ہاتھ کی وہ انگوٹھی بڑی زور سے اپنی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے پکڑلی تھی، جیسے اس کی ساس کے منہ سے بس ایک لفظ نکلے گا اور وہ انگوٹھی ٹھک سے اس کی انگلی سے نکل کر گر پڑے گی۔

”کچھ نہیں بہن! میں تو بس آپ کا بہت سارا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔“

”شکریہ، وہ کس لیے جی؟“ ثمینہ کی ماں سچ مچ حیران ہو گئی تھی۔

”آپ کی بیٹی آپ کے لیے اس دنیا کی سب سے زیادہ خوب صورت اور قیمتی شے ہوگی بہن! اور یہی شے آپ نے میری خالی جھولی میں ڈال دی ہے۔ یہ تو آپ کا بہت بڑا احسان ہی ہوا ناں مجھ پر، میرے گھر پر تو بس یہی کہنے آئی ہوں آپ سے کہ آپ کا بہت بہت شکریہ بہن!“

ٹھک کرکے ثمینہ کے ہاتھ سے واقعی کچھ زمین پر گر گیا تھا۔ نیلے پھولوں والی کچی چینی کی پیالی کچے فرش پر الٹی پڑی تھی اور ثمینہ کی ماں کے گرد اس کی ساس کے بازوؤں کا گھیرا تھا، جو اسے پھوٹ پھوٹ کر رونے سے روک رہی تھی۔ ثمینہ نے ابھی جو کچھ اپنے کانوں سے سنا تھا، اس پر وہ خوش زیادہ تھی یا حیران اسے خود اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کبھی فرش پر گری کچی چینی کی پیالی کو دیکھتی اور کبھی خود سے پانچ قدم آگے کھڑی بہت سا روتی ہوئی اپنی ماں کو۔

تب ہی اس رات ثمینہ کی ماں نے اسے سمجھایا تھا۔

”ایک بات یاد رکھنا! کبھی اس عورت کو دکھ مت دینا۔ آج اس کے ایک شکریہ نے تیرے ماں کے دل کو جو ٹھنڈک دی ہے، اب یہ تیرا فرض ہے کہ ساری عمر اس کے سامنے اپنی گردن جھکا کر ہی رکھنا۔ لوگ جس گھر سے بیٹی مانگیں، اس پر سو احسان دھریں گے، پر جانے یہ کیسی عورت ہے، جو شکریہ ادا کرنے چلی آئی بیٹی والوں کا۔ رب سوہنا اس کی بڑی ساری خیر کرے لمبی حیاتی دے، اپنے بچوں کی سب خوشیاں دیکھے۔“

اس کی ہر سانس میں جیسے اب صرف دعائیں ہی باقی رہ گئی تھیں قرض لوٹانے کو۔

☼ ☼ ☼

اپنی ماں کی ان بہت ساری ہدایات کو اپنے سچے دل سے کیے گئے وعدے کی لڑی میں پروئے، ثمینہ جب سسرال پہنچی تو اسے یقین تھا کہ بہت جلد وہ ”تمیزدار بہو“ کے خطاب سے سرفراز ہو جائے گی۔ مگر سسرال تو وہ پہیلی ہے، جسے کوئی بھی آج تک بوجھ نہیں پایا۔ ریشم کی ایسی گتھی، جو کسی سے نہ سلجھ سکے ناں۔

بڑا سا گھر، ہر وقت کا آیا گیا، خوب کھلا کھانا پکانا اور اس کی ساس اکیلی جان۔ یہ اور بات کہ کبھی کبھار کوئی عورت بھی مدد کے لیے بلوائی جاتی۔ ورنہ سارا کام اس کی ساس بڑی مہارت اور سلیقے سے خود ہی یوں نبٹا دیتیں کہ ثمینہ خود حیران رہ جاتی۔

شروع شروع میں اس نے بھی آگے آگے ہو کر ان کا ہاتھ بٹانا چاہا، مگر ”ابھی تو نئی دلہن اور ہاتھوں کی مہندی کے رنگ۔“ جیسے لفظوں سے بہلا دی گئی اور پھر اوپر تلے کے بچوں نے بھی اسے کچھ مصروف کر دیا۔

بظاہر تو ثمینہ ایک مثالی زندگی گزار رہی تھی مگر کب تک بھلا۔ بنت آدم تھی، سو اپنی ہی جنت کے پھلوں سے کچھ اوب سی گئی تھی۔ شوہر اسے پیار تو کرتا مگر اپنی ماں کا پکا فرماں بردار، کوئی ملنے جلنے بھی گھر میں آتا تو سب سے پہلے ثمینہ کی ساس کا ہی پوچھا جاتا۔ گھر کا ہر کام، ہر فیصلہ انہی کی مرضی سے ہوتا۔ وہ اگر ڈھیٹ بن کر اپنی رائے دینے کی کوشش بھی کرتی تو کبھی نہیں مانی گئی۔ بلکہ الٹا مذاق ہی اڑایا گیا۔ کم سے کم ثمینہ کو ایسا ہی محسوس ہوتا تھا۔

ثمینہ کی ساس کا ہاتھ بہت کھلا تھا۔ اچھی خاصی چیز بڑے آرام سے اٹھا کر کسی کو دے دیتی تھیں اور ثمینہ کا جی خاک ہو جاتا۔

جس دن ثمینہ نے حسن کا چھلا نہایا تو اس کی ساس نے اپنی سونے کی انگوٹھی اتار کر دائی رضیہ کو دے ڈالی۔

”تو نے مجھے سب سے پہلے میرے پوتے کی خبر دی تھی۔ اللہ تیری خیر کرے۔“ انہوں نے انگوٹھی اسے پہناتے ہوئے کہا تو وہ خوشی اور تشکر سے ان کے ہاتھ چومنے لگی۔

جبکہ ثمینہ تو حیران رہ گئی۔ کیا ضرورت تھی اس دو ٹکے کی عورت کو اتنا بڑا تحفہ دینے کی۔ تنہائی ملتے ہی اس نے شوہر کے سامنے دل کی کھولن نکالی تھی۔

”او جھلیے! سب سے بڑا تحفہ تو یہ ہمارا بیٹا ہے، جو اللہ پاک نے ہمیں دیا ہے۔ اس کے سامنے بھلا سونے کی انگوٹھی کی کیا وقعت۔“

انور نے حسن کو گود میں لے کر بڑے آرام سے کہا تھا۔

”ہونہہ۔۔۔ بڑا آیا وقعت بتانے والا۔ اتنی پسند تھی مجھے۔ کئی بار سوچا، اماں جی سے خود اپنے لیے مانگ لوں۔“

”دل کی بات کہہ ڈالی آخر۔ تم زنانیاں بھی ناں بڑی لالچی ہوتی ہو۔ پورے آٹھ تولے کا سیٹ بنوا کر دیا ہے تجھے اماں نے حسن کے پیدا ہونے پر اور تو اس چار ماشے کی انگوٹھی کے لیے رو رہی ہے۔ سچ کہتے ہیں سیانے، عورت کی عقل گٹیا کے پیچھے ہوتی ہے۔“ وہ منہ بنا کر اٹھ کر چلا گیا تھا۔ مگر ثمینہ کو کون سا پروا تھی۔

گائے بھینس گھر میں تھیں۔ دن میں دو بار انور بالٹیاں بھر کر دودھ کی لاتا تھا اور روز صبح اس کی ساس بہت سارا مکھن بناتی تھی۔ نرم نرم، تازہ مکھن کا پیڑا۔ اس کا ذائقہ اور خوشبو۔ اپنی ماں کے گھر میں صرف پاؤ بھر دودھ سے سارا دن گزارنے والی ثمینہ کے لیے یہ دودھ مکھن کوئی آسمانی نعمت تھیں جیسے، وہ تو اس کا پیٹ جلدی بھر جاتا ورنہ اس کا مکھن والا برتن آخر تک چاٹ جانے کو دل کرتا تھا۔

”ثمینہ پتر! پیالے کو یوں کناروں تک نہیں بھرتے۔ تمہیں زیادہ دہی کھانا ہے تو پھر لے لینا۔“

دہی سے لبالب بھرے پیالے میں دیسی چینی ملاتے ہوئے جب ثمینہ سے کچھ دہی فرش پر گر گیا تو اس کی ساس نے بہت نرمی سے سمجھایا۔

”کیسی چالاک عورت ہے، اسے تو میرا کھانا پینا بھی برا لگتا ہے۔ دفع دور، جا کھاتی ہی نہیں تیرا دہی۔“ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے ثمینہ نے مارے غصے کے وہ پیالا ہی زمین پر گرا دیا۔ ٹھک کر کے پیالا ٹوٹا اور سارا دہی مٹی کے فرش پر بہہ گیا۔

”ہائے میرے اللہ! یہ کیا ہو گیا۔“ اس کی ساس جھٹ سے آگے بڑھیں اور اپنے ہاتھوں سے وہ مٹی والا دہی دوسرے برتن میں ڈالنے لگیں۔

”نہ میری دھی نہ، یہ دودھ دہی تو رب کا نور ہوتا ہے، اسے زمین پر نہ ڈولو (گراؤ) اللہ ناراض ہوتا ہے۔“ وہ ساتھ ہی اسے سمجھا بھی رہی تھیں۔

”میں نے کون سا جان بوجھ کر گرایا ہے بس خود ہی پتا نہیں کیسے۔“ ثمینہ نے سفید جھوٹ بولا۔

”ہاں بیٹا! تو کیوں ڈولے گی بھلا میں یہ کہہ۔۔۔“

”اچھا اماں! ذرا حسن کو دیکھوں، کہیں اٹھ نہ گیا ہو۔“ ان کی بات کاٹ کر وہ باورچی خانے سے باہر آگئی۔

☼ ☼ ☼

"ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے اماں! میں ابھی جا کر کہہ آتا ہوں' آپ تا یہ بوریاں گن کر باہر ڈیوڑھی میں رکھوا دیں۔"

"ہاں جائیں مگر یاد رہے 'انہیں ایک ایک بوری دینی ہے' ہر سال کی طرح۔" ثمینہ کے بے تکے انداز نے ماں بیٹا دونوں کو ہی حیران کر دیا تھا۔

"نہیں دھی! تجھے تو پتا ہے ناں 'خیر سے اس بار ہماری کنک (گندم) پچھلے سال سے دوگنی ہوئی ہے۔ پھر ہم ان غریبوں کو جو ہر سال ایک بوری دیتے ہیں' اس دفعہ دو بوریاں کیوں نہ دیں۔" ان کا لہجہ نرم ہی تھا۔

"پر ماں جی! اس سال گندم کا بھاؤ بھی تو چڑھا ہے ناں۔ کیسی فالتو کی ایک ایک بوری جو انہیں دینی ہے' منڈی میں بیچ کر کیوں نہ ہم اپنی جیب میں پیسے ڈالیں۔" ثمینہ بڑی سمجھ دار بن کر انہیں مشورہ دینے لگی۔

اس سے پہلے کہ انور اس کے جواب میں ثمینہ کو کوئی تلخ بات کہتا 'اماں نے سر کے اشارے سے اسے باہر جانے کا کہا۔

"ادھر آ میرے پاس' تجھے میں سمجھاتی ہوں بیٹا!" انہوں نے ثمینہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس ہی چارپائی پر بٹھا لیا۔

"قرآن شریف میں اللہ پاک نے کہا ہے کہ ہمارے مالوں میں 'زمینوں میں حصہ ہوتا ہے 'غریبوں' یتیموں اور ماڑے (کمزور) لوگوں کا' تو یہ حصہ ہمیں ہر صورت ان کو پہنچانا ہی ہوتا ہے۔"

وہ کسی بڑے مولوی صاحب کی طرح اپنی بہو کو سمجھانے لگیں۔

"مگر اماں! زمینیں ہماری 'اس پر ساری محنت 'خون پسینہ ایک کر کے فصلیں اگائے آپ کا بیٹا تو پھر مالک تو وہی ہے ناں آپ کا بیٹا۔" ثمینہ کو بڑا دھچکا لگا تھا۔

"نہیں پتر! اصل مالک تو صرف اور صرف اللہ ہے۔ ہم تو امانت دار ہیں اس کی طرف سے 'اس کے بندوں تک ان کا حق پہنچانے والے ہمیں تو وہی کرنا ہے جو ہمارے رب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا بس۔ اب تو جا اور جا کے میٹھی لسی بنا چاٹی بھر کے۔ انور نے کہہ دیا ہو گا جا کر۔ وہ لوگ آتے ہی ہوں گے بوریاں اٹھانے۔ میں ذرا عصر کی نماز پڑھ لوں۔"

اپنے تئیں تو دلہن کو بہترین انداز میں سمجھا کر انہوں نے اپنا فرض نبھا دیا تھا' مگر اس نے سمجھا بھی کہ نہیں 'اس پر انہوں نے دھیان نہیں دیا۔

✡ ✡ ✡

چھوٹے چھوٹے 'ہلکے سبز رنگ کے ملائم ٹنڈے اور اتنے ہی چھوٹے مگر جامنی رنگ کے لشکارے مارتے بینگن ٹوکری بھر کر اس وقت ثمینہ کے سامنے رکھے تھے۔

"واہ جی واہ! آج تو موجیں ہی ہو گئیں۔ بھرے ہوئے ٹینڈے بناؤں یا پھر بینگن کی بھجیا 'اتنی تازہ سبزی ہے گوشت سے بڑھ کر ذائقہ بنے گا۔" اس کے منہ میں سوچ کر ہی پانی بھر آیا۔ تب ہی ساتھ والے گھر سے جیراں تائی آ گئیں۔

"لگتا ہے آج پھر کھیتوں سے سبزی آئی ہے۔" انہوں نے ثمینہ کے آگے دھری ٹوکری دیکھ کر کہا۔

"ہاں تائی! دیکھو ذرا کتنے خوب صورت بینگن ہیں۔" وہ مگن سی بولی۔

"ہاں پتر! ماشاء اللہ 'اللہ برکت دے۔" تائی نے فوراً" کہا۔ ثمینہ کی گردن کچھ اور بھی تن گئی۔

"بہن جنتے نہیں آئی ابھی تک کڑیے!" انہوں نے ثمینہ کی ساس کا پوچھا۔

"نہیں تائی! ابھی دو چار دن اور لگیں گے۔"

"ٹھیک ہے دھی! آخر تو جنتے کی سگی ماسی کا بیٹا تھا مرنے والا۔ کچھ دن تو وہاں رہ کر ہی آئے گی۔" تائی اٹھتے ہوئے بولیں۔

"ہاں جی!" بینگنوں کی ڈنڈیاں اتارتے ہوئے ثمینہ بے دھیانی سے بولی۔

"میں بھی جا کر دیکھوں ذرا' سبزی والا آ گیا ہو گا۔ دوپہر کے کھانے کی تیاری کروں۔"

تائی نے بڑے غور سے سبزی کی ٹوکری کو دیکھتے ہوئے کہا اور چل پڑیں۔

"ہاں ہاں اب جان بھی چھوڑ۔ اس سبزی میں سے کچھ نہیں ملے گا تمہیں۔ کب سے نظریں جما کر بیٹھی ہے۔ بھوکی ندیدی نہ ہو تو۔" ثمینہ تائی کے جاتے ہی بڑبڑائی تھی۔

تین دن بعد جب اس کی ساس واپس آئیں تو بڑی ساری ٹوکری میں پڑی ساری سبزی خراب ہو چکی تھی۔

"اماں! میں تو اس دن سبزی پکانے لگی تھی کہ ماچھو کے گھر سے چاولوں کی پرات بھر کے آ گئی۔ سو میں نے سالن ہی نہ بنایا۔"

ان کے پوچھنے پر ثمینہ نے وضاحت کی۔

"اچھا 'پھر بھی اتنی ساری تھی۔ محلے پڑوس میں دے دیتی کچھ۔ ہمیشہ ایسے ہی تو کرتی ہوں میں۔ اب یہ اتنا سارا رزق ضائع ہی گیا ناں۔ اللہ معاف کرے۔"

وہ کچھ ناراض سی ہو کر چپ ہو گئیں اور ثمینہ بھی منہ بنا کر ایک طرف بیٹھ گئی۔

یوں تو وہ روزانہ ہی تازہ مکھن نکالتی تھیں مگر جمعرات کے دن وہ جتنا بھی مکھن نکالتیں 'اسے فوراً" گرم کرنے کے لیے چولہے پہ رکھ دیتیں اور پھر جو گھی بنتا 'اسے الگ سے ایک چھوٹی سی کٹوری میں ڈال لیتیں اور جب کچھ عرصے بعد یہ کٹوری بھر جاتی تو پھر ایک دن خود ہی خالی بھی ہو جاتی۔ کیسے اور کہاں۔ یہ بات ثمینہ کے لیے راز تھی۔

مگر اسے یہ راز جاننے سے کہیں زیادہ اس بات کا قلق تھا کہ جمعرات کے دن وہ مکھن سے محروم رہ جاتی ہے۔ اس دن گھر میں کسی کو بھی تازہ مکھن نہیں ملتا تھا یا تو گھی استعمال کر دیا پھر کل کا بچا ہوا مکھن 'اور ثمینہ کے لیے یہ دونوں ہی باتیں برداشت سے باہر ہو جاتیں۔

"مجھ سے نہیں کھایا جاتا وہ کل والا 'میں تو یہی لوں گی۔"

ایک بار ثمینہ نے بچوں کی طرح ضد باندھ لی تھی۔

"یہ تو میں ہرگز نہیں دوں گی۔ ہفتے کے چھ دن تم اپنی مرضی سے کھاتی ہو' آج ایک دن نہیں لوگی تو کیا ہو جائے گا۔" آج شاید انہیں بھی غصہ آگیا تھا۔
ثمینہ کو ان کے ایسے لہجے کی عادت نہ تھی۔ سو پہلے تو حیران ہوئی پھر پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے اٹھ کر چل دی۔
"ٹھیک ہے' ایسے ہے تو پھر ایسے ہی سہی۔ میں بھی اب حرام ہے' جو اس عورت کے ہاتھ سے کچھ لے کر کھاؤں۔"
وہ ساری رات غصے میں کھولتی رہی اور بچوں کو خوامخواہ مار کر اپنا غصہ نکالتی رہی' مگر اگلی صبح جب اس کی ساس نے چاندی کے کٹورے میں سنہری مائل مکھن کا پیڑا اور گرما گرم روٹی اس کے سامنے رکھی تو وہ سب کچھ بھلا کر مزے سے کھانے لگی۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس وقت اس کی ساس بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں اور شاید کسی گہری سوچ میں تھیں۔
"یہ دیکھ پتر! اس بالٹی میں پورے پانچ سیر کنک آتی ہے۔ اس کا مطلب ہے' ایک من گندم تو گنی ہو تو اسے کتنی بار بھرنا پڑے گا۔"
اگلے ہی دن وہ ثمینہ کو دانوں کی کوٹھی کے آگے لے کر کھڑی سمجھا رہی تھیں۔
"پورے آٹھ بار۔" پانچویں پاس ثمینہ نے جھٹ سے حساب کتاب کر ڈالا تھا۔ وہ مسکرانے لگیں۔
"تو نے دیکھا ہوگا کہ گھر میں کبھی کبھی ایسے لوگ گندم' چاول وغیرہ لینے آتے ہیں۔ جو بس اپنی ضرورت جتنی چیز ہی خرید سکتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ یا تو فوراً "پیسے دے دیتے ہیں یا پھر تھوڑے دن بعد کا ادھار کر لیتے ہیں مجھ سے۔ میں بھی انہیں بیس سیر یا ایک' دو من چیز دے دیتی ہوں اور ان پیسوں سے گھر کی کوئی نہ کوئی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔"
"کیسی ضرورت اماں؟" اس بار حیرت ثمینہ کے لہجے میں تھی۔
"ہوتی ہیں بیٹا! بہت ساری ضرورتیں ہوتی ہیں ہر گھر کی۔ کچھ دیکھی' کچھ ان دیکھی' کچھ چاہی' کچھ ان چاہی۔" وہ جیسے کہیں کھو سی گئیں۔ "اور یہ ساری ضرورتیں اللہ پاک خود ہی پوری کر دیتے ہیں بس ایک شرط پر' ذرا دھیان سے سننا میری بات کو پتر! جب بھی کسی کو ایک من کنک دینا تو اس' پانچ سیر والی بالٹی کو آٹھ بار نہیں بلکہ نو بار بھرنا۔ وہ جو تو نے پورے چالیس سیر دیے' وہ تو تیرا انصاف ہوا اور پھر جو مزید تو نے پانچ سیر ڈالے ناں اس میں' وہ تیرا احسان ہوگا۔ بس ہر بار یہ اتنا اتنا سا احسان کرتی رہنا۔ اللہ سوہنا آپ ہی تیری سب ضرورتیں پوری کر دے گا۔ تجھے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑے گا۔ رب دی سوں (خدا کی قسم) وہ تجھے اتنا دے گا' اتنا دے گا کہ تو سنبھالتی تھک جائے گی' بس دوسروں کو دیتے ہوئے نہ تھکنا۔"

☼ ☼ ☼

خاکی دھرتی کی گود سے کچھ موسم مزید گزرے۔ انور نے زمین خریدی۔ بچے اسکول جانے لگے۔ گھر کے کام کاج میں ثمینہ کا حصہ بڑھنے لگا' جس کے دل میں بس ایک ہی ارمان پنپتا تھا' اماں جی کی زندگی کا سورج کب ڈوبے اور اس کی حکومت کا دن کب چڑھے۔
اور آج جب کہ وہ دن نکل آیا تھا تو وہ زمین پہ سر رکھے بلک بلک کر رو رہی تھی اور یہ نہیں جانتی تھی کہ کیوں' یا شاید جانتے بوجھتے ہوئے ماننے سے ڈرتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ لو شریفاں ماسی! فرزانہ کی ماں کو دے دینا۔" ثمینہ نے جمعرات والی کڑوی کا سارا گھی گاؤں کی اکلوتی دائی کے ہاتھوں میں پکڑایا۔
"ہاں اور اس سے کہنا اللہ پہ بھروسا رکھے۔ خیر سے خوشی کی خبر آئے گی' باقی سارا سامان میں نے باندھ دیا ہے وہ ڈیوڑھی والی منجی پہ رکھا ہے' جا کر اٹھا لو۔"
"جیتی رہ پتر!" اس کے مسکراتے ہونٹ اور نرم لہجے پر شریفاں نے بے ساختہ دعا دی۔
"اچھا بس اب ___ خاموشی سے جا اور خبردار رازداری شرط ہے۔" ثمینہ نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کی تھی۔
"ہاں ہاں' سب سمجھتی ہوں۔ کون سا پہلی بار ___"
اور پھر ثمینہ کی نرمی سے گھورتی نگاہوں نے اسے بات ادھوری چھوڑ کر جانے پر مجبور کر دیا۔
"یہ کیا تھا ثمینہ!" کافی دیر سے اس کے پاس چپ بیٹھی اس کی ماں سے رہا نہ گیا تو پوچھ بیٹھی۔
"کچھ بھی نہیں ماں! بس ایسے ہی۔" وہ جیسے بات ٹالنے لگی تھی' مگر وہ بھی تو آخر اس کی ماں تھیں' اسے بتانا ہی پڑا۔
"میری ساس کا معمول تھا امی جی! کہ ہر جمعرات کے مکھن کو جمع کر کے جو گھی بنتا تھا' اسے بالکل الگ رکھتیں اور پھر اس بات کا دھیان بھی کہ گاؤں میں کون کون سے ایسے گھر ہیں' جہاں کی بیاہی بیٹیاں بچے کی پیدائش کے لیے اپنے میکے آئی ہوئی ہیں اور وہ اتنی ہمت تک نہیں رکھتے کہ ان کی خوراک کا خیال رکھ سکیں۔ پھر یہ گھی' زچہ بچہ کے کپڑے' سردی اور گرمی کا ایک ایک بستر اور چند چیزیں ان کی طرف "لازما" بھجوا دیتیں۔ بس یہ بھی ان کا شروع کیا ایک رواج ہی سمجھ لیں' جسے میں ان کے جانے کے بعد بھی جاری رکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"
اس کی آواز دھیمی مگر لہجہ بہت پختہ تھا۔
"بالکل خالہ جی! اور اس کوشش میں یہ آپ کا جوائی بھی اس کے ساتھ ہے۔" جانے کس وقت انور گھر آگیا تھا' ثمینہ کے پیچھے کھڑا ہو کر کہنے لگا۔
اور یہ اسی دن کی تو بات تھی' جب وہ عورت اپنی ہمسائی کے ساتھ ثمینہ کے گھر بیس سیر کنک کا سوال لے کر آئی تھی۔ اس کے بورے میں ناپ کر پوری گندم ڈالنے کے بعد اس نے پھر ایک بار کوٹھی میں سے گندم کے دانوں کی بالٹی بھری' ابھی وہ بالٹی بھر کر الٹانے کے لیے آگے کو جھکی ہی تھی جب ان دونوں عورتوں میں سے ایک نے دوسری کی طرف جھک کر کہا۔
"دیکھا! بالکل اپنی ساس جیسی ہے' میں نے کہا تھا ناں۔ جتنی بھی تو مانگے گی ناں' اس سے کچھ زیادہ ہی دے گی اور پیسے تو چاہے سال بعد دینا' کبھی مڑ کر تقاضا نہیں کرے گی۔ اپنی ساس جیسی ہوئی ناں یہ بھی۔"
ان کے جانے کے بعد جب وہ بہت سارا رو بھی چکی تھی۔ اسی وقت اس پر یہ راز کھلا کہ وہ تو اب مر کر بھی یہ راستہ نہیں چھوڑ سکتی' جس سے بچنے کی کوشش وہ اب تک کرتی رہی تھی۔ اس کے ارد گرد کے سب ہی لوگ اس سے بہت ساری توقعات باندھ چکے تھے' جنہیں وہ چاہ کر بھی نہیں توڑ سکتی تھی۔
اب چاہے حکومت اس کی تھی مگر قانون وہی پرانا تھا۔ سو اس کے پاس اور کیا راستہ تھا' سوائے اس کے کہ وہ بھی اپنی "ساس جیسی" بن جائے۔

☼

فارحہ ارشد

مسیح گلابوں کے موسم میں

میں کلینک سے جلد ہی اٹھ آئی تھی کیونکہ شام میں مجھے ایک سیمینار میں شرکت کرنا تھی۔ یہ سیمینار "بڑھتے ہوئے جرائم کا ذمہ دار کون؟" کے موضوع پہ منعقد ہو رہا تھا۔ جس میں مجھے ایک سائیکاٹرسٹ کے حوالے سے مدعو کیا گیا تھا۔ ڈرائیو کرتے ہوئے میری نگاہیں سڑک پہ کار کی اسپیڈ سے تیز بھاگ رہی تھیں۔ کلینک سے گھر تک کا آدھ گھنٹہ کا سفر میں نے آج کے سبجیکٹ (مریض) کے متعلق سوچتے ہوئے گزارا۔

اس قدر ڈیسنٹ اور باوقار پرسنالٹی رکھنے والا یہ شخص کسی طور ابنارمل نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے اپنی سوالیہ نظریں اس کے چہرے پہ گاڑ دیں۔

میری نگاہوں کا مفہوم سمجھتے ہوئے وہ تھوڑا مسکرایا۔ اور قریب پڑے صوفے میں دھنستا ہوا بولا۔

"آج فون پہ آپ سے میں نے ہی ٹائم لیا تھا۔"

"اوہ!" میں نے ہونٹ سکوڑے۔

اس قدر ڈیسنٹ شخص میں کہاں کمی رہ گئی۔ میں نے ہمیشہ کی ہمدردی سے سوچا۔

"آپ غالباً" زین العابدین شاہ ہیں۔" مجھے یاد آیا' صبح گھر پہ اسی نام کے شخص نے مجھ سے بات کی تھی۔

"کہیے ٹھنڈا کہ گرم؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔ یہ ایک سائیکاٹرسٹ کے اخلاق کا تقاضا تھا۔

"نو تھینکس۔ بس آپ میرے ذہن کو اس عذاب سے نکال دیجئے۔" اس کے چہرے پہ ابنارملٹی کے رنگ اتر آئے۔

"ایزی۔ ایزی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بشرطیکہ آپ خود ساتھ دیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ظاہر ہے اگر میں یہاں تک آیا ہوں تو جہاں تک ہو سکے گا تعاون کروں گا۔"

سگار مسلسل منہ میں دبائے اس نے کہا۔ گیٹ پہ پہنچ کر میں نے زور سے ہارن بجایا۔ شاہ زمان کا کا خلاف توقع مجھے دیکھ کر بھاگتا ہوا گیٹ کھول کر میری طرف لپکا۔

"سلام صاحب! آج کیا بات ہوا صاحب' کھیریت (خیریت) تو ہے نا؟"

"کوئی بات ہیں شاہ زمان آج ایک تقریب میں جانا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم ٹھیک ہو نا!" میں نے حسب معمول پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے' شکر ہے۔" وہ کہتا ہوا پیچھے ہٹ گیا' میں نے بریک سے پاؤں ہٹاتے ہوئے گاڑی کو گیراج میں لا کھڑا کیا۔

حسب معمول ماما اور بابا اپنی اپنی ایکٹیوٹیز میں گم تھے۔ بابا بزنس کے سلسلے میں پیرس اور ماما کسی ادبی محفل میں گئی ہوئی تھیں۔ غسل کے بعد چائے اور کیک لینے کے بعد میں نے گاڑی "النور ہوٹل" کی طرف موڑلی۔ سیمینار میں پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ دیے گئے ٹائم سے میں پورے پانچ منٹ لیٹ ہوں اور مجھ سے زیادہ پنکچوئل لوگ یہاں مقررہ وقت سے پہلے پہنچ چکے ہیں۔ یونیورسٹی کے نفسیات کے پروفیسر جناب ایم ایچ ہمدانی چیف گیسٹ کے طور پر بلائے گئے تھے۔ فرح ان سے باتیں کر رہی تھی۔ میں اسی طرف چلی آئی۔

"السلام علیکم سر۔" میں نے جھک کر سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ آؤ بھئی آؤ۔ آج تو کافی دنوں کے بعد یہ فرح۔ یہ آفاق اور کومل سارے اپنے بچے ہی ادھر مل گئے۔"

سر نے ہنستے ہوئے پیچھے ہو کر صوفے پہ میرے لیے جگہ بنائی۔ آفاق رضوی سے سلام لیتے ہوئے میری نگاہیں سامنے کھڑے زین العابدین شاہ پہ جا رکیں۔ گرے تھری پیس سوٹ میں سگار ہاتھ میں لیے ہنستا ہوا وہ مسز سلیمان ملک سے مخاطب تھا اس کے چہرے پہ کسی ابنارملٹی کی کوئی لکیر نہ تھی۔ "ڈپلومیٹ" میں مسکرائی۔

"اور بیٹے! "مشن" کیسا جا رہا ہے؟"

"آپ کی دعاؤں سے بہت اچھا سر۔ آپ کی گائیڈنس اور دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

میں نے پر عزم لہجے میں کہا۔ مجھے سرہمدانی کی کلاسز یاد آگئیں' جب وہ ہمیشہ اس بات پہ کلاسز ختم کرتے تھے کہ۔ "ہمیں ہر روز خود سے یہ وعدہ لینا ہے کہ ہم نے سائیکالوجی کو بزنس یا شہرت کی کوئی سیڑھی نہیں بنانا۔ اس شعبے کو ایک معزز اور فرسٹ کلاس شعبے کے طور پر سامنے لانا ہے۔ اسے پروفیشن نہیں بلکہ "مشن" بنانا ہے۔ ہمیں "قارون" نہیں بننا ہمیں "ابراہیم بن ادھم" بننا ہے۔" ان کا میٹھا اور پر شفقت لہجہ آج بھی میری سماعتوں میں روز اول کی طرح زندہ ہے۔

سرہمدانی اسٹیج پہ براجمان تھے۔ آفاق رضوی۔ فرح اور میں نے اپنے اپنے لہجے میں سرہمدانی کی دی گئی تعلیم و تربیت کے زیر اثر تقاریر کیں۔ میں نے انفرادی قوت پہ زور دیتے ہوئے کہا۔

"بڑھتے ہوئے جرائم کی روک تھام میں ہر شخص کا انفرادی طور پر حصہ لینا بہت اہم ہے ماں اگر بچے کو غلط رستے پر دیکھتے تو صرف مارنے جھاڑنے سے کام نہیں بنتا بلکہ وہ اس کا نفسیاتی تجزیہ کرے کہ اگر بچے نے کوئی چیز چرائی یا کوئی برا فعل کیا تو آخر کیوں؟ اس کے علاوہ اگر ماں پڑھی لکھی نہیں اور غریب ہے تو اسے چاہیے کہ وہ شروع سے اسے عادت ڈالے کہ وہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کو برا جانے اسے خودداری کا سبق سکھائے۔ حلال رزق کی عادت ڈالے اور حرام کمانے والوں کو بے غیرت اور برا کہے تو بچہ اچھا تاثر لیتا ہے' ہمارا آج ہی ہمارا کل ہے۔ آج کا بچہ کل کا جوان ہے۔"

آخر میں سرہمدانی کو مائیک دیا گیا۔ ہال میں خاموشی چھا گئی۔ ایک آواز تھی کہ خوشبو یہاں سے وہاں تک پھیلتی چلی گئی۔

"محبت' محبت سے ہم وہ کر سکتے ہیں جو نمرود نہ کر سکا۔ فرعون' ہامان نہ کر سکے۔ محبتیں ہمارے پیغمبروں اور اولیائے کرام کی میراث ہیں اور ہمارے لیے صراط مستقیم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہمارے سامنے کسی انگریز فلاسفر یا لامذہب سائیکالوجسٹ کی ریسرچ نہیں بلکہ ہمارے سامنے محبتوں کے سب سے بڑے امین اور انسانیت کے سب سے بڑے علمبردار حضورؐ کی حیات مبارکہ ہے' ہمیں ان کے نقش پا پہ چلنا ہے۔"

سرہمدانی بڑی روانی سے بول رہے تھے۔

"مجھے امید ہے۔ آس ہے اس روز کی جب "خوف" کی جگہ "محبت" لے لے گی۔ جب جینے کا خوف۔ مرنے کا خوف۔ رونے ہنسنے کا خوف' یہ اعصابی تھکن' یہ دباؤ ختم ہو گا۔ اسلحہ کی جگہ محبتیں لے لیں گی' ہمیں محبت سے لوگوں کو اچھی راہ دکھانا ہے' ہم میں سے کچھ کو اگلی صف میں آنا ہے' قربانیاں دینے کر۔ آج کی سب سے بڑی نفسیاتی بیماری "خوف" ہے آج کا انسان "خوف" کے زیر اثر ہے۔ رو رہا ہے' پریشان ہے چیخ رہا ہے لیکن اس جال سے نکل نہیں پا رہا۔ پیچھے رہ جانے کا خوف' غربت کا خوف' دولت چھن جانے کا خوف' یہ خوف ہی بڑھتے ہوئے جرائم کا اصل ذمہ دار ہے۔ اس خوف سے یاد خدا اور خدا کی طرف جانے والی ہر راہ ہمیں نجات دلا سکتی ہے۔"

سرہمدانی اللہ کے محب اور رسول اللہ کے عاشق' سفید ریش' سرخ و سفید رنگت۔ سادہ شلوار سوٹ پہ سفید واسکٹ پہنے' عام دیکھنے والا بھی اچھا تاثر لے کر جاتا تھا۔ سیمینار سے واپسی پر میں یہی سوچتی رہی کہ شاید ایسے اچھے لوگوں کی وجہ سے ہی دنیا قائم ہے۔

☆ ☆ ☆

زین العابدین شاہ پہ میں تقریباً" ایک ہفتے سے کام کر رہی تھی مگر وہ بہت مشکل تھا۔ کوئی سبجیکٹ اس وقت مشکل ہو جاتا ہے۔ جب وہ کھلنا نہ چاہتا ہو اور علاج بھی چاہتا ہو۔ اس روز بھی اس کے آفس سے اس کے بارے میں پتا کرنے آئی' ایک کافی عمر رسیدہ کارکن نے پوچھنے پہ بتایا۔

"شاہ جی ایک نیک سیرت بزنس مین ہیں۔ دولت میں بہت زیادہ انٹرسٹڈ نہیں۔ آپ اس بات سے دولت سے عدم دلچسپی کا اندازہ لگا سکتی ہیں کہ انہوں نے تقریباً" پندرہ فیکٹریاں لگائیں اور آج تک مکمل حساب نہ لینے کی وجہ سے خسارہ ہوا اور انہیں نقصان اٹھانا پڑا۔"

پھر ان کے ایک خاص کارکن نے بتایا۔

"اصل میں شاہ جی کسی ایک بزنس میں انٹرسٹڈ نہیں۔ اگر وہ کسی ایک بزنس پہ بہت سا پیسہ لگا کر کام چلاتے تو بزنس بہت کامیاب رہتا لیکن یہاں یہ حالت ہے کہ ہر سال ایک نئی فیکٹری لگانے کے لیے تیار رہتے ہیں جس سے نہ صرف وہ پریشان بھی ہوتے ہیں بلکہ ورکرز کو بھی ڈسٹربنس ہوتی ہے۔ حالانکہ رحم دل اس قدر ہیں کہ پچھلی فیکٹری کا اگر کام ٹھپ ہو جائے تو اگلی نئی فیکٹری میں ورکرز کو لے آتے ہیں۔ لیکن ایک جگہ' ایک بزنس پہ نہ ٹھہرنے کی وجہ سے نہ صرف ہم پریشان ہوتے ہیں بلکہ ان کا کاروبار اور پیسہ اور سب سے بڑی قیمتی چیز وقت بھی برباد ہوتا ہے۔"

زین العابدین کی سیکریٹری نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"آپ ان کی تھرلنگ کا اندازہ اس طرح لگائیں کہ اس فیکٹری کو دو سال ہوئے ہیں اور میں یہاں ان کی دسویں سیکریٹری ہوں۔"

مجھے اس کی اصل بیماری کا اندازہ ہو چلا تھا اس کی انگزائٹی کی وجہ میری سمجھ میں آ گئی تھی اس لیے میرا یہ سروے کامیاب رہا تھا۔ میں نے اس کی سیکریٹری سے لیے ہوئے گھر کے ایڈریس پر گاڑی کا رخ کیا۔ سفید ماربلز سے بنی اس محل نما عالی شان عمارت کے سامنے میں نے گاڑی روک کر اس کے بڑے گیٹ پہ بیل دی۔ باوردی ملازم نے گیٹ کھولا گاڑی گیراج میں چھوڑ کر اس کے پیچھے پیچھے چلتی ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔

ہر چیز سے امارت اور نفاست ٹپک رہی تھی۔ بہت سلیقے سے سنورا یہ ہال نما ڈرائنگ روم کسی عورت کا کمال لگ رہا تھا۔ جبکہ زین العابدین کے بقول وہ میرڈ نہیں۔ شاید کوئی بہن وغیرہ۔ میں ہر چیز کو گہری نظر سے دیکھنے کی عادی ہو گئی تھی۔

کافی دیر کے بعد بہت نفاست سے سجی سنوری ایک بھاری بھر کم خاتون پردوں کے پیچھے سے نمودار ہوئیں۔

"ہیلو۔" بہت غور سے مجھے دیکھتے ہوئے تفاخر سے

کہا گیا۔

"جی السلام علیکم۔" میں کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھیے۔" وہ مخاطب ہوئیں۔

"میں ماہر نفسیات کومل حسین ہوں۔ زین العابدین صاحب کا علاج کر رہی ہوں۔" میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

"اوہ اچھا۔ مگر آپ تو بہت چھوٹی ہیں۔ اسے کسی بڑے ماہر نفسیات کے پاس جانا چاہیے تھا۔" انہوں نے نخوت سے ناک سکیڑی۔

"آپ غالباً؟" میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

"میں زین کی بہن ہوں سیما قریشی۔ اس کے ساتھ رہتی ہوں۔" میری بات کاٹ کر جواب دیا گیا۔

"شاید سب ہی "کنوارے" ہیں۔" میں مسکرائی۔ میری رگ شرارت پھڑکی لیکن چونکہ بقول سیما قریشی صاحبہ کے میں ابھی "چھوٹی" تھی اس لیے مزید مسکرانے سے میں نے خود کو روکا۔

"زین صاحب نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی۔ کوئی خاص وجہ؟" میں اصل ٹاپک کی طرف آئی۔

"یہ تو زین کا پرسنل میٹر ہے' آپ کو اس سے ڈسکس کرنا چاہیے تھا۔" وہ شاید جلد اٹھنا چاہتی تھیں۔

"ان سے میں پوچھ چکی ہوں لیکن آپ کے خیال میں۔" وہ کافی دیر سوچتی رہیں۔

"کوئی لڑکی۔ کوئی محبت وغیرہ کا چکر؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں بلکہ یوں کہیں کہ لڑکیوں سے بھاگتا ہے یہی وجہ ہے کہ کسی سے مطمئن نہیں ہوتا۔ چار منگنیاں کرکے توڑ چکا ہے۔ بلاوجہ ہی وہ اچھی لڑکی اسے بری لگنے لگتی ہے۔ سب ہی اس کی ان عادتوں کی وجہ سے اپ سیٹ ہیں بلکہ آج کل تو وہ خود بھی پریشان ہے۔"

میں اس کی بیماری کی تشخیص کرنے میں آہستہ آہستہ کامیاب ہو رہی تھی۔

"یہ کوٹھی کتنی پرانی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تقریباً" ڈیڑھ سال پرانی ہے اور یہ پہلی دفعہ ہے کہ ہم کسی کوٹھی میں ڈیڑھ سال رہے ہوں' زین اکتا جاتا ہے کہ کیا ایک جیسے رستے ہیں' وہی کمرے' وہی لان' وہی کاریڈور۔ ہر تین ماہ کے بعد سارا پینٹ بدلوا تا ہے اور ڈیکوریشن ہر دوسرے ہفتے۔"

ان کے لہجے سے بے زاری نمایاں تھی۔

"بلکہ کبھی تو لگتا ہے جیسے مجھ سے بھی اکتا گیا ہو پھر میں اپنی بیٹی کے ہاں لاس اینجلس چلی جاتی ہوں۔ ہر چھ ماہ بعد نوکر بدل ڈالتا ہے' پلیز اسے ہولڈ کریں۔ اسے نارمل ہونا ہے میرے لیے۔ اس گھر کے لیے' وہ خود اپ سیٹ ہے۔" ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"ٹیک اٹ ایزی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

بظاہر بہت چھوٹی بیماری تھی لیکن جونک کی طرح لگی تھی اور خود زین العابدین کو تو کیا بلکہ ارد گرد کے سب لوگوں کو پریشان کر رکھا تھا۔ میں پرس اٹھا کر باہر نکل آئی۔

☼ ☼ ☼

آہستہ آہستہ میں اس کی بیماری پہ قابو پاتی جا رہی تھی۔ عجیب مقناطیسی آنکھیں تھیں اس کی بہت زیادہ توجہ اور نرم رویے کی وجہ سے دوسرے بہت سے مریضوں کی طرح وہ میری طرف مائل ہو رہا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ دوسرے مریضوں کی طرح میں اسے نظر انداز نہیں کر پا رہی تھی۔ بلکہ ڈسٹرب تھی۔ کلینک سے واپس آتے ہوئے میں نے گاڑی سرہدانی کے گھر کی طرف موڑلی۔ جانے کس بے چینی کی دوا چاہتی تھی۔ سرہدانی لان میں ہی اخبار پھیلائے بیٹھے تھے۔

"السلام علیکم سر!"

"وعلیکم السلام۔" انہوں نے سر اٹھایا۔ "آؤ۔ آؤ آج کیسے ٹائم نکال لیا۔"

"بس سر۔" بہت دن بعد آنے پہ میں شرمندہ ہو گئی۔

"کیسا جا رہا ہے مشن؟" سر پوچھ رہے تھے۔

"بہت اچھا سر! ہمیشہ کی طرح اچھا۔" میرے لہجے میں سکون اتر آیا۔

"آپ کیسے ہیں سر؟"

"خدا کا بہت شکر ہے۔" ہمیشہ کی سی عاجزی ان کے لہجے میں عود کر آئی۔

ایسے لوگ بھی ہیں' جو "سچے" ہیں۔ میں نے سوچا۔

"اتنے بڑے گھر میں آپ کیا تنہا ہوتے ہیں سر؟" میں نے کانچ کے چاروں طرف پھیلے سناٹے سے ہوتے ہوئے در و دیوار پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"تنہا۔" سرہدانی مخصوص مسکراہٹ سے چہرہ سجاتے ہوئے بولے۔ "اللہ کی ذات پہ انحصار کرنے والا کبھی تنہا نہیں ہوتا۔ لگتا ہے جیسے ہمارے وجود میں موجود روح کے ساتھ اور بھی بہت سی محفلیں جمی ہیں۔ ہر وقت شکر' ہر حال میں شکر' اللہ کی ذات شکر سے اور قریب آجاتی ہے۔"

سرہدانی وجد کی کیفیت میں بولے۔

"سر! لیکن یہ "شکر" بہت مشکل ہے۔ شکر قربانی مانگتا ہے۔ اور قربانی ہنسی خوشی دینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔"

میری بات پہ سرہدانی تھوڑا مسکرائے۔ "دیکھو نا! کومل بیٹے ہم جتنا کچھ کر رہے ہیں اللہ کی رضا کے لیے۔ اور یہ بھی شکر کا ایک طریقہ ہے' ہمارے سامنے ایک مشن ہے اس مشن کو ہم نے ذات کی قربانیاں دے کر چلا رکھا ہے۔ یہ مشن اگر ہم آئندہ نسلوں تک منتقل کردیں گے تو یہ ہمارے شکر اور قربانی کی ایک بڑی مثال ہے۔"

"یس سر! بالکل میرے لیے بھی دعا کرتے رہیں کہ میں ساتھ دے پاؤں۔"

"آمین۔ آمین!" سرہدانی کے لب ہلے اور مجھے لگا جیسے واقعی اللہ قبول کر رہا ہے۔

سرہدانی کی آواز میں ایک تاثیر تھی۔ ان کے پاس پڑھنے والے بہت سے اسٹوڈنٹس ایک مشن لے کر اٹھے تھے۔ آفاق رضوی کہتا تھا کہ "میرے بس میں ہو تو ایک ایک ابنارمل شخص کو پکڑ پکڑ کر لاؤں اور اک دن وہ ہو کہ دنیا اعتماد اور خلوص سے جینا سیکھ جائے۔"

وہ خود بھی واقعی جینے کا ہنر جانتا تھا۔ ہر وقت ہنسنے اور مسکرانے والا یہ شخص بہت سے ادارے ایک ساتھ چلا رہا تھا۔ سرہدانی کی گائیڈنس میں "مشن کلینک" خاص طور پر قابل ذکر تھا جو ہم سب بغیر معاوضہ لیے چلا رہے تھے۔ بغیر لمبی چوڑی فیس کے۔ ہم غریب منشیات کے عادی لوگوں کو نفسیاتی طریقوں سے اس عذاب سے نجات دلا رہے تھے۔ ہم لوگ ہر قسم کی تھیراپی (علاج) اس مریض پہ آزماتے۔ تحلیل نفسی یعنی PSYCHOANALYSIS (کہانی اور واقعات پوچھ کر علاج کرنا) میں' میں ماہر تھی جبکہ فرح شاہنواز ہپناٹزم میں ماہر تھی۔ آفاق رضوی نے PSYCHODRAMA (یعنی ڈراما کرکے علاج کرنا) کی سیٹ سنبھال رکھی تھی۔ زارا بلوچ اور ہمایوں اکبر نے کنڈیشنگ اور لرننگ کے ذریعے طریقہ علاج اپنا رکھا تھا۔ ہمارے ساتھ نعمہ رحمان' فہد حسن اور حمزہ محسن بھی تھے۔ دو دو گھنٹے کی ڈیوٹی ہم "مشن کلینک" میں دیتے۔

ہم سب غریبوں کا نہ صرف مفت علاج کرتے بلکہ اپنی اپنی بساط بھر مالی امداد بھی کرتے۔ اس مشن میں ہم اکیلے نہیں تھے' شہر کے بڑے بڑے امرا اور نیک سیرت روٴسا کے بھی مرہون منت تھے۔ تھراپی کے کسی بھی طریقے کے باوجود اگر مریض بار بار بھٹک جاتا تو ہم اسے سرہدانی کی فیلڈ میں لے جاتے جو SPIRITUALMETHODS (روحانی طریقہ علاج) سے مریض کو اس عذاب سے نجات دلاتے۔ ہمایوں اکبر ہنستا تھا "اگر ابلیس بھی ہمارے مشن کلینک میں آجائے تو آتش بھٹیوں سے گزر کر کندن بن جائے اور عزازیل بن کر اپنی وہی گدی سنبھالے۔"

سرہدانی نے سنا تو جواب دیا۔ "وہ اللہ کا دھتکارا ہوا ہے۔ اور اللہ کا دھتکارا ہوا "مشن کلینک" کے نزدیک نہیں پھٹکتا کیونکہ اللہ نے اس کی ڈور ڈھیلی کر رکھی ہے!"

✼ ✼ ✼

کبھی کبھی بابا اور ماما کے درمیان کی خاموشی سے مجھے بہت ڈر لگتا۔ جانے کیسی گرہ بندھی ہے' دونوں کے ذہن میں جو کھل کر نہیں دیتی۔ بظاہر بہت نارمل لیکن بہت سرد مہری آخر یہ آپس میں ایک ہی بار جھگڑ کیوں نہیں لیتے' اپنی اپنی جگہ دونوں مجھے بہت ٹائم دیتے۔ شاید ایک میں ہی ان دونوں کے تعلق کی ایک کڑی تھی۔ جب سے میں نے ذاتی کلینک کھولا تھا۔ میں نے بھی ان کے بارے میں سوچنا کم کر دیا تھا۔ چھتیس سال ان کے متعلق آگاہی نہ ہونا میرے لیے مسئلہ پیدا کر دیتا لیکن اب میری اپنی مصروفیات تھیں' چائے کے ہلکے ہلکے سپ لیتے ہوئے میں سوچتی جا رہی تھی۔ ٹائم دیکھ کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

مستقل ایک ماہ اور دو ہفتوں کے علاج سے زین العابدین کو "نومیڈیزم" (خانہ بدوشی' ایک جگہ پر نہ ٹھہرنا) جیسی بیماری سے نجات مل گئی تھی لیکن پھر بھی اس کا اسی روٹین سے کلینک آنا میری سمجھ سے بالاتر نہیں تھا۔ میں خود بھی اس کا انتظار کرتی۔ جب تک میں کسی سبجیکٹ پہ کام کرتی تھی وہ آفس میں بیٹھا میرا انتظار کرتا۔ میں اب اسپورڈ نہیں تھی بلکہ چھتیس سالہ ماہر نفسیات کومل حسین تھی۔ لیکن جانے کیا تھا یہ سب؟

آج وہ کلینک نہیں آیا تھا تو بہت عجیب لگ رہا تھا میں گھر واپس آئی تو وار تھتے نے بتایا کہ کوئی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ اپنے کمرے میں پرس رکھ کر لمبے بالوں کی چٹیا میں بل ڈالتے ڈرائنگ روم کی طرف چلی آئی۔ پردہ ہٹاتے ہی مجھے لگا جیسے بہت سارے گلاب میری جھولی میں آن گرے ہوں۔

"السلام علیکم۔" میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"ہیلو۔ کیسی ہیں؟" وہ سیدھا میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"بالکل ٹھیک۔ آپ آج ادھر کیسے آ گئے؟"

میں نے اسے دیکھا وہاں آنکھیں باتیں کر رہی تھیں۔ مجھے لگا کہ جیسے اس نے مجھے ہپناٹائز کر دیا ہے اور مجھے اپنے خیالات کے ساتھ وہاں تک لے جا رہا ہے جہاں تک اس کی رسائی ہو۔ اور میں اس کے ہپناٹزم کے زیر اثر چلتی جا رہی ہوں۔ سایہ دار سبز درختوں والی ٹھنڈی فٹ پاتھ پر چلتے چلتے میرے کپڑے آگ اگلنے لگے ہیں لیکن اس کے وجود کے احساس نے گرمی کے احساس سے نجات دلائی ہے اور جیسے سرخ گلاب میرے رستے میں بچھ گئے ہیں۔ جی چاہتا ہے ننگے پاؤں اس فٹ پاتھ پر چلتی جاؤں۔

"ہوں۔"

کافی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے اپنے ہونے کا احساس دلانا چاہا۔ اسے کیا علم کہ اس کے ہونے کا احساس سورج کی پہلی کرنوں کے ساتھ مجھے بیدار کرتا ہے اور رات گئے تک میرے کمرے کے پردوں اور کھڑکیوں کے شیشوں پر لہرانے والا عکس اسی کا ہوتا ہے۔ وہ شاید میرے چہرے پر سرخ گلابوں کا عکس دیکھ رہا تھا اور یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی "انہونی" ہو گئی ہو۔

"اچھا۔ میں چلتا ہوں۔"

وہ ہنستا ہے۔ میں مسکراتی ہوں۔ وہ ہنستا اچھا لگتا ہے اور میں مسکراتی ہوئی۔ اس لیے کہ مسکرانے میں ایک ترسانے کی کیفیت ہوتی ہے اور ہنسنے میں نچھاور کر دینے کی۔

✼ ✼ ✼

فرح اور آفاق رضوی نے اچانک "شادی" کا اعلان کر کے دھماکا کر دیا اور بقول فضہ کے اس سے بھی بڑا دھماکہ "لو میرج" کا ہے۔ ہم خوش بھی تھے اور کچھ حیران کہ اس قدر کام سے کام رکھنے والے اور "لو میرج" واہ کیا خوبصورت سچویشن ہے۔ ہم میں سے کچھ لوگ فرح کی طرف سے انوائٹ تھے اور کچھ آفاق کی طرف سے۔ میں جیل روڈ پہ کار بھگائے لے جا رہی تھی۔ مدھم مدھم آواز میں اسد امانت علی خان گا رہا تھا۔

ہر ویلے تاہنگاں یار دیاں

مجھے تھوڑا ڈسٹرب دیکھ کر فرح نے غور سے مجھے دیکھا۔ "ہیلو کیا چکر ہے؟"

"کیا مطلب؟" میں بوکھلا گئی۔

میرے کان کے قریب منہ لا کر آہستہ سے بولی۔

"کوئی بات نہیں مائی ڈیر کومل حسین! بہت بڑے بڑے آپریشن کرنے والا سرجن بھی بہت پرہیز کے باوجود کبھی کبھی نزلہ' فلو کا شکار ہو سکتا ہے آخر کو "انسان" جو ہوا۔ یہ الگ بات کہ دوسروں کی نسبت جلد قابو پا لے مگر "کڑوی دوا" کھا کر۔"

"مگر کیا ہوا؟" میں انجان بنتے ہوئے بولی۔

"بنو مت۔ ہم کو دھوکا دیتی ہے بچہ۔ ہم تو دل کا سب حال جانتے ہیں۔" فرح نے ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا اور مجھے واقعی یقین ہو گیا کہ وہ ہپناٹزم کی ماہر ہے۔

"شرم کرو' دلہن ہو کے ایسی حرکتیں کرتی ہو۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ زارا فضہ اسے تیار کرنے لگیں تو میں باہر چلی آئی۔ زرتاب علی اور ہمایوں اکبر اسٹیج سجوانے کے لیے ہدایات دے رہے تھے۔

"کومل سس! آپ وہاں کھڑی ہیں ادھر آئیں نا۔ مل کر گیسٹ ڈیل کرتے ہیں۔" یہ ریما تھی' فرح کی چھوٹی بہن۔

"ان سے ملیں' یہ فرح کی بڑی ڈھیٹ دوست نایاب اسد ہیں' ڈھیٹ اس لیے کہ بچپن سے لے کر اب تک دوست ہیں۔" ریما نے مجھ سے نایاب کو ملواتے ہوئے کہا۔

"ارے تم تو کافی "ایڈیٹ" ہوتی جا رہی ہو۔ شرم کرو میرے کالے بالوں کی۔"

نایاب اسد خاصی حاضر جواب تھی اور اس کے چہرے پہ بسی معصومیت اس سے بھی زیادہ خوبصورت۔

مجھے دیکھ کر کافی لڑکیاں اور ٹین ایجز لڑکے میرے ارد گرد اکٹھے ہو گئے۔ اور میں بہت بردباری سے ہلکی پھلکی مسکراہٹ کے ساتھ ان کی ایک ایک بات کا جواب دے رہی تھی۔ کچھ لوگوں کے ساتھ "مقراوٹ" کا تعلق ہوتا ہے۔ جیسے میرا۔ یہ تعلق بڑا قوی اور توانا ہوتا ہے۔ اگر اس سے آگے نہ بڑھے تو اس کے ماند ہونے کا خطرہ نہیں ہوتا۔ بہت سوں نے میرا ایڈریس لیا۔ فون نمبر اور ٹائم لیا۔ میں سوچنے لگی کہ اس عمر میں بچے اتنے ابنارمل ہوتے نہیں جتنا محسوس کرتے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں۔

"کومل سس! ادھر آئیں نا۔" ریما نے مجھے جھگھٹے میں گھرے دیکھ کر بلایا۔

"فرح تو اس طرح کسی بھی تقریب میں بہت زیادہ ٹائم کسی کو نہیں دیتی اس طرح تو یہ لوگ خواہ مخواہ ڈسٹرب کرتے ہیں۔"

شانوں تک کٹے بالوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے ریما بولی۔

"نہیں بھئی۔ ہمارا تو مشن ہی یہی ہے کہ لوگوں کو ٹائم دیں اور اچھا ڈیل کریں۔ کوئی بھی یہ نہ سوچے کہ وہ کسی بڑے سائیکاٹرسٹ یا کسی بھی فیلڈ میں کسی "بڑے بندے" سے مل نہیں سکتا۔" میں نے دھیمے لہجے میں اسے سمجھایا۔

"واہ کومل سس واہ۔ یہ مشن وشن کلینک چھوڑ کر آیا کریں۔ ایمان سے لگتا ہے کہ سارے "پاگلوں" میں سے ایک اعلا درجے کا پاگل "سائیکاٹرسٹ" بھی ہوتا ہے۔"

وہ ہنستی ہوئی مجھے کھینچتی باہر لے آئی۔ سب سے زیادہ رش شاید اسی عمر میں ہوتا ہے۔ میں مسکرا دی۔ سب سے بھٹکتی ہوئی میری نظر انکل شاہنواز (فرح کے پاپا) سے باتیں کرتے زین العابدین پر جا رکی۔ وہ میری طرف دیکھ کر ہنسا۔ میرے چاروں طرف سرخ گلاب بکھر گئے۔ وہ میری طرف لپکا۔

"آج میں نہیں پوچھوں گا کہ آپ کیسی ہیں؟"

"کل؟" میں حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔

"اس لیے کہ مجھے علم ہے۔ اور مجھے رومن قول یاد آ گیا۔

"اک سچا محب اپنے ساتھی کے نشیب و فراز کو ہی

نہیں جانتا بلکہ اسے ان کا تجربہ بھی ہوتا ہے۔"

"آپ ڈسٹرب کیوں ہیں؟" "میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں تنگ گیا ہوں کسی ایک چیز سے۔ اب اس میں جانے آپ کی شخصیت وجہ ہے یا طرانی (علاج)۔"

اس کی آنکھیں مجھے پھر سے ناپا تازہ کرنے لگیں' میں کھسک آئی' میں اس سے کچھ خوف زدہ تھی شاید لاشعوری طور پہ کہ وہ پھر "نوماڈیزرم" کی طرف نہ مڑ جائے۔ میں اس کے آس پاس رہنے لگی۔ آہستہ آہستہ رگوں میں اترتی ہوئی۔ مسکراتی ہوئی۔ ترسانے والی کیفیت کے زیر اثر تتلی بنی اس کے آگے بھاگتی رہتی اور وہ مجھے پکڑنے کے لیے بے تاب نچھاور ہوتی کیفیت لیے میرے پیچھے بھاگتا ہوا۔

سیما قریشی۔ لاس اینجلس گئی ہوئی تھیں۔ ان کی غیر موجودگی میری معاون بنی' ناشتے سے لے کر ڈنر تک میں اس کی ایک ایک چیز کا خیال رکھتی۔ اس کا لان سرخ گلابوں سے بھر گیا۔ وہ مجھ سے قریب ہوتا گیا اور نوماڈیزرم کہیں دور سورج کے ساتھ ڈوب گیا۔

یہاں موسم بدلتے بھی ہیں۔ بارشوں کا موسم بھی آتا ہے جب کنول سراپا پیاس بن جاتے ہیں اور سفید بطخیں اداس ہو جاتی ہیں تو ایسے میں بارش ہوتی ہے گہرے سبز درخت کھل کر اور سبز ہو جاتے ہیں۔ گھاس نہاتی ہے۔ پھول ہنستے ہیں۔ آج کل میں بہت مصروف تھی۔ وہی ٹھوس اور مضبوط کومل حسین اپنے مشن پر کام کرنے والی۔

سرہدانی کی سائیکالوجی کے متعلق بہت اہم کتاب کی رونمائی کے سلسلے میں ہم اس ہال میں جمع تھے۔ یہ ساری تقریب میں نے اور ہمایوں اکبر نے سرہدانی کے منع کرنے کے باوجود ارینج کرلی تھی۔ شہر کے معززین کے ساتھ۔ زین العابدین کو بھی میں نے خاص طور پہ انوائٹ کیا تھا۔ بابا بھی آج میرے بہت اصرار پہ یہاں موجود تھے زین اپنی تمام تر مردانہ وجاہت اور پہلے سے زیادہ خود اعتماد اور مطمئن چہرے کے ساتھ تقریب میں نمایاں تھا (یا مجھے لگ رہا تھا) بابا نے تقریب کے اختتام پہ پچاس ہزار روپے کا چیک دیا جبکہ زین العابدین نے ایک لاکھ کا چیک پیش کیا۔ میرا قد اور لمبا ہو گیا۔ میں مائیک پہ سب کا شکریہ ادا کرتی اسٹیج سے نیچے اتری۔ یہ تقریب اصل میں مشن کلینک کی مزید شاخیں قائم کرنے کے لیے فنڈز جمع کرنے کے لیے بھی ارینج کی گئی تھی اور یہ ہماری بڑی کامیابی تھی۔ پچھلے دنوں پہلی بار تحلیل نفسی کے ذریعے شیزوفرینیا SchizoFrinia مریض کا علاج کیا تھا اس لیے بھی میں بہت خوش تھی۔

سرہدانی کے پاس کھڑی انہیں میں اپنی سبجیکٹ کے متعلق بتا رہی تھی کہ مجھے اس کی ہنسی کی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ تقریب میں موجود اس کے پاس کھڑی نایاب اسد مسکرا رہی تھی۔

دوسرے روز میں کلینک آئی تو میرے لیے ایک خط رکھا تھا۔ میں نے لفافہ کھولا۔

میری واپسی عرصوں پر محیط تھی۔ ٹھنڈی فٹ پاتھ نے میرے تلوے جلا دیے تھے۔ کنول کہیں کھو گئے تھے۔ سفید بطخیں کہیں اور کوچ کر گئیں۔ پھولوں کی خوشبو سیلن اور گھر کی بو بن کر میرے ارد گرد پھیل گئی۔ گھبرا کر میں باہر نکلی اور گھر کی طرف گاڑی کا رخ کر دیا۔ میں نے کار کا ریکارڈ پلیئر آن کرتے ہوئے اپنے طور پر فرار چاہا مگر وہاں اسد امانت علی خان کی آواز میرے درد میں اضافہ کرتی رہی۔

پھلاں دے رنگ کالے سرخ گلاباں دے موسم وچ

پھلاں دے رنگ کالے۔

میرا درد ودھتا گیا۔

ننگے پنڈے میتوں چھمکاں مارے تے میرے

روندے نیں نین نمانے

(میرے تن میں درد کوڑے مارتا ہے اور میرے بے چارے نین روتے ہیں۔)

جنیاں تن میرے تے لگیاں تینوں اک لگے تاں جانے

(جتنے میرے تن پہ وار ہوئے ہیں اگر تمہیں اک بھی لگتا تو تمہیں علم ہو جاتا کہ وار سہنا کتنا مشکل ہے)

غلام فرید دل اوتھے دیے جتھے اگلا قدر وی جانے

(دل وہاں دینا چاہیے جہاں کوئی قدر کرنے والا ہو)

میری آنکھیں جلنے لگیں۔ واہ کومل حسین! تم ایک میچور چھبیس سالہ ماہر نفسیات۔ تم بھی اندر سے موم سے بنی ایک عام عورت نکلیں۔ میں خود کو مضبوط بنانے لگی۔ کئی دن میں نے سوچنے میں لگائے۔ میرے فرائض اور ذمہ داریاں ابھر کر میرے سامنے آگئیں۔ جنہیں ادا کرنے میں' میں خود کو بڑی اہم نظر آئی۔ ایسے حالات میں اس طرح کی قبولیت اور خود پسندی اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔

☼ ☼ ☼

جب دکھ کی ندیا میں ہم نے

جیون کی ناؤ ڈالی تھی

تھا کتنا کس بل بانہوں میں

اور لہو میں کتنی لالی تھی

کتنے لوگ بچھڑ گئے۔ سرہدانی جیسا پیارا اور شفقت کا منبع خاک نشین ہوا۔

فرح اور آفاق کراچی میں بچوں سمیت سیٹل ہو کر مشن کی ایک شاخ چلا رہے ہیں۔

ہمایوں اکبر ملتان میں ہے۔

زارا اور فضہ شادی کے بعد فیلڈ ہی چھوڑ گئیں۔

میں' میں آج کل خوبصورت ذہن سامنے لا رہی ہوں۔ مجھے لگتا ہے سرہدانی کی روح مجھ میں اتر آئی ہے' اسی لیے تو سب بچے جب بے چین ہوں تو میرے پاس مشورہ لینے آتے ہیں۔

کل فروا مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ اتنے بڑے گھر میں' میں تنہا ہوتی ہوں۔ اور میں نے وہی جواب دیا جو پندرہ سال پہلے سرہدانی نے مجھے دیا تھا۔ بس یہ خوشی ہے کہ میری زندگی بلکہ میری ذات کسی کے کام آئی مگر پھر بھی کبھی کبھی صرف ایک عورت بن جاتی ہوں حالانکہ "شکر" کے سارے دروازے میں نے کھول رکھے ہیں' پھر بھی مجھے زین العابدین کا وہ چند لائنوں کا خط یاد آجاتا ہے جو مجھے ازبر ہے اور جس نے مجھے صبر و شکر کی بہت سی منازل طے کروائیں۔ زین العابدین نے لکھا تھا۔

"میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ آپ کو مجھ سے کسی قسم کی کوئی اذیت پہنچے کیونکہ میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ نہ صرف ایک سائیکاٹرسٹ کے حوالے سے آپ نے میرا علاج کیا بلکہ میرے اسٹینڈ لینے میں آپ میری سب سے بڑی معاون بنیں۔ آپ پہ میں نے تجربہ کیا اور کامیاب رہا کہ بقول آپ کے "نوماڈیزرم" اب مجھ سے کوسوں دور ہے۔ پچھلے دنوں مجھے میری پہلی فیانسی اور میری پہلی محبت (یہ میں نے بہت بعد میں محسوس کیا) نایاب اسد مجھے مل گئی۔ میں اب کامیاب تھا۔ ٹھہرنے والا۔ رکنے والا۔ لیکن سب سے زیادہ میں آپ کا شکر گزار ہوں۔

اب میں اس قابل ہوں کہ نایاب اسد کو پالوں۔ آپ میری "تجربہ گاہ" بنیں۔ آپ کے لیے بہترین زندگی کی دعائیں۔ امید ہے عام سائیکاٹرسٹ کا سا رویہ رکھتے ہوئے آپ مجھے اگنور کر دیں گی۔

آپ کا شکر گزار۔ زین العابدین شاہ"

اس روز میری آنکھ سے آنسو نکل کر "تجربہ گاہ" پہ جا گرے تھے جواب اکثر میرے دل پہ لکھے' ایک عام عورت کے دل پہ لکھے ایک ایک حرف پہ گرتے رہتے ہیں اور عجیب بات ہے کہ مٹنے کے بجائے یہ الفاظ اور چمکنے لگتے ہیں۔

رمشا خالد خان

اسی راستے پر

"آم دے تھلے بہہ کے ہاں! بہہ کے ماہیا وے ماہیا!
کریئے پیار دیاں گلاں ہاں! کریئے پیار دیا گلاں
ہو ہو ہو۔"

ماہ نین آم کے پیڑ کے نیچے بیٹھی گرمی سے بے حال ہوتی گھنٹہ بھر سے تان اڑائے جارہی تھی، مگر ماہیا ہوتا تو آنے کا نام لیتا۔ ماہ مہر عرف ماہی نے کچن کی کھڑکی سے مسکراتی نظروں سے اسے دیکھا اور مڑ کر سکنجبین بنانے لگی۔ جگ میں ڈھیر ساری برف ڈال کر ٹرے میں دو گلاس رکھے اور باہر چلی آئی۔ ٹرے رکھ کر خود بھی دھم سے اس کے قریب بیٹھ گئی۔ نین نے فوراً جگ اپنے قبضے میں کرلیا اور گلاس پر گلاس چڑھاتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ خالی ہوگیا، تب کہیں جاکر حواس قابو میں آئے۔

ماہی نے جب تک ایک گلاس ختم کیا، جگ خالی ہوچکا تھا۔ وہ تیوریاں چڑھا کر اسے گھورنے لگی۔

"اب اتنی گرمی میں بیٹھنے سے پیاس تو لگتی ہے نا!" اس نے انتہائی درجے کی مسکینی خود پر طاری کی۔

"تو کس نے کہا تھا، ساری دوپہر یہاں بیٹھ کر اپنے ان دیکھے ماہیے کا انتظار کرو؟ رنگت دیکھو! جھلس کر کوئلہ ہورہی ہے۔ ایسے میں اگر کوئی بھولا بھٹکا ماہیا ادھر آبھی نکلا تو تمہیں دیکھ کر الٹے پاؤں بھاگنے کی کرے گا۔"

ماہی اس کی حرکتوں سے جلی بیٹھی تھی۔ ایف اے کے پرچوں کے بعد رزلٹ کے انتظار میں طویل

مکمل ناول

چھٹیاں اس بار بھی ناولز پڑھ پڑھ کر کاٹی جارہی تھیں، مگر نین کے دماغ میں نہ جانے کیا خناس سمایا تھا جو وہ قاری بننے کے بجائے ہیروئن بننے پر تل گئی تھی۔ اب کوئی ہیرو ہوتا تب ہی محترمہ ہیروئن کے منصب پر فائز ہوپاتیں، مگر یہ سوچے بغیر وہ روز بن سنور کر تیار ہو کر پائیں باغ میں آبیٹھتی اور شام کو تھک ہار کر جب نامراد واپس اندر جاتی تو آئینہ دیکھ کر خود کو پہچاننے سے انکار کردیتی۔ کاجل گالوں پر تو لپ اسٹک ٹھوڑی پر بہہ رہی ہوتی تھی۔ کل تو عمر نے حد کردی۔ اسے دیکھتے ہی بھوت بھوت کا شور مچادیا۔ یہ تو شکر ہوا کہ کسی اور کے دیکھنے سے پہلے ہی وہ اپنے کمرے میں گھس گئی۔ پھر تیار ہونے سے توبہ ضرور کرلی، مگر یہاں بیٹھنے سے باز نہیں آئی تھی۔

ماہی یہ سوچ کر چپ تھی کہ چار دن کا شوق ہے، مگر آج ——— پانچواں دن ہو چلا تھا اس کا شوق ختم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔

”ویسے نین! ’ٹاہلی‘ دے تھلے تو سنا تھا‘ یہ آم دے تھلے کیا ہے؟“ برتن سمیٹ کر اٹھتی ماہی اچانک کچھ یاد آنے پر پھر سے بیٹھ گئی۔

”کیا میں تمہیں بے شرم دکھتی ہوں؟“ جواباً ”وہ اتنے زور سے چلائی کہ ان کے قریب گھاس کریدتی چڑیا بھی اڑ گئی۔

”میں سمجھی نہیں۔“ نا سمجھی کی تحریر ماہی کی آنکھوں میں واضح تھی۔

”تمہیں گھر میں کوئی ٹاہلی کا درخت نظر آرہا ہے؟“ اسے سمجھاتے ہوئے وہ انتہائی درجے کی سنجیدگی خود پر طاری کیے ہوئے تھی۔ ماہی نے ارد گرد نظر دوڑائی۔ باغ کے بیچوں بیچ آم کا درخت تھا۔ بائیں طرف قطار میں جامن، مالٹے، بیر، انار، سیب اور کیلے کے درخت تھے۔ دائیں طرف گلابوں کی کیاریاں تھیں، جن میں ہر رنگ کے گلاب تھے۔ سامنے والی دیوار کو ایک طرف سے انگور اور دوسری طرف سے فالسے کی بیلوں نے سجا رکھا تھا، مگر جہاں دیوار ختم ہوتی تھی۔ وہاں سے ٹاہلی کی گھنی شاخیں اندر جھانک رہی تھیں، مگر درخت باہر سڑک پر تھا، گھر کے اندر نہیں۔

”نہیں۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

”تو کیا میں اتنی بے شرم ہوں کہ باہر سڑک کنارے ٹاہلی تھلے بیٹھ کر اپنے ماہیا سے ملوں گی؟“ ہاتھ نچانے کے ساتھ ساتھ اس نے زوردار دھپ بھی ماہی کو رسید کی۔ اس سے پہلے کہ وہ جوابی کارروائی کرتی طوطے کی ٹھونگوں سے کیری ٹوٹی اور سیدھا بھاگنے کی تیاری کرتی نین کے سر پر بجی۔ ماہی کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی۔ اس کے سر پر تارے ناچ رہے تھے۔ اوپر سے ماہی کے بے ساختہ قہقہے۔ وہ روہانسی ہوگئی۔

”نین! ایک تو تم حساس بہت ہو۔ ارے! ایسی سچویشن کو تو انجوائے کرتے ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں نمی اترتے دیکھ کر اس نے بمشکل اپنی ہنسی روکی۔

”مگر دوسروں پر بیتنے والی۔“ وہ جل کر بولی۔ ”اپنے سر پر لگتی نا تو لگ پتا جاتا۔“ وہ کیری اس کی طرف اچھال کر سر سہلانے لگی۔ ماہی مزے سے نیچ کر کے پائپ سے دھو کر دانتوں سے کترنے لگی۔

”گلا خراب ہوجائے گا۔“ للچائی نظروں سے کیری کو دیکھتے ہوئے نین نے اسے ٹوکا۔

”ہوجانے دو۔“ اس نے کان پر سے مکھی اڑائی۔ اس کے چٹخارے زیادہ دیر نین سے برداشت نہ ہوئے۔ فوراً“ قریبی ڈال سے خوب سبز کیری اچک کر توڑلی۔ اگلے چند لمحوں میں آنکھیں میچ میچ کر چٹخارے بھرتے ہوئے دونوں پھر سے شیر و شکر ہوچکی تھیں۔

رخصت ہوتی دھوپ دیواروں کی منڈیروں پر ٹنگی تھی۔ ساری دوپہر ستانے کے بعد پرندے بھی ٹھکانوں سے نکل کر خوب شور مچارہے تھے۔ ماہی آم کے تنے سے ٹیک لگائے اوپر درخت پر چونچوں سے لڑتے طوطوں کی لڑائی دیکھنے لگی۔

”ہک ہا‘ ہماری بھی کیا قسمت ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے، جس میں ایک ہیرو تک کا گزر نہیں۔“ نین کا بھوت اب ماہی کے سر پر سوار ہورہا تھا۔

”مٹی ڈالو! ایسی باتیں بس کہانیوں میں اچھی لگتی ہیں۔ حقیقی زندگی میں کہیں سے ہیرو نہیں ٹپکتے۔“ وہ ناک تک بے زار ہوچکی تھی۔

”ویسے نین! لازمی تو نہیں ہیرو درآمد ہی ہو، برآمد بھی تو ہوسکتا ہے۔“ کچھ سوچتے ہوئے ماہی نے آنکھیں مٹکائیں۔

”کیا تم امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس شروع کرنے لگی ہو؟“ اس کی بے تکی بات سن کر نین کے پتنگے تو لگی پڑا تھا۔

”اف! ایک تو تمہاری عقل نہ جانے کن چراگاہوں کی سیر کو نکلی رہتی ہے۔ میرا مطلب تھا‘ تمہارا ماہیا لازمی تو نہیں کہ کہیں باہر سے آئے۔ گھر میں بھی تو ڈھونڈا جاسکتا ہے۔“ اپنی بات پوری کرکے وہ داد طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگی‘ جبکہ نین نے اسے یوں گھورا جیسے اس کی دماغی حالت پر شک ہو۔

”مجھے آپا جان نہیں ہیروئن بننا ہے۔ چھوٹے چاچو کے فیڈر پیتے بچو نگڑے‘ تمہیں ہی مبارک ہوں۔“ وہ چمک کر بولی۔

”تمہاری قریب کی نظر واقعی خراب ہے۔ ارے! ان بچو نگڑوں کی بات کون کر رہا ہے؟ میں تو شاہ گل بھیا کی بات کر رہی ہوں۔ لمبا چوڑا‘ ہینڈسم‘ اکڑو‘ بارعب۔ ہیرو کی ہر خصوصیات سے لبریز بندہ گھر میں موجود ہے اور تم باہر سے امیدیں لگائے بیٹھی ہو۔ کمال ہے! یہ خیال پہلے میرے زرخیز ذہن میں کیوں نہیں آیا؟“ خود کو تھپکی دیتے ہوئے اس نے جوش میں نین کو جھنجھوڑ ڈالا‘ جسے شاہ گل کا نام سنتے ہی سکتہ ہوگیا تھا۔

”ماہی! کدھر رہ گئی؟ ہمنہ بھر پہلے تجھے تیل ڈالنے کا کہا تھا۔ کیا جن اٹھا کر لے گئے؟“ اس سے پہلے کہ کوئی اور بات ہوتی‘ دادی کی آواز آئی۔ ماہی سر پر ہاتھ مار کر اندر بھاگی‘ جبکہ نین اس کی بات کے زیر اثر ابھی تک چپ کی چپ بیٹھی تھی۔

☆ ☆ ☆

”تم لوگ واقعی میرے بغیر چلے جاؤ گے؟“ نین نے سامان پیک کرتی ماہی سے دسویں بار پوچھا۔

”دل تو نہیں چاہتا تمہیں چھوڑ کر جانے کو‘ مگر کیا کروں مجبوری ہے‘ اگر میں نہ گئی تو مارگلہ کے پہاڑ میرے بغیر کیا کریں گے؟ دامن کوہ سے شہر کا نظارہ کون کرے گا؟ ڈیم کا پانی اسی غم میں کئی فٹ نیچے اتر جائے گا۔ شاپنگ مالز کی رونقیں ماند پڑجائیں گی۔ سب سے بڑی بات اسلام آباد اور مری کے آئس کریم پارلرز کی آئس کریم کا کیا ہوگا جو میرے پیٹ میں جانی ہے۔“ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر فلمی انداز میں شروع ہوگئی۔

نین نے جل کر پاس پڑا کشن اسے دے مارا‘ مگر نشانہ ہمیشہ کی طرح خطا گیا۔ کشن ماہی کے پاس سے ہوتا ہوا دروازہ کھول کر اندر آتے زین کا منہ چوم گیا۔ ماہی کی ہنسی بے ساختہ تھی۔ اس نے جلدی سے کروٹ بدل لی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو ہنگامہ کھڑا کردیتا‘ مگر آج اس کی طبیعت خرابی کا لحاظ کر گیا۔

”ہم سیرو تفریح کے لیے جارہے ہیں‘ مستقل ٹھکانا کرنے نہیں جو تم اتنا بڑا بیگ تیار کیے بیٹھی ہو۔“ وہ سامان لینے آیا تھا۔ اس کا اتنا بڑا بیگ دیکھ کر تپ گیا۔

”تمہاری طرح آدھی چیزیں گھر رکھ کر جانے اور وہاں ایک ایک سے مانگتے پھرنے کا کوئی شوق نہیں مجھے‘ اس لیے اپنی ضرورت کی تمام چیزیں ساتھ لیے جارہی ہوں۔“ زین اور ماہی اکٹھے ہوں اور جھگڑیں نہ لڑیں ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا۔

”اپنے لاؤڈ اسپیکر کھولنے سے پہلے ارد گرد دیکھ بھی لیا کرو۔ یہاں ایک مریضہ بھی ہے جسے آرام و سکون کی سخت ضرورت ہے۔“ وہ بہت چڑچڑی ہورہی تھی۔

زین کچھ کہے بغیر ماہی کا بیگ لے کر چلا گیا۔ چھوٹے چاچو بزنس کے سلسلے میں اسلام آباد جارہے تھے‘ چونکہ اسکول و کالجز سے چھٹیاں تھیں‘ اس لیے وہ بھی تیار ہوگئے‘ مگر برا ہو نین کے سالانہ بخار کا وہ سارا سال فٹ رہتی تھی‘ مگر سال میں ایک بار

شدید بخار آتا تھا' جسے گھر والوں نے "سالانہ بخار" کا نام دے چھوڑا تھا۔ اب بھی اسی وجہ سے وہ ان کے ہمراہ نہیں جارہی تھی اور اس کا جتنا بھی غم مناتی' کم تھا۔ تکیہ اب بھی اس کے منہ پر تھا۔ ماہی چند لمحے اسے دیکھتی رہی' پھر اس کے قریب آبیٹھی۔ تکیہ ہٹایا۔ حسب توقع اس کا چہرہ بھیگا تھا۔

"اگر تم کہو تو میں واقعی نہیں جاتی۔" اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے اس کے لہجہ میں خلوص ہی خلوص تھا۔

"اگر تم نہیں جاؤگی تو میرے لیے شاپنگ کون کرکے لائے گا؟" وہ بدقت مسکرائی۔

"شکر ہے! تم نے "ہاں" نہیں کی۔ میں کون سا سچ کہہ رہی تھی۔" وہ فوراً "اپنے جامہ میں واپس آئی۔

نین مسکرانے لگی۔ جانتی تھی دو' چار آنسو بہائے تو واقعی اپنا جانا ملتوی کردے گی' بظاہر دونوں کی نوک جھونک چلتی رہتی تھی' مگر اس کے باوجود ایک جان دو قالب کی عملی مثال تھیں۔

پھر جانے سے پہلے سب اس کے کمرے میں اس سے ملنے آئے۔ ڈھیروں گفٹ اور چاکلیٹ لانے کے وعدے کیے اور نیک تمنائیں دے کر رخصت ہوگئے۔ جوں ہی گاڑی نے گیٹ کراس کیا' اس کی آنکھیں بہنے لگیں' مگر دادی کی آمد نے سیلاب پر بند باندھ دیا۔ وہ دیر تک اس کے پاس بیٹھی اس کا دل بہلاتی رہیں' یہاں تک کہ نیند نے اسے ہر غم سے بے نیاز کردیا۔

☆ ☆ ☆

بخار اتر چکا تھا' لیکن پورا ہفتہ بیڈ پر پڑے رہنے کی وجہ سے طبیعت میں بہت کسل مندی تھی۔ پورا گھنٹہ شاور لینے کے بعد باہر آئی تو اپنا آپ خاصا ہلکا پھلکا لگ رہا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر طائرانہ نظروں سے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ سفید در و دیوار' نیوی بلیو کارپٹ و پردے' دو بیڈ' دو الماریاں' ایک ڈریسنگ ٹیبل' باغ میں باغ کو کھلتی بڑی سی کھڑکی۔ اس کے اور ماہی کے مشترکہ کمرے میں کچھ بھی تو نیا نہیں تھا۔ وہ بے زار ہوکر باہر نکل آئی۔

پورے گھر میں سناٹا تھا۔ وہ بے مقصد ادھر ادھر گھومنے لگی۔ کچن میں جھانکا۔ امی اور بڑی امی کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔ سکھاں ان کی مدد کررہی تھی۔ وہ دادی کے پاس آکر ان سے باتیں کرنے لگی۔ وہ گاؤں کے قصے لے بیٹھیں۔ "سو بار کی سنی باتیں" وہ دل نہ چاہتے ہوئے بھی دلچسپی چہرے پر سجائے سنتی رہی۔ ماہی اور زین تو ان کی باتوں کے درمیان ہی جمائیاں لے کر سو جاتے تھے۔ ایسے میں نین ہی تو تھی جو ان کی دل آزاری کے خیال سے پوری توجہ سے سامع کے فرائض انجام دیتی تھی' اس لیے انہیں پیاری بھی بہت تھی۔

ہمارے ابا سائیں خان پور کے بہت بڑے زمیندار تھے۔ بڑی خواہش تھی اولاد نرینہ کی' مگر قسمت میں دو بیٹیاں ہی لکھی تھیں۔ چچا سائیں کے دو بیٹے تھے۔ جوں ہی آپا کو سولہواں سال لگا' ان کی شادی کردی اور ساتھ میں میری منگنی بھی۔ خیر! ہم دونوں کو ہی کون سا سات سمندر پار جانا تھا۔ حویلی کے ایک حصہ سے نکل کر چچا سائیں کے حصے میں ہی تو آنا تھا۔" وہ ہنسیں۔ نین کو بھی ان کا ساتھ دینا پڑا۔

"تمہارے دادا کو کاروبار کا بڑا شوق تھا۔ شادی کے بعد جوں ہی بڑوں نے پیچھے آنکھیں بند کیں' انہوں نے زمینیں بیچیں اور شہر آبسے تمہارے تایا حسن' باپ احسن اور پھوپھو حسنہ تو حویلی میں پیدا ہوئے تھے۔ سب بچوں کی پیدائش پر جشن منائے گئے تھے۔ تین دن تک حویلی کے باہر دیگیں چڑھتی رہی تھیں' البتہ تمہارے چھوٹے چچا حسین ادھر شہر میں ہوئے تھے۔"

"دادی! بڑی دادی کے تو درجنوں پوتے' پوتیاں' نواسے' نواسیاں ہیں۔ آپ کا دل نہیں چاہتا کہ آپ کے بھی ڈھیر سارے ہوتے؟" اس نے پھر نامحسوس انداز میں بات بدل دی تھی۔ دادی کی ادی کو وہ سب بڑی دادی کہتے تھے۔

"ہوا کیوں نہیں دل چاہتا' مگر میرے بچے مجھ سے زیادہ منصوبہ بندی والوں کے سگے ہیں۔ "بچے دو ہی اچھے" کے اصول پر عمل کرنے کا ٹھیکہ گویا انہوں نے ہی لے رکھا ہے۔ حسن کے ہاں شاہ گل اور ماہ مہر' حسنہ کے ہاں طلال اور در شہوار' احسن کے ہاں زین اور تم۔ مجال ہے جو کوئی دو سے آگے بڑھا ہو۔ حسین سے تو مجھے بڑی امیدیں تھیں' مگر عمر اور عزیز کے بعد وہ بھی "بچے دو ہی اچھے" کہتا پھرتا ہے۔ خیر! ناشکری کیوں کروں۔ یہ بھی اللہ سائیں کا بڑا کرم ہے جو اس نے اولاد کی خوشیاں دکھائیں۔ کوئی حسرت دل میں باقی نہ رکھی۔" وہ شاد سی بولیں۔ "اچھا! تم جاؤ' مجھے نیند آرہی ہے۔ ذرا کمر سیدھی کرلوں' پھر نماز کا وقت ہوجائے گا۔"

انہوں نے تپائی کی دراز میں سے مٹھی بھر بادام نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمائے۔ وہ مسکراتے ہوئے پچھلے برآمدے کی سیڑھیوں پر آبیٹھی۔ اب کی بار درختوں پر خوب بور آیا تھا۔ پھل بھی خوب لگا تھا۔ پہلے کی نسبت زیادہ پرندوں نے ان پر گھونسلے بنائے تھے۔ وہ ایک درخت سے دوسرے درخت کو لپکتے پرندوں کا کھیل دلچسپی سے دیکھتی رہی' پھر بے زار ہوکر اٹھ گئی۔ اندر وہی سناٹے تھے۔ امی اپنے کمرے میں الماری درست کرنے میں مصروف تھیں۔ وہ بیڈ پر آڑی ترچھی لیٹ کر انہیں دیکھتی رہی۔ الماری کے نچلے خانے میں ڈھیروں پرانے رسالے رکھے تھے۔ لاؤنج میں بیٹھ کر رسالہ کھولتے ہی اسے شاہ گل کا خیال آیا۔ ماہی کی باتیں پھر سے کانوں میں گونجنے لگیں۔ پہلے پہل اسے یہ عجیب لگا تھا۔

"وہ مجھ سے آٹھ سال بڑے ہیں۔ ان کے بارے میں ایسا سوچا جاسکتا ہے بھلا؟" بخار میں پھنکتے' راتوں کی تنہائی میں' یہ سوچتے سوچتے وہ کب شاہ گل کو سوچنے لگی' اسے پتا بھی نہیں چلا اور ان کے بارے میں سوچنا اسے اچھا لگنے لگا۔ اس ایک ہفتے میں اس نے ان کے متعلق اتنا سوچا تھا کہ اب یہ عالم ہوگیا تھا' ان کا نام ذہن میں آتے ہی خوب صورت مسکراہٹ ہونٹوں کا احاطہ کرلیتی تھی۔ اب بھی رسالہ اس کی گود میں کھلا تھا اور وہ سامنے آویزاں تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ اونچے' لمبے' ہینڈسم' بارعب سے شاہ گل واقعی کسی ہیرو سے کم نہیں تھے۔ تصویر دیکھتے ہوئے اسے یوں لگا تھا جیسے انہیں پہلی بار دیکھ رہی ہو۔

کچی عمر کے سپنے بڑے پکے ہوتے ہیں۔ کچی عمر کے یہی پکے سپنے اس کی آنکھوں میں پنجے گاڑ رہے تھے۔ دل کی منہ بند کلی چٹک رہی تھی اور اسے یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"شاہ گل۔" اس نے زیر لب دہرایا۔ بھیا کا لاحقہ لگائے بغیر یہ نام کتنا نیا لگتا تھا۔ وہ چمکتی آنکھوں سے مسکرانے لگی۔

☆ ☆ ☆

ابھی ابھی ماہی کا فون آیا تھا۔ وہ بتا رہی تھی کہ چاچو کا کام لمبا ہو گیا ہے' اس لیے انہوں نے وہاں قیام بڑھا دیا ہے' مگر نین کو بالکل برا نہیں لگا۔ کل رات ہی تو لاہور گئے ہوئے شاہ ظل کی واپسی ہوئی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی ساری بے زاری اڑن چھو ہو چکی تھی۔ گھر کا ہولاتا سناٹا ایک دم سے خوشگوار لگنے لگا تھا۔ گنگناہٹیں تھیں کہ رکنے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ دوپہر میں بھرپور نیند لینے کے بعد وہ پائیں باغ میں چلی آئی۔ کیاریوں میں پائپ لگا تھا۔ وہ پانی سے لبالب بھر چکی تھیں۔ نہ جانے مالی بابا کہاں تھے۔ وہ پائپ لے کر درختوں کے پاس چلی آئی۔ پائپ کا سرا دبا کر لمبی چپٹی پانی کی دھار سے درختوں کو نہلانے لگی۔ جس درخت کی طرف لہراتی چڑیاں پھر سے اڑ جاتیں۔ کچھ بھیگ کر جھٹکے سے پر کھول کر خود کو خشک کرنے لگتیں۔ اسے اس کھیل میں مزا آنے لگا۔ کیریوں پر جمے قطروں پر سورج کی زرد کرنیں چمک کر انہیں جھلملا رہی تھیں۔ درختوں کے ساتھ لٹکے کنگوروں میں پانی گرم تھا' چڑیاں کنارے بیٹھ کر بے بسی سے دیکھ رہی تھیں۔ سو وہ پانی بدلنے لگی۔

"آم دے تھلے بہہ کے' ہاں! بہہ کے' ماہیا وے ماہیا! کریے پیار دیاں گلاں۔"

ساتھ ساتھ اپنی مخصوص تان بھی اڑائے جا رہی تھی۔ بیر کے درخت کے ساتھ لٹکا پانی کا پیالا ایک تو بہت اونچا تھا' دوسرا نہ جانے کیسے ٹہنی پر سے بل کھا کر الٹا ہوا تھا۔ وہ پیروں کے بل اٹھ کر بھی اسے سیدھا نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ اچھل اچھل کر اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ ہاتھ تو وہاں تک پہنچ جاتا' مگر جوں ہی سیدھا کرنے لگتی' قدم دوبارہ زمین چھو لیتے۔

وہ کمر پر ہاتھ ٹکا کر بے بسی سے اسے گھور رہی تھی' جب پیچھے سے کسی نے ہاتھ بڑھا کر سیدھا کر دیا۔ وہ جھٹکے سے مڑی۔ پیچھے شاہ ظل کھڑے تھے۔ چھ فٹ لمبا قد' وہ تو بمشکل ان کے کندھوں تک آتی تھی۔ چھتری کے نیچے ان کی مخصوص کرسی پر کتاب اوندھی پڑی تھی۔ وہ اکثر شام کو مطالعے کے لیے ادھر آ بیٹھتے تھے۔ جب وہ آئی تھی۔ تب تو نہیں تھے' مگر نہ جانے کب ادھر آ بیٹھے' اسے پتا تک نہیں چلا۔ وہ اپنے گلا پھاڑ کر اوٹ پٹانگ گانے پر خجالت سے سرخ ہو رہی تھی۔ جلدی سے کمر کے گرد کسا دوپٹا کھول کر پھیلاتے ہوئے ان کی طرف دیکھا' مگر وہاں سنجیدگی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

"اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

"انہیں میری بیماری یاد رہی؟" دل زور سے دھڑکا۔

"جی! اب ٹھیک ہوں۔"

"میرے لیے چائے لے آؤ۔" مڑتے ہوئے حکم دیا۔ وہ فوراً کچن کی طرف بھاگی۔ پوری پانچ الائچیاں ڈال کر خوب دل لگا کر بڑا سا مگ بنایا اور انہیں لا تھمایا' پہلا گھونٹ بھرتے ہی ان کی تیوری پر بل سا آیا۔ وہ بغور ان کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھی۔

"کیا اچھی نہیں بنی؟" اس نے بڑی آس سے پوچھا۔

"نہیں! ٹھیک ہے۔ جاؤ تم۔" ایک نظر اس پر ڈال کر مگ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے انہوں نے کتاب سامنے کر دی۔ اس کی چپلوں میں مٹی گھسنے سے اسے پاؤں میں خارش ہو رہی تھی۔ کونے میں بنے ہینڈ پمپ سے پاؤں اور چپل دھونے کے بعد مڑی۔ کرسی خالی تھی۔ چائے کا مگ میز کے کنارے دھرا تھا۔ اس نے قریب جا کر دیکھا' وہ بھرا ہوا تھا۔ شاہ ظل نے شاید وہی دو گھونٹ لیے تھے۔ اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔ کچھ سوچ کر مگ ہونٹوں سے لگایا۔ الائچیوں کی زیادتی نے عجیب سا ذائقہ کر دیا تھا۔

"میری دل آزاری نہ ہو' اس لیے انہوں نے دوسرا گھونٹ بھرا۔" وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔ خوش فہمی سی خوش فہمی تھی۔ چائے کا مگ ہاتھ میں لیے نم آنکھوں سے ہنستی لڑکی کو کھڑکی بند کرتے شاہ ظل نے بہت غور سے دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اس زین کے بچے نے تو مجھے بے حد تنگ کیا۔

میری بدقسمتی جو میں لفٹ چیئر پر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ذرا جو لطف اندوز ہونے دیا ہو۔ سارا راستہ ہولاتا رہا۔" پھر ماہی اس کی نقل اتارنے لگی۔

"ماہی! تم یہاں سے نیچے گر گئیں تو سات جگہوں سے ٹانگ کی ہڈی ٹوٹنے کا خدشہ ہے۔ ویسے گردن کی ہڈی بھی ٹوٹ سکتی ہے۔ خیر! تم فکر نہ کرو' میں ڈاکٹر کس لیے بن رہا ہوں۔ میڈیکل کے فرسٹ ایر میں ہوں تو کیا ہوا۔ تمہارا پوسٹ مارٹم اتنا اعلا کروں گا۔ تمہاری روح تک اش اش کر اٹھے گی۔" وہ زین کے الفاظ دہرا رہی تھی۔ نین یہ سب غائب دماغی سے سن رہی تھی۔

"ہونہہ! میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کا ادھر بیٹھے بیٹھے پوسٹ مارٹم کر دوں۔ شکر کرو! جاتے وقت ناخن کاٹ کر گئی تھی' ورنہ منہ نوچ لیتی اس کا۔ سارا راستہ یہی باتیں کرتا رہا۔ یہاں سے گر کر فلاں ہڈی ٹوٹ گئی تو فلاں آپریشن ہو گا۔ یہ ہو گیا تو وہ ہو گا۔ پتا نہیں کیا سوچ کر چاچو اتنا پیسہ اس پر برباد کر رہے ہیں۔ اسے تو ڈنگر ڈاکٹر ہونا چاہیے تھا۔"

وہ پوری طرح جلی بیٹھی تھی۔ رات ہی ان کی واپسی ہوئی تھی۔ اب بیج شاپنگ دکھاتے ہوئے ایک ایک پل کی تفصیل نین کو سنائے جا رہی تھی۔

"کیا کہا؟ مجھے ڈنگر ڈاکٹر ہونا چاہیے تھا؟ مجھے۔ یعنی زین احسن کو؟" اس کی باتیں سن کر اندر آتے زین کی آواز صدمے سے پھٹ ہی تو پڑی تھی۔

"بالکل! کیونکہ ڈنگروں کو ہی تم جیسے ڈنگر کی ضرورت ہوتی ہے' انسانوں کو نہیں۔" وہ لڑنے کے لیے پوری طرح تیز کیے بیٹھی تھی۔

"کوئی شوق نہیں مجھے جاہلوں کے ساتھ بحث کرنے کا۔ دادی ناشتے پر انتظار کر رہی ہیں' یہی بتانے آیا تھا۔" وہ لٹھ مارتے لہجے میں کہہ کر چلا گیا۔ زین' شاہ ظل کے چھ سال بعد پیدا ہوا تھا' سو پورے گھر میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا' مگر اس کی وی آئی پی حیثیت ایک سال بعد ماہ مہر کی پیدائش کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بچپن سے اس سے چڑتا تھا۔ زین کے پیچھے نین ست قدموں سے باہر بڑھ گئی۔ ماہی اس کی پشت کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

"یہ نین کو کیا ہو گیا؟ اتنی کھوئی کھوئی کیوں ہے؟ کہنا کچھ چاہتی ہے' منہ سے کچھ نکلتا ہے۔ کہیں بخار کا اثر دماغ پر تو نہیں ہو گیا؟" سر جھٹک کر ڈائننگ ٹیبل پر اس کے ساتھ آ بیٹھی۔

"السلام علیکم!" اندر آتے شاہ ظل نے سب کو مشترکہ سلام کرتے ہوئے دادی کے سامنے سر جھکایا۔ اسے دیکھتے ہی نین کے چہرے پر چمک سی آ گئی۔ اسے بغور دیکھتی ماہی ٹھٹکی' پھر ناشتے کے دوران اس کی نظریں نین پر رہیں اور نین کن انکھیوں سے شاہ ظل کو دیکھتی رہی۔

ماہی چکرا کر رہ گئی۔ دس دنوں میں اتنا بڑا انقلاب۔ ناشتے کے فوراً بعد اس نے نین کو جا لیا۔ وہ کچھ دیر ٹال مٹول کرتی رہی' مگر کب تک؟ سامنے بھی ماہی تھی۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا' نہ تم میری توجہ ان کی طرف دلاتیں اور نہ یہ سب ہوتا۔" اس نے بھی سارا الزام اس کے سر تھوپ دیا۔

"ہاں تو' دعائیں دو مجھے جس کی وجہ سے تم ہیروئن کے منصب پر فائز ہوئیں۔" ماہی نے فرضی کالر اٹھائے۔ وہ بس ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئی۔ اس کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی۔

"کچھ سوچا بھی ہے اب آگے کیا کرنا ہے؟"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ بھیا کا دل کیسے جیتنا ہے؟" وہ بے حد پرجوش تھی۔

"کیا یہ بھی کرنا ہو گا؟" وہ پریشان ہوئی۔

"یہ پوچھو! کیا نہیں کرنا ہو گا۔ میں ہوں نا' میں سوچتی ہوں کچھ۔" اس نے نین کی پیٹھ تھپتھپا کر تسلی دی۔

"کیوں نا انہیں روز کارڈ اور پھول بھیجے جائیں؟" ماہی نے چٹکی بجائے۔

"اوں ہوں! بہت گھسا پٹا آئیڈیا ہے۔" نین نے

فوراً" مسترد کیا۔

"تو اپنے سے آٹھ سال بڑے کزن سے محبت کرنا کون سا نیا آئیڈیا ہے؟ یہ اس سے بھی گھسا پٹا آئیڈیا ہے۔ ہر دوسرے ناول میں یہی ہوتا ہے۔" اپنا آئیڈیا مسترد کیا جانا اسے بالکل نہیں بھایا تھا۔

"محبت چھوٹائی بڑائی نہیں دیکھتی اور نہ ہی محبت کرنا اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔"

"کم از کم ڈائیلاگ ہی نیا بول لو جدت پسند بی بی!"

"تم ناراض تو نہ ہو ماہی! خود ہی سوچو! گھر میں صرف میں ہی واحد کزن ہوں۔ ایسا کچھ کیا تو ان کا پہلا شک میری طرف جائے گا۔ اگر انہیں پتا چل گیا تو..." اس نے جھرجھری لی۔

"بھئی! یہ تو تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ اب میں جو کہوں، تمہیں کرنا پڑے گا، ورنہ تم جانو اور شاہ ظل بھیا جانیں۔ میرا کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔"

وہ ہاتھ جھاڑ کر اٹھنے لگی تو نین نے بازو سے پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا۔

"اچھا! ٹھیک ہے، مگر کارڈ اور پھول نہیں۔ کچھ اور سوچو۔"

"یہ ہوئی نا بات۔" ماہی زور و شور سے سوچ کے گھوڑے دوڑانے لگی۔ نین چپ چاپ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

☆ ☆ ☆
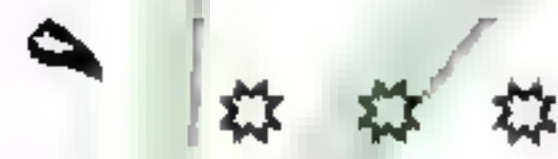
"نین! نینی! کہاں ہو تم؟" ماہی دور سے آوازیں دیتے ہوئے اندر آئی۔ وہ سو رہی تھی۔ ماہی کمر پر ہاتھ ٹکا کر گھورنے لگی۔

"آج عمامہ آنٹی کے بیٹے کا عقیقہ ہے۔"

"تو؟ میں نے جا کر دیگیں چڑھانی ہیں یا ٹینٹ لگانے ہیں؟" ایک ہاتھ سے جمائی روکتے ہوئے وہ تپائی پر سے گلاس اٹھا کر پانی پینے لگی۔

"ہک ہا! اتنی قابل ہو تمہیں تو پھر غم کس بات کا تھا۔" ماہی نے مصنوعی آہ بھری۔

"اچھا! پہلے میری پوری بات سن لو۔" اسے لب کھولتے دیکھ کر وہ جلدی سے بولی۔

"دادی سمیت گھر کی ساری خواتین ادھر جا رہی ہیں۔ دادی نے تو ہمیں بھی ساتھ چلنے کو کہا، مگر میں نے موڈ نہ ہونے کا کہہ کر ٹال دیا ہے۔ اب ڈنر پر ہم دونوں کے علاوہ صرف شاہ ظل بھیا اور زین کے کوئی نہیں ہوگا۔ بھیا کو امپریس کرنے کا یہ بہت اچھا موقع ہے۔"

"مگر کیسے؟"

"کہتے ہیں مرد کے دل کا راستہ معدے سے ہو کر جاتا ہے۔"

"معدہ اور دل... کتنا عجیب امتزاج ہے۔" نین نے ناک چڑھائی۔

"یہ سب چھوڑو! تم ڈنر کی سوچو۔ آج انہیں ایسا ڈنر کراؤ کہ معدے کے راستے سیدھے دل میں پہنچ جاؤ۔" اس نے آنکھیں مٹکائیں۔

"مگر مجھے تو چپس، پکوڑوں اور چائے کے سوا کچھ بنانا نہیں آتا۔" اسے نئی پریشانی نے آگھیرا۔

"یوں کرتے ہیں، نان بازار سے منگوا لیتے ہیں۔ میں بہت اچھے پکوڑے اور ساتھ میں پودینے کی چٹنی بنا دیتی ہوں۔ تم سلاد بنا دینا۔ رات پاپا آئس کریم لائے تھے۔ میٹھے میں وہی رکھ لیتے ہیں۔ کھانے کے بعد میں اچھی سی چائے بنا لاؤں گی۔" وہ جھٹ پٹ مینو ترتیب دے کر داد طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

"ایسے ڈنر پہ وہ ایک نظر ڈالنے کے بعد دوسری ڈالنا تک گوارا نہیں کریں گے۔ ہونہہ! بڑی آئیں پکوڑوں اور چٹنی کے ذریعے دل تک پہنچنے والی۔ میرے بغیر نہ جانے کیا ہوگا تمہارا۔" وہ سر پیٹ کر رہ گئی۔

"تو پھر؟" وہ داد طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"اس وقت تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟"

"کیوں؟"

"سوال نہیں، جواب۔"

"پانچ سو روپے، مگر تمہیں ادھار کسی صورت نہیں دوں گی۔" اس نے خبردار کیا۔

"ادھار تو تمہیں مجھ سے لینا پڑے گا۔ بھلا پانچ سو روپے میں کسی اچھے ریسٹورنٹ سے ڈنر آسکتا ہے؟"

ماہی اس کے بیڈ کے نیچے سے چابی اٹھا کر پیسے نکالنے لگی۔

"مگر ماہی! یہ تو غلط ہے' سراسر دھوکا۔" وہ پریشان سی اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی' مگر ماہی نے منہ پر انگلی رکھ کر آنکھیں دکھائیں۔

اسے چپ ہونا پڑا۔ وہ بچپن سے لے کر آج تک ماہی کی انگلی پکڑ کر چلنے کی عادی تھی' سو اس کے منصوبے پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ سب کے جانے کے بعد انہوں نے سکھاں کو بھی چھٹی دے دی۔ وہ دونوں چوکیدار کے پاس چلی آئیں۔

"ادا! مین روڈ پر جو نیا ریسٹورنٹ "ذائقہ" کھلا ہے' وہاں سے یہ چیزیں تو لا دیں۔" ماہی نے سارا مینو چٹ پر لکھ کر ان کی طرف بڑھایا۔ باہر گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی۔ چوکیدار نے گیٹ سے جھانکتے ہوئے کچھ سوچ کر پیسے اور چٹ لے لی۔

"اب چلو! تم بھی ذرا اچھے سے کپڑے پہن کر بو تھا سجا لو۔" وہ نین کی طرف مڑی۔

"مگر ماہی!" اسے اعتراض ہوا۔

"اگر' مگر کچھ نہیں۔ ویسے تو "خیالی ماہیے" کے انتظار میں اتنی بنی ٹھنی رہتی تھیں اور اب ذرا سی تیاری نہیں ہوتی؟"

پھر اس کے لاکھ "نہ' نہ" کرنے پر بھی اسے اس کا سب سے اچھا سوٹ نکال کر دیا۔ وہ پہن کر آئی تو اسے تیار کرنے کھڑی ہو گئی۔ اس کے کندھوں تک آتے سلکی بال کیچو لگا کر پیچھے سے کھلے چھوڑ دیے۔ بھرے بھرے ہونٹوں کو پنک لپ اسٹک سے سجایا اور غلافی آنکھوں میں کجرے کی سلائی پھیری۔

"لو دیکھو۔" زیر لب "ماشاء اللہ" کا ورد کرتے ہوئے اسے آئینے کے سامنے کیا۔ اسے بھی اپنا آپ اچھا لگا تھا' اس لیے کھل کر مسکرا دی۔

"لگتا ہے' بھیا آگئے۔ تم جا کر دروازہ کھولو۔" پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز سن کر ماہی نے اسے باہر دھکیلا۔

لاؤنج کے دروازے کے سامنے لمبا سانس لے کر اس نے خود کو مضبوط کیا۔ اسے یہ سب بہت عجیب لگ رہا تھا۔

"السلام علیکم!" جھٹکے سے دروازہ کھول کر انہیں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام!" سرسری سی نظر اس پر ڈال کر وہ آگے بڑھ گئے۔ ان کے پیچھے زین بھی تھا۔

"تمہیں امی لوگ ساتھ لے کر نہیں گئیں؟" اس کی تیاری دیکھ کر وہ یہی سمجھا کہ شاید اسے بھی ساتھ جانا تھا۔

"ضرور دیر کر دی ہو گی' اس لیے کہتے ہیں' ہر کام وقت پر کرنا چاہیے۔" خود ہی قیاس کرتے نصیحت کرنے لگا۔

"اچھا! تم فکر نہ کرو۔ میں کھانا کھا کر تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔ تم بھی کیا یاد کرو گی۔" کچن کے دروازے پر کھڑی ماہی کو دیکھ کر اس کا منہ بن گیا۔

"اسے تو ہرگز نہیں لے جاؤں گا۔"

"اوہو! کہیں نہیں جانا ہمیں۔" وہ جھنجلائی۔

"نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔" وہ سر جھٹک کر آگے بڑھا۔

"آج ڈنر ملے گا؟"

"تم چینج کر کے آؤ۔ ہم لگاتے ہیں۔" خود پہ گڑی ماہی کی کڑی نظروں سے گھبرائی۔

"بھیا کو بھی بلاتے آنا۔" ماہی نے آواز لگائی۔ وہ سر ہلاتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ گیا۔ ماہی تیر کی سی تیزی سے اس کی طرف لپکی۔

"تم۔"

"میں نے کیا کیا؟" وہ ڈر گئی۔

"نہیں' نہیں! سب کچھ تو مجھے کرنا ہوتا ہے۔ تم سے صرف اتنا نہ ہوا کہ دو' چار باتیں ہی کر لیتیں۔ اس طرح وہ کم از کم ڈھنگ سے تمہیں دیکھ تو لیتے۔" ماہی نے دانت پیسے۔

"بچپن سے تو دیکھتے آرہے ہیں۔"

"بالکل۔۔۔! اور وہ تمہیں اب بھی وہی ناک بہاتی ننھی سی نین سمجھتے ہیں۔ تم ان پہ ثابت کرو نا پاگل! کہ تم اب بڑی ہو گئی ہو۔"

"تو انہیں اپنا شناختی کارڈ دکھا دوں؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔ ماہی نے مٹھیاں بھینچ کر اپنا غصہ کنٹرول کیا اور اس کے پیچھے کچن میں چلی آئی۔

کھانا تیار رکھا تھا۔ چکن کڑھائی' فرائی فش' چائنیز رائس اور فیرنی' سلاد اور رائتہ بھی ساتھ تھا۔ سب کچھ ڈونگوں میں ڈال کر دونوں نے جب تک ٹیبل سیٹ کی' بلیک جینز پر بلیک کرتے کے بازو فولڈ کرتے شاہ ظل بھی آگئے۔ نہا کر آئے تھے۔ گیلے بالوں میں انگلیوں کے نشان واضح تھے۔ نین بہت غور سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ان کی نظریں اوپر کو اٹھیں' اس نے گڑبڑا کر پانی کا گلاس منہ سے لگا لیا۔

"بھیا! آپ اتنا کم کیوں کھا رہے ہیں۔۔۔؟ اور لیجیے نا۔" ماہی نے اصرار کیا۔

"بہت ہے۔" مختصر جواب دے کر وہ کھانا کھانے لگے۔ زین البتہ ڈٹ کر ہر چیز سے انصاف کر رہا تھا۔

"کھانا اچھا ہے نا بھیا؟"

"ہوں!"

"نین نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ بہت ذائقہ ہے اس کے ہاتھ میں۔ فیرنی تو اتنی لاجواب بناتی ہے کہ بس' تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے' اگر چمچے کے بجائے ہاتھ سے کھائی جائے تو انگلیوں کا بچنا مشکل ہے۔"

وہ مبالغہ آرائی کی ہر حد پھلانگ رہی تھی۔ فیرنی کا ڈونگا اٹھاتے شاہ ظل کے ہاتھ لمحہ بھر کو ٹھٹکے تاہم اگلے ہی پل وہ اپنے ازلی بے نیازی کے جامے میں تھے۔ جبکہ زین کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"یہ سب نین نے بنایا ہے؟" وہ آنکھیں پھاڑ کر چیخا۔

"اور نہیں تو کیا؟ تم گھر پر رکو تو تمہیں بھی کچھ پتا چلے۔" سامنے بھی ماہی جیسی ڈھیٹ تھی۔

"واہ نین! تم ذائقہ ریسٹورنٹ میں شیف کب سے لگ گئیں؟" اس نے انتہائی طنز سے نین کو دیکھ کر سوال کیا۔ اسے تو ٹھنڈے پسینے چھوٹ گئے۔

"مطلب؟" ماہی نے پھٹی پھٹی آواز میں تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ چوکیدار کے کہنے پر یہ کھانا میں اور شاہ ظل بھیا ذائقہ ریسٹورنٹ سے لائے ہیں۔" اس نے نیا انکشاف کیا۔

نین نے زور سے ہونٹ کچلا۔ شاہ ظل سے نظریں ٹکرائیں تو اس کا بس نہیں چلا' زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

"کیا سوچتے ہوں گے میرے بارے میں۔" اس نے ڈرتے ڈرتے پھر ان پر نظر ڈالی' مگر ان کا چہرہ یوں سپاٹ تھا جیسے انہوں نے کچھ سنا ہی نہیں۔

"میں مذاق کر رہی تھی۔" ماہی پھیکی ہنسی ہنسی' جس پر رونے کا گمان زیادہ ہوتا تھا۔

"واہ! کیا سینس آف ہیومر پایا ہے۔" ماہی کی خجالت دیکھ کر اس کے سینے میں ٹھنڈ پڑ گئی تھی۔

"کچھ دیر بعد چائے میرے کمرے میں بھجوا دینا۔" شاہ ظل نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کسی کو مخاطب کیے بغیر کہہ کر چلے گئے۔

نین میں سر اٹھانے کی سکت باقی نہیں تھی۔ زین کے جاتے ہی میز سے سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ماہی بے بسی سے دیکھتی رہی۔ اس کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

نین کو نیند نہیں آرہی تھی۔ کروٹیں بدلنے کے بعد تھوڑا سا پردہ ہٹا کر کھڑکی سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ لوٹتی سہ پہر نے منہ پر چپ کی انگلی رکھی تھی۔ اس کی ہیبت اتنی تھی کہ پتوں تک نے ہلنے سے انکار کر دیا تھا۔ سیاہ سناٹا ہی سناٹا تھا۔

ماہی کی آنکھ کھلی۔ کچھ دیر کسل مندی سے پڑے رہنے کے بعد وہ باہر چلی گئی۔ کافی دیر بعد واپس لوٹی تو ہاتھ میں آم کی قاشوں سے بھری پلیٹ تھی۔ وہ کھڑکی کے پاس فلور کشن پر بیٹھ گئی۔

"کھاؤ گی؟" اس نے نین کو دعوت دی۔

"میں نہیں کھاتی نقلی آم۔" اس نے منہ بنایا۔ اسے مصنوعی طریقے سے پکائے گئے آم سخت ناپسند تھے۔

"آم 'آم ہوتا ہے' نقلی یا اصلی نہیں۔" مزے سے کھاتے ہوئے اس نے فلسفہ جھاڑا۔

"نین! میرے پاس بھیا کو امپریس کرنے کا بمباسٹک آئیڈیا ہے۔" کچھ یاد آنے پر وہ جوش سے بولی۔

نین نے کڑی نظروں سے اسے گھورا اور ہاتھ جوڑ دیے۔ اسے ابھی تک شاہ ظل کی وہ نظریں نہیں بھولتی تھیں جن میں کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ تھا۔

"شاہ ظل میرے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔" ہمہ وقت یہی خیال اس کے ذہن میں کلبلاتا رہتا تھا۔ ماہی کے لاکھ اصرار پر بھی اس نے اس کے کسی بھی منصوبے پر عمل کرنے سے صاف انکار کردیا تھا۔

"تو پھر کیا کروگی؟" ماہی نے تاسف سے اس کی زرد رنگت کو دیکھا۔ وہ دن بدن جیسے گھلتی جارہی تھی۔ اگر اسے پتا ہوتا کہ اس کی یہ حالت ہوگی تو وہ غلطی سے بھی اس کی توجہ شاہ ظل کی طرف مبذول نہ کرواتی۔ وہ تو اسے بھی ایک انجوائے منٹ سمجھی تھی، مگر نین نے شاید اسے اپنی زندگی بنالیا تھا۔

کوئل کی پیاسی کوک نے باہر کے سناٹے میں دراڑ ڈالی تھی۔ وہ پلٹی۔ طویل سانس لیتے ہوئے کھڑکی سے سر ٹکادیا۔

"کچھ کرنا ہی تو میرے بس میں نہیں ماہی! بے چینی سی بے چینی ہے۔ جو لہو بن کر میری رگوں میں دوڑتی ہے۔ ساری ساری رات نیند آنکھوں سے روٹھ جاتی ہے۔ جو بھی سوچوں، ہر سوچ شاہ ظل پر جاکر ختم ہوجاتی ہے۔ میرا تو خود پر کوئی اختیار ہی نہیں رہا۔" وہ دیوار سے ٹیک لگاکر بیٹھتی چلی گئی۔

آنسو سیل رواں کی مانند بہہ رہے تھے۔ اس کے لہجے کی بے بسی نے ماہی کا دل جیسے مٹھی میں جکڑلیا۔

معاملہ تو اس کی سوچ سے بھی زیادہ گمبھیر تھا۔ وہ تھکی۔

"اف خدایا!" اس کا دل لرزا۔ "یہ تو محبت کا روگ لے بیٹھی ہے۔" اس نے پھر سے نین کی طرف دیکھا۔ وہاں پان ساگڑیا جیسا، جو اتنا مضبوط تو نہ تھا جو محبت کا بار سہ پائے، اسی لیے تو اس کی یہ حالت تھی۔ اسے سمجھانا بے کار تھا۔ اس کی آنکھوں سے مترشح دیوانگی بتارہی تھی، اس کا خود پر کوئی اختیار نہیں رہا۔

"اگر تم کہو تو میں... بھیا سے بات کروں؟" بہت سوچنے کے بعد اسے یہی حل نظر آیا تھا۔

"نہیں! ہرگز نہیں۔" اس نے درشتی سے کہتے ہوئے اپنے کندھے پر ٹکا اس کا ہاتھ جھٹکا۔

"مگر کیوں؟"

"میں ان کی نظروں میں گرنا نہیں چاہتی، عزتِ نفس بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ جب انہیں پتا چلے گا تو ان کی نظروں میں میری کیا عزت رہے گی؟ وہ تو یہی سمجھیں گے ناکہ فلمیں دیکھ دیکھ کر اور ناول پڑھ پڑھ کر میرے ذہن میں یہ خناس سمایا ہے؟ میرے جذبات کو سمجھیں گے کیا وہ؟ سوائے ذلت اور جھڑکیوں کے مجھے کچھ نہیں ملے گا۔" اس کا گلا پھر سے رندھنے لگا۔ بات تو واقعی سچ تھی۔

"تو پھر تم ہی بتاؤ! کیا کروگی تم؟" ماہی جھنجلائی۔

"کیا کروں گی میں؟" اس نے زیرلب دہرایا۔ بہت بڑا سوالیہ نشان ذہن میں اٹھا تھا۔

"میں، میں دعا کروں گی۔" بڑی انوکھی چمک اس کی آنکھوں میں جاگی۔ وہ اپنے آنسو اک عزم سے صاف کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

نین اور ماہی کی بے چینی عروج پر تھی۔ رات بارہ بجے انٹرنیٹ پر رزلٹ آؤٹ ہونا تھا، مگر بارہ تھے کہ بج کر نہیں دے رہے تھے۔

آخر خدا خدا کرکے بارہ بجے دونوں لاؤنج کی طرف دوڑیں، لاؤنج خالی تھا۔ سب سونے جاچکے تھے۔ انہوں نے ابھی رزلٹ کی آمد کی خبر کسی کو نہیں دی

تھی۔ مطلوبہ ویب سائٹ کھولتے ہی دونوں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ جتنی دعائیں یاد تھیں، سب پڑھ کر مانیٹر پر دم کیں، پھر کہیں جاکر آنکھیں کھولیں۔ ان کا رول نمبر بہت آگے تھا۔ نیچے نیچے کرتے ہوئے انہیں اپنے دل کی دھڑکنیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"یاہو!" اپنے اپنے رول نمبر پر نظر پڑتے ہی ان کی چیخیں بے ساختہ تھیں۔ دونوں فرسٹ ڈویژن لے کر پاس ہوئی تھیں۔

"کیا ہوا؟ کیوں اتنا شور مچار کھا ہے؟"

زین رات دیر تک پڑھنے کا عادی تھا۔ ان کا شور سن کر باہر چلا آیا۔

"آگیا' آگیا۔" دونوں اتنی خوش تھیں، ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے بتائیں۔

چھوٹی چچی جو عزیز کا فیڈر بنانے کے لیے باہر آرہی تھیں دہل گئیں۔ الٹے قدموں تیزی سے اپنے شوہر نامدار کے سر پر جاکھڑی ہوئیں۔

"سنیں جی۔"

"سارا دن تو تمہاری سنتا ہوں، کم از کم رات کو تو سونے دو۔" وہ نیند میں تھے۔

"گھر میں چور آگیا ہے اور آپ کو سونے کی پڑی ہے۔"

"کیا!" وہ اچھل پڑے۔ ساری نیند اڑن چھو ہوگئی تھی۔

ادھر زین ان سے کہہ رہا تھا۔

"کیا منکر نکیر کو دیکھ لیا، جو یوں باؤلی ہورہی ہو۔"

"ہمارا رزلٹ آگیا ہے بدھو۔ ہم دونوں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئی ہیں۔" خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

"فرسٹ ڈویژن؟ ہونہہ! میری طرح بورڈ میں پوزیشن لیتیں تو مانتا۔" زین کو بورڈ میں پوزیشن لینے پر بڑا ناز تھا۔ اس سے پہلے کہ ماہی اسے کرارا سا جواب دیتی، چھوٹے چاچو ہاتھ میں ریوالور لیے چلے آئے۔

"کہاں ہے؟ کہاں ہے؟ جلدی بتاؤ۔" وہ کافی بوکھلائے ہوئے لگ رہے تھے۔ وہ تینوں ان کی "سلطان راہی" جیسی انٹری پر گڑبڑا گئے۔

"جی! نیٹ پر ہے، نیٹ پر۔" انہوں نے اطلاع دی۔

"کیا نیٹ پر ہے؟" انہوں نے ناسمجھی سے پوچھا۔ چور کے آثار انہیں نظر نہیں آرہے تھے اور نہ ان کی باتیں کچھ سمجھ میں آرہی تھیں۔

"ہمارا رزلٹ۔"

"وہ اس وقت کہاں سے آگیا؟" وہ جھنجلائے۔

"ظاہر ہے! نیٹ سے۔"

"اچھا! تو تم لوگ 'اس لیے آگیا' آگیا۔' کا شور مچا رہے تھے؟" چچی کو گھورتے ہوئے وہ پھیکی ہنسی ہنسے۔

"چاچو! ہم دونوں نے فرسٹ ڈویژن لی ہے۔" نین چہکی۔

"بھئی! بہت بہت مبارک ہو۔" وہ ریوالور والا ہاتھ نامحسوس انداز میں پیچھے کرچکے تھے۔

"صرف مبارک باد سے کام نہیں چلے گا۔ گفٹ بھی دینا ہوگا۔" ماہی مچلی۔

"ضرور! ضرور۔" دل ہی دل میں شکر کررہے تھے کہ بچوں کے آگے زیادہ تماشا نہیں بنا۔

"چاچو! آپ نے ریوالور کیوں لیا ہوا ہے؟" وہ جانے کو مڑے تو زین نے پوچھ لیا۔ وہ گڑبڑا گئے۔

"یہ... وہ دراصل! ہاں... میں ریوالور کی صفائی کررہا تھا۔ تم لوگوں کا شور سن کر بے دھیانی میں ساتھ لیے چلا آیا۔ رات بہت ہوگئی ہے، جاؤ! تم لوگ سو جاؤ اور تم میرے ساتھ آؤ۔" وہ اپنی چہیتی بیوی پر خشمگیں نظر ڈال کر واپس چلے گئے۔ وہ مرے مرے قدموں سے ان کے پیچھے چل دیں۔

"اتنی رات گئے ریوالور کی صفائی؟" یہ سوال ان کے ذہنوں میں جاگا، مگر زیادہ غور نہیں کیا۔

صبح ان کا بس نہیں چل رہا تھا لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کرادیں۔ چوکیدار اور مالی بابا تک، ایک ایک کو پکڑ پکڑ کر بتایا گیا۔ گفٹس کی فرمائشیں بھی جاری تھیں۔ زین نے بھی ان کی سات نسلوں پر احسان جتلاتے

ہوئے آئس کریم کھلائی اور باغیچے سے پھول توڑ کر دیے۔ گفٹ کے لیے ان کے اصرار پر پھولوں کی شان میں اتنی مدح سرائی کی کہ انہیں ماننا پڑا' پھول سے بہتر گفٹ کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ سارا دن ہنستے مسکراتے گزرا۔ نین کو خوش دیکھ کر ماہی بھی مطمئن تھی۔

آنٹی سے واپسی پر شاہ ظل نے بھی دونوں کو خوب صورت کیسک میں فاؤنٹین پین گفٹ کیے۔ نین اپنا گفٹ ہاتھ میں لیے کتنی ہی دیر ساکت بیٹھی رہی' پھر انتہائی عقیدت سے آنکھوں سے لگالیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے چہرے پر محبت ہی محبت تھی۔ دو موتی آنکھوں سے ٹوٹ کر وہیں کہیں اٹک گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"بے ہدایتو! کبھی میرے کہے بغیر بھی نماز پڑھ لیا کرو۔" ٹی وی دیکھتے ماہی اور زین' دادی کی آواز سن کر چونکے۔

"میں تو بس یہ تربوز کھانے کو رک گیا تھا۔" زین نے کب کی خالی کی ہوئی پلیٹ پکڑلی۔

"مسجد جاؤ! اور یہ بہانے اللہ سائیں کے آگے گھڑنا۔" انہوں نے اپنی اسٹک اس کے سر پر بجائی۔ وہ سر سہلاتے ہوئے "فوراً" اٹھ گیا۔

"اور تم..." وہ ماہی کی طرف مڑیں۔ خالی صوفہ ان کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ ان کی توپوں کا رخ اپنی طرف مڑنے سے پہلے ہی نماز کے لیے اٹھ گئی تھی۔

"آج کل کے بچوں سے تو اللہ سمجھے۔" وہ بیٹھی بڑبڑاتی رہیں۔

"خیریت دادو! اتنا غصہ کس پر آرہا ہے؟" مسجد سے واپس آتے شاہ ظل نے پیچھے سے آکر ان کے گلے میں بانہیں ڈالیں۔ سفید شلوار قمیص میں وہ بہت نکھرے نکھرے لگ رہے تھے۔ وہ سب بھلا کر انہیں پیار کرتے ہوئے دعائیں دینے لگیں۔ اپنا یہ پوتا تو انہیں جان سے زیادہ پیارا تھا۔

"تمہاری اماں ہمیشہ نصیحت کرتی تھیں کہ نماز پڑھو' اس سے پہلے کہ تمہاری نماز پڑھی جائے۔ یہ زین اور ماہی کو جب تک کہا نہ جائے' تب تک نماز کے لیے اٹھتے ہی نہیں۔ اب نین بھی تو ہے۔ اللہ نے کیسی ہدایت دی۔ جائے نماز پر سے اٹھنے کا نام نہیں لیتی۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی ہے تو ہتھیلیاں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں۔ خشوع و خضوع دیکھ کر رشک آتا ہے۔" اس کا ذکر کرتے ہوئے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔

اندر نین ابھی تک دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے بیٹھی تھی۔ آنکھوں سے برستے موتی ہتھیلیوں پر چمک رہے تھے۔ اوپر جاتے شاہ ظل کی غیر ارادی نظر کمرے کے کھلے دروازے پر پڑی' وہ ٹھٹک گئے۔

جائے نماز لپیٹتی نین انجانے احساس سے جلدی سے مڑی۔ دروازے میں کوئی نہیں تھا۔ سیڑھیاں چڑھتے قدموں کی دھمک اسے اپنے دل میں دھڑکتی محسوس ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ کچن میں چائے بنا رہی تھی۔ ماہی آکر خواہ مخواہ کیبنٹ کھولنے بند کرنے لگی۔ نین کچھ دیر اسے دیکھتی رہی' پھر آنچ دھیمی کرکے اس کے پاس آگئی۔

"ماہی پلیز! ناراض مت ہو۔ تم خواہ مخواہ ڈر رہی ہو۔ بہت انٹرسٹنگ سبجیکٹس ہیں۔" وہ اسے قائل کرنے لگی۔

"فلاسفی' سائیکالوجی اور ہسٹری انٹرسٹنگ سبجیکٹس ہیں؟" وہ چیخ ہی تو پڑی تھی۔ ان کی بی اے کی کلاسز شروع ہوگئی تھیں۔ نین نے ان تین مضامین کا انتخاب کیا تھا۔ ماہی کو تو ان کا نام سن کر ہی خلجان ہونے لگا' پڑھنا تو دور کی بات تھی۔ وہ ناراضی دکھا کر اس کا فیصلہ بدلنے کی تگ و دو میں تھی۔

"اچھا! اب یہ چائے تو دے آؤ۔" پرچ میں سلیقے سے کپ جما کر اس نے ماہی کی طرف بڑھایا۔ وہ منہ پھلا کر لان میں مطالعہ کرتے شاہ ظل کو کپ دے آئی۔

موسم بدل رہا تھا۔ اکثر شامیں بے زاری کا پیراہن اوڑھے ہوتی تھیں۔ ماہی صوفے پر نیم دراز چینل

سرچنگ کرنے لگی۔ بڑی امی اون سلائیاں لے کر وہیں آبیٹھیں۔ انہوں نے ابھی سے سردیوں کی تیاریاں شروع کردی تھیں۔ روز کسی نہ کسی کا ناپ لے کر اس کے لیے سوئیٹر بنتی رہتیں۔

ان کے ہاتھ جس تیزی سے چل رہے تھے' اس کی بے فکری دیکھ کر زبان بھی اسی رفتار سے چلنا شروع ہوگئی' مگر وہ کان لپیٹے ٹی وی دیکھنے میں مصروف رہی۔

جب سے دونوں بی اے میں آئی تھیں' بڑی امی کو انہیں خانہ داری سکھانے کا شوق چڑھا تھا۔ نین تو دل لگا کر کوکنگ سیکھ رہی تھی' مگر ماہی پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتی تھی۔ پڑھائی کا بہانہ اس کا سب سے بڑا ہتھیار تھا۔

"کیا ہوا بڑی امی؟ کچھ پریشان ہیں آپ؟" ریکٹ جھلاکر باہر جاتا زین' ماہی کی کلاس لگتا دیکھ کر ان کے پاس آبیٹھا۔

"کیا بتاؤں بیٹا! اس لڑکی کے نکمے پن سے تو میں بے حد پریشان ہوں۔ پانی کا گلاس تک اٹھایا نہیں جاتا۔ لڑکیاں پرایا دھن ہوتی ہیں۔ آلکس انہیں زیب نہیں دیتی' مگر یہ کاہل تو لگتا ہے' دوسرے گھر جاکر میرا نام ڈبوئے گی۔ لوگ کیا کیا باتیں نہیں بنائیں گے۔ ماں اتنی سلیقہ مند اور بیٹی ایسی پھوہڑ۔" وہ ناک تک بھری بیٹھی تھیں' زین کے ہمدردی دکھاتے ہی شروع ہوگئیں۔

"اوہو امی! ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے۔ بولنے سے پہلے کم از کم دیکھ تو لیا کریں' سامنے کون بیٹھا ہے۔" اسے ان کی باتوں سے زیادہ زین کی دل جلانے والی وہ مسکراہٹ تپا رہی تھی۔

"لو جی! اب یہ ماں کو سکھائیں گی کہ کون سی بات کب کہنی ہے اور کس کے سامنے کہنی ہے۔" انہیں پتنگے لگ گئے۔

"ارے! اپنے بچے کے سامنے کہہ رہی ہوں۔ کسی غیر کے آگے نہیں۔ کتنی توجہ سے میری باتیں سنتا ہے' ورنہ آج کل کے بچوں کے پاس وقت کہاں کہ دو گھڑی بڑوں کے ساتھ بیٹھ جائیں۔" انہوں نے زین کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"آپ کی باتیں نہیں' میری ادائیں۔" وہ ٹھمک کر بولی۔

"بڑی امی! یہ سب آپ کی ڈھیل کا نتیجہ ہے۔ آپ ہاتھ ذرا کس کے رکھیں' پھر دیکھیں کیسے چھڑی کی طرح سیدھی ہوتی ہیں محترمہ۔"

اسے تو ایسا موقع اللہ دے۔ وہ انہیں اکسانے لگا۔

ماہی نے مٹھیاں بھینچ کر خود کو زین کو کچھ کہنے سے روکا' ورنہ وہ تو مظلوم سی شکل بنالیتا اور امی سے بڑوں سے بات کرنے کے سلیقے پر گھنٹہ بھر لیکچر اسے سننا پڑتا۔

وہ بڑی امی سے آنکھ بچا کر اسے مکا دکھاتے کمرے میں چلی آئی۔ نین حسب معمول کھڑکی میں ٹنگی تھی۔ جب تک شاہ ظل باغ میں بیٹھتے' وہ کھڑکی سے یک ٹک انہیں دیکھتی رہتی۔ ایسے میں اسے ارد گرد کا تو کیا اپنا بھی ہوش نہیں رہتا تھا۔ وہ ان کے سامنے جانے سے کترانے لگی تھی' مگر ہر وقت انہیں اپنی نظروں کے حصار میں رکھتی تھی۔ اسے ماہی کے کمرے میں موجودگی کا احساس تک نہیں ہوا۔ ماہی کو اس پر غصہ آنے لگا۔

"اس میں نین کا قصور نہیں' یہ سب تو محبت کا شاخسانہ ہے۔" وہ اسے ترحم آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے زور سے دروازہ بند کرکے چلی گئی۔

"ماہی! مجھے شاہ ظل بھیا کی اسٹڈی کی صفائی کرنی ہے۔ تم میرے ساتھ چلو! ان کا کوئی کاغذ ادھر سے ادھر ہوگیا تو میری خیر نہیں۔" سکھاں شروع سے ان کے گھر کام کرتی تھی۔ مالک ملازم کا کوئی تکلف ان کے درمیان نہیں تھا۔

شاہ ظل کو بچپن سے مطالعے کا بہت شوق تھا۔ ان کے کمرے سے ملحق اسٹڈی بہت سادہ سی تھی۔ گلاس ٹیبل' ریوالونگ چیئر اور ایک صوفے کے علاوہ کمرے میں صرف الماریاں ہی الماریاں تھیں۔ وہ سکھاں کو ہدایات دینے کے بعد کھڑکی میں آکھڑی ہوئی۔ شام ٹوٹ رہی تھی۔ آسمان کے کنارے اس کا لہو بکھرا تھا۔ پچھلی دیوار میں ترتیب سے تین الماریاں نصب

تھیں۔ وہ آہستہ قدموں سے ان کے قریب چلی آئی۔ فلاسفی، سائیکالوجی اور ہسٹری۔ الماریوں کے اوپر بالترتیب ان تین موضوعات کی چٹیں لگی تھیں۔ اسے یاد آیا، یہ تینوں شاہ ظل بھیا کے پسندیدہ مضامین تھے۔ انہوں نے باقاعدہ تعلیم اگرچہ بزنس کی حاصل کی تھی، مگر ان تینوں موضوعات پر دنیا بھر کی بہترین کتب جمع کر رکھی تھیں۔ اسے نین کے یہ مضامین رکھنے کی وجہ سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے طویل سانس لیتے ہوئے نین کا ارادہ بدلوانے کے لیے خود پر طاری ناراضی ختم کردی۔ اس لمحے اسے ٹوٹ کر اس پر پیار آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

چاند سورج کا کھیل اسی رفتار سے جاری رہا۔ دن چھوٹے اور راتیں لمبی ہوتی گئیں۔ نہ ماہ نین کی دیوانگی بدلی، نہ شاہ ظل کی بے نیازی میں فرق آیا۔ اس کی دعاؤں کا دورانیہ آج بھی اتنا طویل تھا، مگر وہ خود کو قابو میں رکھنا بھی سیکھ گئی تھی۔ ہاں! یہ ضرور ہوا تھا کہ شاہ ظل شام کی چائے کے ذائقے کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ اس کے سوا چائے کا کوئی اور ذائقہ بھاتا ہی نہ تھا۔ یہ جانے بغیر کہ کس کے ہاتھوں کی کاوش ہے۔ نین اسی بات پر پھولے نہیں سماتی تھی۔ زین اور ماہی کی نوک جھونک کا بھی وہی عالم تھا۔ سب کچھ ویسے کا ویسا تھا، مگر وقت تھا بند مٹھی میں ریت کی طرح پھسلتا جارہا تھا۔

موسم نے پھر سے کروٹ بدلی۔ مالٹے اور انار کے پیڑ ویران ہونے لگے۔ دن پھر سے لمبے اور راتیں چھوٹی ہونے لگیں۔ کوئل کی مدھر آواز پھر سے دوپہر کے سناٹوں میں رنگ بھرنے لگی۔

آم دے تھلے بہ کے، ہاں! بہ کے ماہیا وے ماہیا
کریے پیار دیاں گلاں، ہاں! کریے پیار دیا گلاں ہو ہو

ماہی نے کچن کی جالی سے سر ٹکایا۔ نین آم کے پیڑ کے نیچے اپنی مخصوص جگہ کتابیں پھیلائے بیٹھی تھی۔ گنگنانے کا شغل بھی جاری تھا۔ وہ سکنجبین بنانے لگی۔ ماضی کے تجربوں کے پیش نظر ڈیڑھ گلاس ادھر بیٹھ کر جلدی جلدی چڑھالیا اور باقی لے کر باہر چلی آئی۔

دھیمی رفتار سے چلتی ہوا میں گلابوں کی خوشبو رچی تھی۔ نین نے حسب عادت جگ اپنے قبضے میں کرلیا۔ جب تک ماہی کا خیال آیا، صرف آدھا گلاس شربت بچا تھا۔ اس نے کوئی احتجاج کیے بغیر دنیا جہان کی مظلومیت خود پر طاری کرتے ہوئے گلاس تھام لیا۔

"ماہی! میری بہنا، تم دل چھوٹا مت کرو۔ میں ابھی تمہارے لیے پکوڑے بنا کر لاتی ہوں۔" سدا کی نرم دل نین کو اس پر ترس آیا۔

"پکوڑے۔" اس کے منہ میں پانی آیا۔ "ویسے دل تو نہیں چاہ رہا، چلو! تم بناؤ گی تو چکھ لوں گی۔" اس نے گویا اس کی سات نسلوں پر احسان کیا۔

"نہیں، نہیں! کوئی زبردستی نہیں۔ تمہارا دل نہیں چاہتا تو میں نہیں بناتی۔" اس کی آنکھوں میں ناچتی شرارت دیکھ کر وہ پھر سے بیٹھ گئی۔

"نہیں، نہیں! تم جاؤ، کس نے کہا، میرا دل نہیں چاہ رہا؟ میرا تو بہت دل چاہ رہا ہے۔" اس نے فوراً بیان بدلا۔

"مگر میں نہیں جاتی، اب میرا دل نہیں چاہ رہا۔"

"ارے واہ! ایک تو ساری سکنجبین پی گئیں، اوپر سے پکوڑے بھی نہیں کھلا رہیں۔ تمہاری تو ایسی کی تیسی۔" اس نے آستینیں چڑھائیں۔

"تو کردو۔" اس کا اطمینان عروج پر تھا۔

"نین!" وہ زور سے چیخی۔ نین کے دیکھتے ہی اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

"پلیز!" ناچار اسے اٹھنا پڑا، مگر اب احسان جتلانے کی باری اس کی تھی۔

اس کے جاتے ہی ماہی کتابوں پہ جھک گئی، ان کے ٹیسٹ شروع ہونے والے تھے۔

ادھر نین نے جلدی جلدی بیسن گھول کر مسالے ملائے اور آلو چھیل کر گول گول قتلے کاٹنے لگی۔ ساتھ ہی ٹوکری میں کیریاں رکھی تھیں۔ انہیں دیکھ کر اچانک اسے آئیڈیا سوجھا، پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ آلو کے گول

گول پکوڑوں کے ساتھ کیریاں چھیل کران کے لمبے پکوڑے بھی تل رہی تھی۔ اسے اوٹ پٹانگ کام کرنے میں ہمیشہ بہت مزا آتا تھا۔ ایک کیری کا پکوڑا چکھا۔ ذائقہ ذرا عجیب تھا۔ کیریوں کے قتلے گرم تیل میں نرم ہوگئے تھے مگر کھٹاس بدستور تھی۔ عجیب مگر مزے دار ذائقہ تھا۔ اس نے ایک پلیٹ میں آلو اور دوسری میں کیریوں کے پکوڑے رکھے' پھر فریج کھول کر جائزہ لینے لگی۔ دادی طرح طرح کی چٹنیاں بنوا کر رکھتی تھیں۔ املی اور انار دانے کی چٹنی نکال کر دو پیالوں میں بھری۔ آلو کے پکوڑوں والی پلیٹ میں دو' تین کیریوں کے پکوڑے رکھے اور باقی پکوڑے ایک پلیٹ میں رکھ کر اسے دوسری پلیٹ سے ڈھانپ دیا اور پھر اس پر چٹنی کی پیالی رکھ کر ایک طرف رکھ دیا اور دوسری پلیٹ لے کر باہر چلی آئی' تاکہ کیریوں کے پکوڑے صرف چکھا کر سدا کی چٹوری ماہی کے شوق کو ہوا دی جائے اور بقیہ پکوڑے تھوڑا ستا کر کھلائے جائیں۔

اسے آتا دیکھ کر ماہی نے کتابیں سمیٹ لیں۔ وہ پلیٹ رکھ کر اس کے دوپٹے سے پسینہ پونچھنے لگی' مگر ماہی نے نظرانداز کردیا۔

"واہ! مزا آگیا' نین! تم اتنے اچھے پکوڑے بناتی ہو۔ یقین کرو۔ اگر پکوڑوں کی ریڑھی لگالو تو راتوں رات لکھ پتی بن جاؤگی۔"

وہ جو اپنی تعریف سن کر اکڑ رہی تھی' اس کی پوری بات سن کر پاس پڑا اسکیل اسے دے مارا' مگر نشانہ ہمیشہ کی طرح چوک گیا۔

"کیا ہے؟" ماہی نے چٹخارہ بھرا۔

"بوجھو۔" وہ اترائی۔

"کیری کا پکوڑا۔" دوسرا چکھتے ہی بوجھ گئی۔

"اور ہیں؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"جب میں ریڑھی لگاؤں گی تو آکر کھا جایا کرنا۔" نین نے بے نیازی سے ہاتھ پیچھے ٹکا کر ٹانگیں سیدھی کیں۔

"میں تو مذاق کررہی تھی۔"

"مگر میں سنجیدہ ہوں۔" وہ اگلے پچھلے سارے حساب چکانے کے موڈ میں تھی۔

"نین! پلیز پلیز۔" وہ حسب عادت منتوں پر اتر آئی۔

"اندر سلیب پر رکھے ہیں۔" اسے بتاتے ہی وہ اندر بھاگی۔

"تمہارا کوئی بھروسا نہیں' خالی پلیٹ ہی باہر لاؤگی۔" نین بھی اس کے پیچھے بھاگی' مگر کیریوں کے پکوڑوں والی پلیٹ سلیب پر تو کیا' کہیں نہیں تھی۔ ماہی نے فریج تک میں دیکھ لیا۔ اب مشکوک نظروں سے نین کو گھور رہی تھی۔

"ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟ یقین کرو! میں نے خود بنا کر یہاں رکھے تھے۔" اس نے صفائی پیش کی۔

"تم دونوں پکوڑے تو تلاش نہیں کررہیں' جو یہاں رکھے تھے؟" ان کا سرچ آپریشن دیکھ کر سکھاں نے پوچھا۔

"کہاں ہیں؟" دونوں نے بے تابی سے پوچھا۔

"شاہ ظل بھیا آج جلدی آگئے تھے۔ چائے کے ساتھ کچھ کھانے کے لیے لانے کو کہا تو میں وہی دے آئی۔" مصروف سے انداز میں جواب دے کر وہ باہر چلی گئی۔

کچن کے کھلے دروازے سے شاہ ظل سیڑھیاں اترتے نظر آئے۔ ان کے ہاتھ میں وہی ڈھکی ہوئی پلیٹ تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"یہ کس نے بنائے تھے؟" پلیٹ سلیب پر رکھتے ہوئے سرسری سا پوچھا۔

"نین نے۔" ماہی آہستہ سے بولی۔

"ایسی اوٹ پٹانگ چیزیں کھاتی رہتی ہو' اسی لیے گلا آئے دن خراب ہوتا ہے۔"

نین کی تھوڑی گردن سے لگ گئی۔ وہ فریج سے پانی کی بوتل لے کر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی ماہی تیزی سے پلیٹ کی طرف بڑھی' مگر یہ کیا۔۔؟ پلیٹ تو ساری کی ساری خالی تھی۔ شاہ ظل کی بات ان کے ذہنوں میں گونجی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

کچن میں گونجی ان کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

☼ ☼ ☼

آج نین کا فلسفے کا پیپر تھا۔ ماہی نے دل کڑا کرتے ہوئے اس کا ساتھ دینے کے لیے ہسٹری اور سائیکالوجی تو لے لی تھی' مگر فلسفہ پڑھنا اس کے بس سے باہر تھا۔ اس نے پولیٹکل سائنس لی تھی۔

آج چونکہ فلاسفی کا پیپر تھا' اس لیے اسے اکیلے جانا تھا۔ اوپر سے وین والے نے بھی چھٹی کرلی۔ صبح بابا اسے چھوڑ کر گئے تھے۔ دوپہر میں ان کے کلینک میں بہت رش ہوتا تھا' سو ان کا آنا ممکن نہیں تھا۔ انہوں نے کسی کو بھیجنے کا کہا تھا۔ اس کا پیپر اچھا ہوا تھا' اس لیے آگ برساتا سورج اور گرم ہوا بھی خوشگوار لگ رہی تھی۔ بیرونی گیٹ کو جانے والی روش کے ایک طرف قد آدم سفیدے کے درخت تھے اور دوسری طرف دیوار تھی۔ درختوں کے تنوں کے ساتھ اسمائے حسنہ کی تختیاں جڑی تھیں۔ وہ آہستہ روی سے چلتے ہوئے دل ہی دل میں ان کا ورد کرتی جارہی تھی۔

"نہ جانے کون لینے آیا ہوگا۔" یہ سوچتے ہوئے وہ گیٹ سے باہر نکلی اور ٹھٹک گئی۔ سامنے گاڑی سے ٹیک لگائے شاہ ظل کھڑے تھے۔ بلیک جینز' شرٹ میں ان کا دراز قد نمایاں تھا۔ سن گلاسز لگائے' ایک ہاتھ جینز کی جیب میں ڈالے' دوسرے ہاتھ سے موبائل کان سے لگائے کسی سے بات کرتے ہوئے اپنی ازلی بے نیازی کے ساتھ بے حد ہینڈسم لگ رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھتی رہ گئی۔ انہوں نے اسے رکا دیکھ کر سر کے اشارے سے بلایا بھی' مگر وہ بس انہیں دیکھے گئی۔ فون بند کرکے انہیں خود آنا پڑا۔

"تم آ کیوں نہیں رہیں؟ کوئی مسئلہ ہے کیا؟"

"نن۔۔۔ نہیں تو۔" وہ گڑبڑائی۔ انہوں نے کچھ کہے بغیر قدم آگے بڑھا لیے۔

وہ اپنی بے خودی پر قابو پا کر ان کے قدم سے قدم ملانے لگی۔ ان کے ہمراہ اپنا آپ بے حد معتبر لگ رہا تھا۔

"پیپر کیسا ہوا؟" گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"بہت اچھا!" وہ فائل پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ دانستہ ان کی طرف دیکھنے سے گریز کررہی تھی۔

"کیا سبجیکٹس ہیں تمہارے؟"

"فلاسفی' سائیکلوجی اور ہسٹری۔"

"ہائیں!" انہوں نے سرہلایا۔ نین کو لگا جیسے آدھی آدھی رات تک پڑھنے کی ساری محنت وصول ہوگئی ہو' پھر خاموشی گاڑی میں بکھر گئی۔

وہ گاڑی میں پھیلی ان کے پرفیوم کی بھینی خوشبو اندر اتارتے ہوئے ان کے ساتھ کی خوب صورتی محسوس کرتی رہی۔ اسے گیٹ پر اتار کر انہوں نے گاڑی آفس کے لیے موڑلی۔ وہ وہیں کھڑی دیکھتی رہی' یہاں تک کہ گاڑی مڑ کر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر بہت صورت مسکان تھی۔ اس مختصر ساتھ کی سرشاری انگ انگ میں اٹھلا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

لاؤنج میں تیز آواز میں ٹی وی چل رہا تھا۔ عمر اور عذیر انتہائی انہماک سے ٹام جیری کی شرارتیں دیکھ رہے تھے۔ ماہی فلور کشن کے سہارے نیم دراز میگزین پڑھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی نمک لگے موٹے موٹے جامنوں کی بھری پلیٹ رکھی تھی' جسے خالی کرنے کے فریضے میں اس کے ساتھ ساتھ عمر اور عذیر بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ صوفے پر بیٹھی نین بہت بے زاری سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔

"ماہی! تمہیں نہیں لگتا ہماری زندگی بہت جامد ہوگئی؟" کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ سارا دن گھر پر رہ کر لمبے بوریت بھرے دن کاٹنے کی بے زاری اس کے لہجے سے صاف جھلک رہی تھی۔

"تو پہلے کون سے زلزلے آتے رہتے تھے؟" ماہی نے کان پر سے مکھی اڑاتے ہوئے ورق پلٹا۔

"تم لوگ تو پچھلے سال اسلام آباد ہو آئے

تھے۔ میں نے سالوں سے شہر سے باہر قدم نہیں رکھا۔" وہ حسرت سے بولی۔

"کیوں نا پھر سے کہیں ٹرپ پر چلیں؟" پلیٹ میں پڑی آخری جامن تیزی سے اٹھاتے ہوئے چھ سالہ عمر نے تجویز دی۔

"کہاں جانے کی باتیں ہو رہی ہیں؟" دادو تیل کی شیشی لیے اندر داخل ہوئیں۔

"کہیں بھی، مگر شہر سے باہر۔ سچی دادو! گھر پر رہ رہ کر بے حد بور ہو گئے ہیں۔" اس نے سستی سے جمائی لی۔

"ہاں! میں بھی کئی دنوں سے گاؤں جانے کا سوچ رہی تھی۔"

انہیں تیل کی شیشی کھولتا دیکھ کر ساری سستی دم دبا کر بھاگ گئی۔ وہ تیزی سے اٹھی، مگر دادو ہوشیار تھیں۔ اسے بازو سے پکڑ کر قدموں میں بٹھا لیا اور چلو بھر تیل اس کے سر پر انڈیل کر مالش کرنے لگیں۔

"پلیز دادو! بس کریں۔" کڑوے تیل کی بو اسے بہت ناگوار محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ناک پر ہاتھ رکھے گزر گزار رہی تھی۔

"بالوں کا حال دیکھا ہے۔ گڑے، دو موہے ہو رہے ہیں۔ ذرا کنگھی دیکھا کرو، جب بھی کرتی ہو۔ آدھے بال تو اسی میں رہ جاتے ہیں۔"

"مگر دادو! یہ صرف میرا مسئلہ تو نہیں۔ ماہی کے بالوں کا بھی یہی حشر ہے، بلکہ آج کل تو ہر لڑکی کو یہی مسئلہ درپیش ہے۔" وہ منمنائی۔

"یہ جو تم لڑکیاں تیل کے نام سے بھاگتی ہو، یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ مجھے دیکھو! بوڑھی ہو گئی ہوں، مگر چوٹی اب بھی پوری مٹھی میں سماتی ہے، کیونکہ ساری زندگی کبھی شیمپو استعمال نہیں کیا۔ ہمیشہ سرسوں کی کھلی سے بال دھوئے اور کبھی خشک نہیں رہنے دیے۔ جب تمہاری عمر کی تھی تو اماں سرسوں کا خالص تیل کھانی سے منگوا کر اپنے ہاتھوں سے میرے سر میں مالش کیا کرتی تھیں۔ اسی لیے بڑھاپے میں بھی بالوں میں چند سیاہ بال جھلکتے ہیں، جبکہ آج کل کی لڑکیاں تو بھری جوانی میں بڈھی بنی پھرتی ہیں۔"

"دادو ماہی کو دیکھیں، کتنے مزے سے بیٹھی ہے۔"

"فکر نہ کر، تیرے بعد اس سے بھی نپٹتی ہوں۔" انہوں نے اسے تسلی دیتے ہوئے ماہی کا سکون رخصت کیا۔ وہ اچھل کر دروازے کے قریب ہو بیٹھی، تاکہ فرار ہونے میں آسانی رہے۔

سکھاں دادی کے کپڑے بالٹی میں بھر کر اوپر پھیلانے جا رہی تھی۔ وہ مشین کے بجائے اپنے کپڑے ہاتھ سے دھلواتی تھیں۔ اسے پسینہ پسینہ سیڑھیاں چڑھتا دیکھ کر انہوں نے روک لیا۔

"آ میری بچی! ادھر بیٹھ کر پسینہ سکھا لے۔ تھک گئی ہو گی۔ جا عمر! سکھاں کے لیے فریج سے ٹھنڈا جوس کا ڈبہ اٹھا لا۔" وہ ایسی ہی مہربان تھیں۔

"اور ماہی! تو کیا سارا دن اینٹھتی رہتی ہے۔ جا، جا کر کپڑے ڈال آ۔" اسے آنکھ بچا کر بھاگتا دیکھ کر انہوں نے حکم صادر کیا۔

"دادی! گرمی ہے، اوپر سے بالٹی بھی بھاری ہے۔" اس کی ازلی کام چوری عود آئی۔

"یہ دیکھ ذرا اس بلے کو کیسے اتنا وزن اٹھائے پتلی سی تار پر چل رہا ہے۔ تجھ سے ایک بالٹی اٹھا کر سیڑھیاں نہیں چڑھی جاتیں؟ جا شاباش۔" انہوں نے اسے آمادہ کرنے کے لیے مثال بھی دی تو تمام کی سب کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ در آئی۔ ماہی کو منہ بناتے ہی سہی اٹھنا پڑا۔

اب سکھاں اس کی جگہ بیٹھی مزے سے جوس پیتے ہوئے میگزین کی تصویریں دیکھ رہی تھی اور وہ بالٹی اٹھائے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

"کپڑے نچوڑتے تو جیسے ہاتھ ٹوٹتے ہیں سکھاں کے۔" کپڑوں میں آدھا پانی ویسے کا ویسا ٹھہرا تھا۔ وہ نچوڑتے ہوئے بڑبڑائے جا رہی تھی۔ جب تک کپڑے پھیلائے، نچڑے پانی سے آدھی بالٹی بھر چکی تھی۔ بھری بالٹی نہ وہ یہاں ماربل پر گرا سکتی تھی اور نہ ہی نیچے لے جانے کا حوصلہ تھا۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے ٹیرس کی ریلنگ پر ٹکا کر نیچے الٹ دی۔

نیچے کھڑے زین نے گرمی سے بے حال ہوتے

ہوئے بارش کی دعا مانگ کر بڑی آس سے آسمان کی طرف دیکھا تھا، جب پانی کا ریلا اسے سرتاپا بھگو گیا۔ بن بادل برسات اپنی دعا کی ایسی معجزانہ قبولیت پر اس نے گڑبڑا کر ذرا پیچھے ہو کر اوپر دیکھا۔ واپس پلٹتی ماہی کی نظر اس پر پڑی۔ اسے بھیگا چوہا بنا دیکھ کر اتنی بوکھلائی کہ بالٹی بھی ہاتھ سے چھوٹ گئی اور سیدھی زین کے سر پر جا کر بجی اور چیخ ماہی کی نکل گئی۔ اب تو زین کا میٹر گھومنا ہی گھومنا تھا۔ وہ جتنا تیز دوڑ سکتی تھی، دوڑی۔ زین اس کے پیچھے تھا۔ اگلے کچھ ہی لمحوں میں گھر ان دونوں کی آوازوں سے گونج رہا تھا، دادی دل پر ہاتھ رکھے ان کی ہاہاکار سے دہلے جا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"پورے ملک میں بارشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے، نہ جانے ہم کب فیض یاب ہوں گے۔" ستون سے ٹیک لگا کر آسمان کو دیکھتے ہوئے نین کے لہجہ میں حسرت ہی حسرت تھی۔

"اس بار تو واقعی لمبا عرصہ ہو گیا ہے، اب تک تو ہمارے علاقے میں بھی بارشیں شروع ہو جانی چاہیے تھیں۔" عذیر کے کرتے پر بٹن لگاتے ہوئے چھوٹی چچی نے بھی اس کی بات سے اتفاق کیا۔

"کیا ہو جانی چاہیے تھی؟" چائے کا بھاپ اڑاتا کپ اور پراٹھے پر مکھن اور کباب رکھے ماہی بھی چچی کے پاس تخت پر آ بیٹھی۔

"تمہاری شادی۔" وہ جل کر بولی۔ ماہی کی صبح دس، گیارہ سے پہلے نہیں ہوتی تھی، جبکہ نین صبح خیزی کی عادی تھی، اس لیے اس کے اٹھنے تک جی بھر کر بور ہوتی رہتی تھی۔

"ہک ہا! نہ جانے کب ہو گی۔" گرم پراٹھے پر مکھن پگھل کر پلیٹ میں گر رہا تھا۔ وہ سنبھالنے کی کوشش میں بلاارادہ اس کے منہ سے نکل گیا۔ اندر جاتی دادی نے آنکھیں سکیڑ کر بغور اسے دیکھا تھا۔ وہ قدرے خجل ہوئی، مگر وہ بغیر کچھ کہے اندر چلی گئیں۔

"اتنی بے دردی سے پتے کیوں توڑ رہی ہو؟" سکھاں کو مہندی کا پودا تیزی سے خالی کرتے دیکھ کر وہ تڑپ اٹھی۔

"دادی نے کہا ہے کہ مہندی کے پتے سکھا کر پیس دوں، وہ کل گاؤں جا رہی ہیں نا۔" دادی ہمیشہ گھر کی مہندی استعمال کرتی تھیں۔

"آپ بھی جا رہی ہیں؟" ماہی نے ناشتا ختم کرنے کے بعد گاؤ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے چھوٹی چچی سے پوچھا۔

"ظاہر ہے، مجھے تو جانا ہی جانا ہے، اس بار تو تمہارے چاچو بھی جا رہے ہیں۔"

وہ خوشی خوشی بتانے لگیں۔ وہ بڑی دادی کی سب سے چھوٹی بیٹی تھیں، یوں گاؤں میں ان کا میکہ بھی تھا۔

"ماہی! ہم بھی چلیں؟ کتنا عرصہ ہو گیا ہے حویلی والوں سے ملے۔" نین کو اچانک شوق چڑھا۔

"آخری بار میٹرک کے پیپرز کے بعد گئے تھے۔ اس کے بعد تو جانا ہی نہیں ہوا۔" ماہی کو بھی ہوک اٹھی۔

"تم دونوں تو ضرور چلو! آمیں بھی پکنے والی ہیں۔ آم کے باغوں میں خوب رونق ہو گی۔ رانیہ، دانیہ، فضا، عفرا سب تمہیں بہت یاد کرتی ہیں۔ ان کے ساتھ مل کر خوب مزے کرنا۔" چچی نے ان کے شوق کو ہوا دی۔

تھوڑی ہی دیر میں دونوں دادی کے سر تھیں۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ رات تک زین کا موڈ بھی بن گیا۔ دادی نے شاہ ظل سے بھی ساتھ چلنے کا کہا، وہ بھی راضی ہو گئے۔ یوں اگلی صبح ایک کے بجائے دو گاڑیاں عازم سفر تھیں۔ ایک میں دادی، چاچو، چچی اور بچے تھے، دوسری میں شاہ ظل اور زین کے ہمراہ ماہی اور نین تھے۔ تین گھنٹوں کے تھکا دینے والے سفر نے سب کو بے حال کر دیا، مگر نین کا چہرہ روم روم میں بسی تھکان کے باوجود کھلا پڑ رہا تھا، بلاشبہ یہ شاہ ظل کی ہمراہی کا اعجاز تھا۔

☼ ☼ ☼

حویلی میں ان کا استقبال انتہائی شاندار طریقے

سے کیا گیا۔ بڑی دادی کے بیٹے' بہوئیں' پھر ان کے بچے سب موجود تھے۔ بیاہی بیٹیاں بھی آئی ہوئی تھیں۔ خوب گہما گہمی تھی۔ ان کے انتظار میں کسی نے ابھی تک دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ ملنے ملانے کا سلسلہ جاری تھا کہ بڑی دادی نے گول کمرے میں دسترخوان چنوا دیا۔

کھانا انتہائی پُرتکلف اور مزے دار تھا۔ اوپر سے بھوک بھی عروج پر تھی' سو سب نے سیر ہو کر کھایا۔ کھانے کے بعد ان کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں تو میزبانوں نے حال احوال کا سلسلہ بعد پر اٹھا کر انہیں آرام کے لیے ان کے پورشن پہنچا دیا۔ بڑی دادی نے ان کے پورشن کی صفائی کروا رکھی تھی۔ چونکہ یہ حصہ بھی ان کے استعمال میں رہتا تھا' اس لیے ضروری سامان موجود تھا۔ سب ہی بے حد تھک چکے تھے' اس لیے بستروں پر جاتے ہی بے خبر ہو گئے۔

شام ڈھل رہی تھی' جب نین کی آنکھ کھلی۔ کچھ دیر چھت کی کڑیاں گنتی رہی' پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ماہی کا پلنگ خالی تھا۔ وہ شاید باہر جا چکی تھی۔ نین نے ادھر بیٹھے بیٹھے الجھے بال سلجھا کر باندھے اور باہر آ گئی' وسیع وعریض سرخ اینٹوں والا گول صحن اور برآمدہ خالی تھا۔ برآمدے کے کونے میں واش روم کے باہر سفید واش بیسن نصب تھا۔ ہاتھ منہ دھو کر وہ پچھلے برآمدے میں چلی آئی۔

حویلی کے آگے اور پیچھے دونوں طرف برآمدے اور صحن تھے۔ حویلی کے اگلے حصے کی ساخت جوں کی توں تھی۔ سب کے پورشن بغیر کسی پارٹیشن کے جڑے تھے' مگر پچھلی طرف سب نے بڑی دادی کی اجازت سے دیواروں کے ذریعے پورشن الگ الگ کیے ہوئے تھے۔ اسے ہمیشہ اس بات پر حیرت ہوتی تھی۔ بڑی دادی نے اس کے پوچھنے پر بتایا تھا کہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے باپ' دادا کی حویلی کی بنیادی ساخت میں تبدیلی ہو یا اس کے حصے بخرے ہوں۔ حویلی میں نہ تو اٹیچڈ واش روم تھے اور نہ ہی جدید کچن' اس لیے انہوں نے اپنے بیٹوں کو خوش دلی سے اجازت دی تھی کہ وہ حویلی کے پچھلے حصے کو اپنی مرضی کے مطابق تعمیر کرا لیں۔ یوں یہ حویلی جو اگلی طرف سے قدیم روایتی طرز تعمیر کا شاہکار تھی' پچھلی طرف سے جدید دور کے تمام تعمیری لوازمات سے آراستہ تھی۔

اس کے علاوہ دیواروں کی وجہ سے سب کو جوائنٹ فیملی میں رہنے کے باوجود پرائیویسی بھی میسر تھی' یہی وجہ تھی کہ بڑی دادی کے چاروں بیٹے اور ان کی اولادیں بغیر کسی دلی بغض اور جھگڑے کے شیر و شکر تھیں۔ ان لوگوں کی رہائش چونکہ شہر میں تھی' اس لیے انہوں نے اپنے پورشن کے پچھلی طرف کوئی تبدیلی نہیں کروائی تھی۔ پچھلی طرف صحن میں املتاس' شیشم' کیکر اور سرو کے گھنے درخت تھے۔ جن کی وجہ سے یہاں سارا دن چھاؤں رہتی تھی۔ درختوں کے نیچے چارپائیاں بچھی تھیں۔ ماہی ادھر ہی عفرا' رانیہ اور فضا کے ساتھ گپیں لڑا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر عفرا نے ہاتھ ہلایا۔ وہ مسکراتی ہوئی ان کے قریب آ بیٹھی۔

"ہم نے تو خوب فالسے کھا لیے' اب باقی تمہارے۔" عفرا نے پلیٹ اس کی گود میں دھر دی۔

وہ فالسے چکھتے ہوئے اردگرد کا جائزہ لینے لگی۔ تین اطراف دیواروں کے ساتھ کیاریاں بنی تھیں' جن میں صرف اور صرف موتیا کے پھول تھے' جن کی بھینی بھینی خوشبو فضا میں رچی تھی۔ ان پر رنگ برنگی تتلیاں منڈلا رہی تھیں۔

"کہاں گم ہو؟" رانی نے اس کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجائی۔

"کہیں نہیں بس تتلیاں دیکھ رہی ہوں۔"

"انہیں پکڑیں؟" املی اور آلو بخارے کا شربت لاتی رانیہ نے اشتیاق سے پوچھا۔ اسے تتلیوں کا رنگ چرانا بے حد اچھا لگتا تھا۔

"تتلیاں قدرت کی خوب صورتی میں اضافے کے لیے ہوتی ہیں' ہمارے ہاتھوں یا کتابوں کی خوب صورتی کے لیے نہیں۔" اس کی نظر اب بھی ادھر ہی تھی۔

"واہ! کیا فلسفیانہ انداز ہے بات کرنے کا۔" اسے شربت کا گلاس دے کر رانیہ بھی اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"بھئی! کیوں نہ ہو' آخر کو فلاسفی پڑھتے پڑھتے سال ہونے کو آیا ہے۔" ماہی نے اطلاع دی۔

"کیا؟" وہ سب چلا اٹھیں اور نین کو یوں دیکھنے لگیں جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔

"میں بتاؤں نین نے یہ سبجیکٹ کیوں رکھا ہے۔" ماہی کو شرارت سوجھی۔ نین کا رنگ اڑ گیا۔

"ہاں' ہاں بتاؤ۔" سب کو وجہ جاننے کا اشتیاق ہوا۔

"دراصل۔۔۔" اس نے آنکھیں دکھاتی نین پر نظر جمائی۔ "اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا اس لیے۔" وہ شوخی سے بولی تو سب ہنس دیں۔

نین نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے فضا کی گود میں رکھا میگزین اسے دے مارا' جو وہ "تھینک یو" کہہ کر کیچ کر گئی اور ورق گردانی کرنے لگی۔

"اڑی چھوکریوں! تم سب ادھر کٹھیاں (اکٹھے) ہو' ادھر تمہاریاں میریں (مائیں) کام میں لگی ہیں۔ چلو چل کر ان کا ہاتھ بٹاؤ اور تم دونوں کو تمہاری دادی بلا رہی ہیں۔" دروازے سے بوا کوڑی (کڑوی) کا سر ابھرا۔ ان کی پاٹ دار آواز نے ان کی ہنسی کو بریک لگا دی۔ وہ ٹھیٹھ سرائیکی لہجہ میں اردو اور سرائیکی ملا کر بولتی تھیں۔ منہ بناتے ہی سہی' مگر سب کو اٹھنا پڑا۔

☼ ☼ ☼

حویلی آتے ہی شاہ ظل اور چھوٹے چاچو زمینوں کے انتظام میں مصروف ہو گئے تھے۔ اگرچہ دادا نے اپنی گاؤں والی زمینیں بیچ دی تھیں' مگر دادی کی زمینیں باقی تھیں' جن کی آمدنی سے انہوں نے گاؤں میں اسکول' ڈسپنسری اور اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے کام شروع کرا رکھے تھے۔ بڑی دادی کے بیٹے نہ صرف ان کاموں کی نگرانی کرتے تھے' بلکہ اپنی طرف سے بھی بھرپور حصہ ڈالتے تھے۔ وقت نے ہر چیز کی طرح حویلی کے مردوں کی روایتی جاگیردارانہ ذہنیت کو بھی بہت حد تک بدل دیا تھا۔

برآمدے میں چھتوں کی وجہ سے نیم تاریکی تھی۔ ساری لڑکیاں کونے میں ٹھنڈے فرش پر چوکڑی مارے بیٹھی تھیں۔ درمیان میں ڈھیروں نئے اور پرانے میگزین کھلے تھے' جن کی ورق گردانی کے ساتھ ساتھ دنیا جہاں کے موضوعات زیر بحث لائے جانے کے بعد اب اسی موضوع پر بات ہو رہی تھی' ذرا فاصلے پر سوئچ بورڈ کے نیچے فضا کے سرخ ٹیپ ریکارڈر سے عاطف کی آواز دھیمے سُروں میں گونج رہی تھی۔

"حویلی کے مرد بیرونی معاملات میں خواہ کتنے ہی آزاد خیال ہو گئے ہوں' عورتوں کے بارے میں ان کی سوچ آج بھی وہی ہے۔" فضا نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"نہیں فضا! ان کی سوچ ہر چیز کی طرح عورتوں کے بارے میں بھی بہت بدل گئی ہے۔ دیکھو اگر یونیورسٹیز نہیں جانے دیتے تو گرلز کالج میں تو پڑھنے دیتے ہیں۔ پرائیویٹ آگے پڑھنا چاہیں تب بھی کوئی پابندی نہیں۔ شرم و حیا کے دائرے میں رہ کر ہر طرح کی ڈریسنگ کرنے کی آزادی ہے۔ اگر بازار نہیں جاتے تو کیا ہوا' بازار تو گھر پر آ جاتا ہے نا! ٹیلی فون اپنی مرضی سے استعمال کرتی ہیں ہم۔ ضرورت پڑنے پر نیٹ کے استعمال پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ سیر و تفریح کے لیے ہل اسٹیشن بھی لے جاتے ہیں۔ یہ سب ان کی سوچ میں تبدیلی کا غماز ہی تو ہے۔" عفرا نے اس کی بات کی پُرزور تردید کی۔

"اونہہ! تین' چار سال میں ایک بار کہیں سیر و تفریح کے لیے باہر لے جاتے ہیں۔ یہ حویلی ایک پنجرہ ہے' جس میں ہم جیتی جاگتی لڑکیاں قید ہیں' جو بھی اندرونی آزادی میسر ہے' وہ صرف اس زندان کو خوب صورت بنانے کے لیے تاکہ اس کے قیدیوں کو بھولے سے بھی فرار کا خیال نہ آئے۔" فضا نے تنفر سے سر جھٹکا۔

سب کو اس کی باتیں سن کر جھٹکا لگا تھا' وہ تو سوچ بھی

نہیں سکتی تھیں کہ فضا اتنی متنفر بھی ہو سکتی ہے۔ درمیان میں رکھی پلیٹ میں سجی موتیے کی کلیاں پنکھے کی ہوا سے بار بار بکھر جاتی تھیں، انہیں سنبھالتے ہلکان ہوتی نین نے پلیٹ اپنی گود میں الٹ دی۔ وہ بہت غور سے فضا کی باتیں سن رہی تھی۔

"پتا ہے فضا! پہلے میرے خیالات بھی تمہارے جیسے ہوتے تھے۔ حویلی اور ہمارے گھر کی روایات میں بس انیس بیس کا فرق ہی تو ہے۔ میں بھی ایسے ہی دل ہی دل میں کڑھتی رہتی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے اخبار میں دارالامان میں رہنے والی لڑکیوں کے احساسات و جذبات اور مسائل کے متعلق فیچر پڑھا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا چار دیواری اور اس کا تحفظ کیا ہوتا ہے۔ ہم تو بے حد خوش قسمت ہیں جو ہمیں یہ تحفظ حاصل ہے۔ کون سی ایسی نعمت ہے جو اس چار دیواری کے اندر میسر نہیں؟ حق زندگی، پرورش، عزت، تعلیم، وراثت نیز وہ تمام حقوق جو اسلام نے عورتوں کو دیے ہیں، ہمیں چار دیواری کے اندر حاصل ہیں۔ اس کے باوجود اگر ہم مطمئن نہ ہوں اور ناشکری کریں تو یہ ویسی ہی ناشکری ہوگی جیسی بنی اسرائیل نے من و سلویٰ پر کی تھی اور۔۔۔"

وہ انتہائی جوش سے بول رہی تھی اچانک سب کو گردنوں میں جھولتے دوپٹے جلدی جلدی سیدھے کرتے دیکھ کر ٹھٹکی۔ ان کی نظروں کے تعاقب میں گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو شاہ ظل چلے آرہے تھے، اب بوکھلانے کی باری اس کی تھی۔ ان کی محفل ان کے کمرے کے باہر جمی تھی اور وہ دروازے کے عین سامنے بیٹھی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ گود میں بھری موتیے کی کلیاں چوکھٹ کے باہر بکھر گئیں۔

شاہ ظل نے ایک نظر اسے اور ایک نظر ان کلیوں کو دیکھا اور لمبا ڈگ بھر کر انہیں مسلے بغیر اندر چلے گئے۔ دروازہ بند ہوگیا۔ پیچھے رہ جانے والی ان کی خوشبو محسوس کرتے ہوئے وہ دل کی ابتر ہوتی دھڑکن سنبھالنے لگی۔

"نین اور عفرا! تمہاری باتوں نے ایک دم سے میرے خیالات کی کایا تو نہیں پلٹی، مگر دل پر اثر کرتے ہوئے بہت کچھ سوچنے پر مجبور ضرور کیا ہے۔"

فضا ٹیپ ریکارڈ بند کرکے تار لپیٹنے لگی۔ باقی سب بھی اسے اور عفرا کو سراہتے ہوئے ادھر ادھر بکھرے میگزین اکٹھے کرنے لگیں، مگر نین تو جیسے ان کی باتیں سن ہی نہیں رہی تھی۔ انتہائی احترام سے شاہ ظل کے راستے میں بکھرنے والی کلیاں دوپٹے میں چنتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عقیدت اور چہرے پر محبت ہی محبت تھی۔

اگلی صبح ان کی روانگی تھی۔ فضا، رانیہ، دانیہ، عفرا سب اداس تھیں۔ اداس تو وہ دونوں بھی بہت تھیں۔ بڑی دادی سے بھی خوب اصرار کیا کہ بہت جلد ان کو لے کر ان کی طرف چکر لگائیں۔

☼ ☼ ☼

ماہ نین اور ماہ مہر کالج سے لوٹیں تو گھر میں غیر معمولی چہل پہل کا احساس ہوا۔ کوریڈور میں چھوٹی چچی انہیں دیکھ کر کہنے لگیں۔ "دریہ آئی ہے، لاؤنج میں بیٹھی ہے، ملتی جانا۔"

"کیا دریہ آپی آئی ہیں؟ پھوپھو بھی ساتھ ہیں؟" ماہی نے اشتیاق سے پوچھا۔

"نہیں! آج صبح کی فلائٹ سے اکیلی آئی ہے۔ سرپرائز دینا چاہ رہی تھی، اس لیے پہلے سے اطلاع بھی نہیں دی۔" پھوپھو کی شادی خاندان سے باہر ہوئی تھی، ان کی فیملی بہت روشن خیال تھی۔ دریہ دو سال پہلے اعلا تعلیم کے لیے اپنے چچا کے پاس برطانیہ گئی تھی۔ اسی ماہ اس کی واپسی ہوئی تھی اور پہلی فرصت میں وہ یہاں سب سے ملنے چلی آئی تھی۔ وہ دونوں اس سے ملنے کے لیے بہت پرجوش ہو رہی تھیں۔ آخر کو ان کی "پہلی فی میل فارن ریٹرن کزن" جو تھی۔

لاؤنج میں دادی کے پہلو میں بیٹھی دریہ سی گرین جدید تراش خراش کے سوٹ میں بہت نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔ اسٹیپ کٹنگ اس کے گول چہرے پر بے حد بھلی لگ رہی تھی۔ بلاشبہ وہ پہلے سے زیادہ خوب صورت ہوگئی تھی۔ اس سے ملنے کے بعد وہ جب تک کپڑے تبدیل کرکے آئیں، کھانا لگ چکا تھا۔ کھانے کے بعد دریہ کی فرمائش پر سکھاں گرین ٹی بنا لائی۔ ڈرائیو وے پر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ گلاس وال کے قریب بیٹھی نین نے پردہ ہٹا کر جھانکا۔ شاہ ظل بریف کیس لیے باہر نکل رہے تھے۔ اسے حیرت ہوئی ان کی واپسی کا ٹائم تو نہیں تھا۔ ساتھ میں پریشانی بھی ہوئی، کہیں طبیعت خراب نہ ہو۔

"لگتا ہے شاہ ظل آگیا ہے۔ میں نے فون کرکے بتایا تو بچہ پریشان ہوگیا، پر تم نے کہا تھا مت بتانا، اس لیے بتایا نہیں۔"

"نانو! آپ نے بہت اچھا کیا۔"

"السلام علیکم۔" دروازہ کھول کر سب کو مشترکہ سلام کرتے ہوئے ان کی نظر دریہ پر پڑی تو ٹھٹک گئے۔

"سرپرائز۔" دریہ نے کھڑے ہو کر کندھے اچکائے۔

"واٹ آ پلیزنٹ سرپرائز۔" ان کی ہم عمر کزن ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھی دوست بھی تھی اور یونیورسٹی فیلو بھی رہ چکی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت بے تکلف تھے۔ اب بھی شاہ ظل چینج کیے بنا ادھر ہی بیٹھ گئے۔ اچھے دوست سے لمبے عرصے بعد ملنے کی خوشی ان کے چہرے سے مترشح تھی۔ دریہ کی آنکھوں کی چمک میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ دونوں یوں باتیں کر رہے تھے جیسے وہاں کوئی تیسرا موجود ہی نہ ہو۔ [illegible]ار اور عذیر کے اسکول سے واپس آنے پر چچی ان کے [illegible] چلی گئیں۔ امی اور بڑی امی بھی اٹھ گئیں۔ دادو [illegible] چلی گئیں۔ دونوں کو ایک دوسرے میں مگن دیکھ [illegible] نین اور ماہی کو اپنا وجود یہاں بے مصرف لگنے لگا۔ [illegible] کی اتنی بے تکلفی وہ بچپن سے دیکھتی آرہی تھیں،

مگر آج نہ جانے کیوں یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لاؤنج کا دروازہ پار کرنے سے پہلے نمین نے مڑ کر دیکھا' دونوں کسی بات پر کھلکھلاتے ہوئے بے حد شاد لگ رہے تھے' اس کی آنکھوں میں دھواں سا بھرنے لگا۔ دل کو انہونی کے خدشات نے جیسے مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

دریہ کیا آئی' ہر طرف چھا گئی۔ ایک ماہ میں یہ عالم تھا کہ سب کی زبان پر دریہ' دریہ تھا' کبھی وہ دادی کے سر پر تیل کی مالش کر رہی ہوتی تو کبھی ممانیوں کے ساتھ کچن میں گھس کر نت نئے کھانے بنا کر سب کی داد سمیٹ رہی ہوتی۔ کبھی ماموؤں کے ساتھ بزنس اور کرنٹ افیرز ڈسکس کیے جا رہے ہوتے تو کبھی فارغ وقت میں زین کے ساتھ گیمز کھیلے جاتے' عمر اور عذیر جو پڑھائی میں تو اچھے تھے' مگر ہوم ورک سے بدکتے تھے' دریہ نے نہ جانے کیسا جادو کیا تھا' اسکول سے آتے ہی نوٹ بکس نکال کر "دریہ آپی' دریہ آپی" کرنے لگتے تھے۔ وہ بہت انٹیلکچوئل اور ہر فن مولا تھی۔ سامنے والے کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر اسے ڈیل کرنے کا ہنر بخوبی جانتی تھی۔

اس نے نمین اور ماہی سے بے تکلف ہونے کی بھی بہت کوشش کی' مگر ہو نہیں پائی۔ اس کی آمد کے بعد مستقل چپ نمین کے ہونٹوں پر آٹھہری تھی۔ وہ اس کی ہر بات کے جواب میں دھیمی سی مسکراہٹ لیے بیٹھی رہتی تھی' جبکہ ماہی کو اس کے پاس بیٹھتے ہی کوئی نہ کوئی کام یاد آجاتا۔

شاہ ظل کے تو کیا ہی کہنے تھے۔ وہ تو پہلے سے اس کے گرویدہ تھے۔ اس کے اصرار پر تین دن آفس سے چھٹی کر کے سارا شہر گھما چکے تھے۔ اب بھی آفس سے آنے کے بعد کبھی لاؤنج میں محفل جم رہی ہوتی تھی تو کبھی اسٹڈی میں بیٹھ کر کتب ڈسکس کی جا رہی ہوتی تھیں' گویا سوائے نمین اور ماہی کے' دریہ کے آنے سے سب ہی بہت خوش تھے۔

نمین کو تو گویا مستقل چپ سی لگ گئی تھی' جبکہ ماہی نمین کے سوا شاہ ظل کے قریب کسی کو برداشت کر ہی نہیں سکتی تھی' خواہ وہ دریہ ہی کیوں نہ ہو۔ دریہ اور شاہ ظل کو ساتھ بیٹھے دیکھ کر دادی دور' دور سے بلائیں لیتی نہ تھکتی تھیں' ایسے میں بڑی امی اور دادی کا مسکراتے ہوئے معنی خیز نظروں کا تبادلہ جہاں ماہی کو تپا دیتا' وہیں نمین کو رلا دیتا تھا۔

نمین کی آنکھ کھلی۔ عجیب سی کسل مندی نے وجود کو باندھ رکھا تھا۔ گھڑی پر نظر پڑی تو ساری آلکس پس پشت ڈال کر جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ یہ شاہ ظل کی شام کی چائے کا وقت تھا۔ وہ نہ جانے کیسے آج اتنی دیر سوتی رہ گئی۔ حلق میں پیاس سے کانٹے چبھ رہے تھے' مگر وہ نظر انداز کرتے ہوئے تیزی سے کچن کی طرف بھاگی۔ اپنے آپ کو کوستے ہوئے انتہائی توجہ سے چائے بنائی۔

"سکھاں!" اس نے کچن کے دروازے کے سامنے سے گزرتی سکھاں کو آواز دے کر روکا۔ وہ اندر چلی آئی۔

"یہ چائے اور اسٹڈی میں دے آؤ۔" اس نے ہمیشہ کی طرح شاہ ظل کا نام لینے سے گریز کیا تھا۔

"یہ چائے خود ہی پی لو' کیونکہ شاہ ظل بھیا کے لیے تو دریہ آپی چائے بنا کر لے بھی گئیں۔"

"اچھا!" حلق میں چبھتے کانٹے جیسے آنکھوں میں جا گھسے تھے۔ بے اختیار دو آنسو گالوں پر لڑھکتے چلے گئے۔

"تم رو کیوں رہی ہو؟" سکھاں نے انتہائی اچنبھے سے پوچھا۔

"نن' نہیں تو۔۔۔ میں رو تھوڑی رہی ہوں۔ دراصل چائے کی بھاپ کی وجہ سے آنکھ میں پانی آگیا۔" جلدی سے آنسو صاف کر کے وہ باہر چلی گئی اور پیچھے سکھاں سوچتی رہ گئی۔

"کیا چائے کی بھاپ بھی کسیلی ہوتی ہے؟"

☼ ☼ ☼

ماہی کمرے میں آئی تو نمین حسب معمول اس وقت کھڑکی میں کھڑی تھی۔ وہ بلاوجہ الماریاں کھنگالنے

لگی۔ نمین کی الماری کے نچلے خانے میں چاندی کا چھوٹا سا خوب صورت صندوق نما جیولری باکس رکھا تھا۔ دادی نے ایسے باکس دونوں کو تحفے میں دیے تھے۔ نمین کے پاس جیولری نہ ہونے کے برابر تھی' اسے شوق ہی نہیں تھا' پھر اس نے کیا بھر رکھا ہے؟

ماہی نے متجسس ہو کر باکس کھولا موتیا کی خوشبو نتھنوں سے ٹکرائی۔ اندر ڈھیر ساری موتیا کی کلیاں تھیں' ایک طرف پن اور دوسری طرف رومال بھی رکھا تھا' اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس پر خون کے دھبے نہیں تھے۔ نمین نے دھو کر اپنے پاس سنبھال لیا تھا۔ اس کی اس بے وقوفانہ حرکت پر تاسف سے سر ہلاتے ہوئے وہ بیڈ پر کہنیوں کے بل لیٹ کر پاؤں جھلاتے ہوئے اسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں عجیب خالی خالی سی تھیں۔ پتلی میں وسوسوں کا ناگ کنڈلی مارے بیٹھا تھا' خدشوں کے زہر نے گلابی چہرے پر زردیاں بکھیر رکھی تھیں۔ اس نے اس کے چہرے پر حسد یا جلن تلاشنی چاہی' مگر شائبہ تک نہیں ملا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ قدم اٹھا کر اس کے کندھے کے اوپر سے باہر جھانکا۔

شاہ ظل کے قریب ہی دریہ بیٹھی تھی۔ درمیان میں میز پر لیپ ٹاپ کھلا تھا' جس کی اسکرین پر نظریں جمائے دونوں کے لب متحرک تھے۔ دریہ کے بال ہوا سے بار بار چہرے پر بکھر رہے تھے' جنہیں کبھی وہ کانوں کے پیچھے اڑس لیتی تو کبھی ہاتھ سے سمیٹ کر اوپر کر دیتی' جو پھر سے بکھر جاتے۔ لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے شاہ ظل نے کچھ کہا تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ شاہ ظل بھی مسکرانے لگے۔

گلابی شام کے پردے پر یہ منظر اتنا مکمل تھا۔ ماہی سے رہا نہ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پردے برابر کر دیے۔ نمین نے کچھ کہے بغیر پھر سے پردہ سرکانا چاہا' ماہی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"آج تم مجھے بتا ہی دو نمین! اس طرح خود کو اذیت میں مبتلا کر کے تم ثابت کیا کرنا چاہتی ہو؟" اس نے درشتی سے پوچھا۔ "تم کوئی اٹھارویں صدی کی ہیروئن نہیں ہو' سو پلیز ڈونٹ ایکٹ لائیک دس؟" اس نے کندھوں سے تھام کر اسے آئینے کے سامنے کرتے ہوئے اس کے پژمردہ عکس کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بہت غصے میں تھی۔ نمین سے رہا نہ گیا تو وہ بھی پھٹ پڑی۔

"تو بتاؤ کیا کروں میں؟ ماہی! سمجھنے کی کوشش کرو' ان سے محبت میں کرتی ہوں میں۔"

اس نے اپنے دل پر انگلی ٹھونکی۔ یہ اعتراف کرتے ہوئے اس کی آواز دھیمی ہو کر آنسوؤں میں بہنے لگی۔ بے دردی سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

"کیا میں جا کر ان سے محبت کی بھیک مانگوں یا پھر اوچھی حرکتیں کر کے خود کو ان کی نظروں میں گراؤں؟ پہلے ہی لاشعوری طور پر اتنی الٹی سیدھی حرکتیں کر چکی ہوں' نہ جانے کیا سوچتے ہوں گے وہ میرے بارے میں۔" لاکھ ضبط کے باوجود اس کی آنکھیں پھر سے بھر آئیں۔

"مگر نمین! دریہ آپی بھی تو ہیں' کبھی ان کی پسندیدہ ڈش بنا رہی ہیں۔ کبھی ان کے لیے چائے بنا کر لے جا رہی ہیں تو کبھی ان کے کمرے کی سیٹنگ بدلوا رہی ہیں۔ مجال ہے جو انہیں گھنٹہ بھر بھی اکیلا چھوڑ دیں۔"

"وہ ان کی بچپن کی دوست ہیں۔ وہ ایک دم سے تو یہ سب نہیں کر رہیں جو عجیب لگے۔ وہ ہمیشہ سے ایسا کرتی ہیں۔ برا تو تمہیں اب لگنے لگا ہے۔ اگر میں ایک دم سے یہ سب کرنے لگوں گی تو سب کے ذہنوں میں سوال اور آنکھوں میں شبہات نہ ابھریں گے؟ اور شاہ ظل وہ بھی اسے میرا چھچھورپن ہی گردانیں گے' مجھے نہیں کرنا ایسا کچھ بھی۔"

"تو یہ بتاؤ! کیا کرو گی؟ برداشت کر لو گی انہیں کسی اور کا ہوتا دیکھ کر؟"

"میں دعا کروں گی۔" اس نے بغیر جھجکے اپنا پرانا جواب دہرایا۔

"دعا سے کیا ہو گا؟" ماہی بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر

نیم وراز ہوگئی۔

"من کی مراد پوری ہوگی ۔۔۔ نہیں تو مجھے صبر آجائے گا' مگر جو بھی ہوگا میرے لیے بہتر ہوگا۔ مجھے اپنے اللہ پر پورا بھروسا ہے۔" اس کے لہجہ میں اتنا یقین تھا' ماہی کو اپنی بے چینی کم ہوتی محسوس ہوئی۔

☼ ☼ ☼

"ہاں دریہ! یہ بتاؤ' آپا کیسی ہیں؟ عرصہ ہوگیا انہوں نے تو چکر ہی نہیں لگایا۔ ہم نے بھی کئی بار آنے کا ارادہ کیا' مگر ہر بار کوئی نہ کوئی مصروفیت آڑے آجاتی تھی۔" دریہ کو لاؤنج میں اکیلے دیکھ کر ای اس کے پاس آبیٹھیں۔

"مما بالکل ٹھیک ہیں ممانی جان! آپ کو سب کو بہت یاد کرتی ہیں۔ آپ کو تو پتا ہے' انہیں اکیلے سفر کرنے کی عادت نہیں۔ میں اور طلال تو ہائیر اسٹڈیز کے لیے باہر تھے۔ پاپا کی اپنی بزنس کی مصروفیات' ایسے میں وہ چاہ کر بھی چکر نہ لگا سکیں۔ میرے ساتھ آنے کا ان کا پورا ارادہ تھا' مگر عین وقت پر ضروری کام آن پڑا' مگر بہت جلد پاپا کے ہمراہ چکر لگائیں گی وہ۔" ہاتھ میں پکڑا میگزین ایک طرف رکھ کر وہ پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کے ہونٹ ہمہ وقت دھیمی مسکراہٹ کے حصار میں رہتے تھے۔ اس کی یہی خوش مزاجی ہی تھی جو سامنے والے کو اپنا گرویدہ کردیتی تھی۔

"نین اور ماہی کہاں ہوتی ہیں ممانی جان! نظر ہی نہیں آتیں۔" دریہ نے ویسے ہی پوچھ لیا۔

"دونوں شاید کسی اسائنمنٹ پر کام کررہی ہیں۔ کالج سے آنے کے بعد کمرہ میں بند ہوجاتی ہیں۔ بھئی دونوں لڑکیاں میری تو سمجھ سے باہر ہیں۔ خاص کر نینی۔ کہاں تو پڑھائی میں نارمل سی ہوتی تھی۔ ہروقت اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے کو تیار اور اب دیکھو! کتنی ذمہ دار ہوگئی ہے۔ فلاسفی' سائیکالوجی اور ہسٹری جیسے سبجیکٹس میں پوری کلاس میں ٹاپ کیا ہے۔ کترکتر چلنے والی زبان پر تو ایسی چپ لگی ہے۔ آج کل تو اس کی آواز سننے کے لیے بھی ترسنا پڑتا ہے' کبھی کبھی تو میں بھی پریشان ہوجاتی ہوں' مگر پھر سوچتی ہوں یہ تبدیلی کی عمر ہوتی ہے' خاص کر لڑکیوں کے مزاج بہت بدلتے ہیں اس عمر میں' شاید یہ سب بھی اسی تبدیلی کا نتیجہ ہے۔" ان کے تفصیل سے بتانے پر دریہ بھی سر ہلانے لگی۔ ماہی کی ہمہ وقت جھنجلاہٹ اور نین کی خاموشی کو اس نے بری طرح محسوس کیا تھا۔

"امی! میری شرٹ کے بٹن تو لگادیں۔ میں نے کل ہی شرٹ پہن کر جانی ہے۔" زین ہاتھ میں شرٹ لیے چلا آیا۔ وہ بٹن لگانے اٹھ گئیں تو وہ دریہ کے ساتھ جم گیا۔

"تمہاری پڑھائی کیسی جارہی ہے؟" دریہ نے اس کے بیٹھتے ہی پوچھا۔

"یہ تو میرے پروفیسرز کو پتا یا والد حضور کو جو ہر مہینے باقاعدگی سے میری رپورٹ لینے کالج آتے ہیں جیسے میں اسکول بوائے ہوں۔ میرے سارے دوست اتنا مذاق اڑاتے ہیں کہ کیا بتاؤں۔ اچھا چھوڑیں! بورنا ٹاپک کو' آیئے گیمز کھیلتے ہیں۔"

"اوکے!" وہ ہر ایک کو اس کی عمر اور مزاج کے مطابق ٹریٹ کرتی تھی' اس لیے جھٹ تیار ہوگئی۔

زین کمپیوٹر پر گیم سیٹ کرنے لگا۔ عذیر بال کھیلتا ہوا اندر آیا۔ بال دریہ کے پاؤں کے پاس آرکی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کک لگا کر عذیر کی طرف اچھالی مگر وہ سیدھی سامنے والے دروازے سے جا ٹکرائی۔ دروازہ ذرا سا کھل گیا' اندر نین جائے نماز پر بیٹھی نظر آرہی تھی' اس کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے تھے۔ آنسو سیل رواں کی مانند بہہ رہے تھے' چادر کے اندر اس جھٹکے کھاتا جسم دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے اسے باقاعدہ ہچکیاں لگی ہوں۔ دریہ کو حیرت ہوئی۔

"ہیلو دریہ آپی! کہاں گم ہیں؟"

"آں' ہاں کہیں نہیں بس۔" وہ اٹھ کر فلور کشن آبیٹھی' پھر گیم کے دوران بھی اس کی نظریں بارہا بھٹک کر دروازے میں جا ٹکتی تھیں' جہاں کا ... کاتوں تھا۔ زین کو اس کا دوست بلانے آیا تو اسے

چھوڑ کر جانا پڑا۔ دریہ جو نین کے پاس جانے کا سوچ رہی تھی' شاہ ظل کے بلانے پر سب کچھ بھلا کر اس کے ساتھ برٹش کونسل کی نئی عمارت دیکھنے چل دی۔

☼ ☼ ☼

ماہ نین نہا کر بائیں باغ میں چلی آئی۔ ہلکی ہلکی چلتی ہوا نے موسم خوشگوار بنا رکھا تھا۔ اسے قدرے ٹھنڈ کا احساس ہوا۔ گرمیاں رخصت ہو رہی تھیں' آم کا پیڑ ویران ہو چلا تھا۔ پچھلے سال دادی نے یہاں ڈھیر سارے لیموں کے پودے لگوائے تھے۔ ان پر پھول کھلے تھے۔ لیموں اور گلابوں کی خوشبو نے ہوا کا دامن تھام رکھا تھا۔ دو سفید اور ایک سرخ بھرپور کھلے گلاب کیاریوں سے نیچے پڑے تھے۔ وہ اٹھا کر کرسی پر آ بیٹھی۔" کچھ سوچ کر سفید گلابوں کو اپنی چھوٹی چھوٹی بالیوں میں اڑس لیا اور سرخ گلاب کی ڈنڈی سے کانٹے نکال کر اسے بھی گیلے بالوں میں اٹکا دیا۔ جامن کے درخت کے پاس دو گلہریاں کھیل رہی تھیں' کبھی گھاس پر لوٹنے لگتیں' کبھی تھوڑا سا تنے پر چڑھ کر نیچے چھلانگ لگا دیتیں۔ وہ ہاتھ پر چہرہ ٹکا کر دلچسپی سے ان کا کھیل دیکھنے لگی۔ میاؤں' میاؤں' بلی کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ اس کا انہماک ٹوٹ گیا۔ اس نے جلدی سے پاؤں اوپر کر لیے۔ اسے نرم نرم بلیوں سے ہمیشہ سے نہ جانے کیوں بہت ڈر لگتا تھا۔ بلی کی موجودگی میں پاؤں نیچے کرنے کی اسے ہمت نہیں ہوتی تھی۔ پچھلے گیٹ کے نیچے سے سرک کر آنے والی سفید بلی جو کالونی میں سارا دن پھرتی رہتی تھی' دیوار کے ساتھ گھسٹ کر آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کی کھال ٹانگ سے ذرا اوپر سرخ ہو رہی تھی۔ ناپسندیدگی اپنی جگہ' اسے تشویش ہونے لگی۔ بلی کی آواز میں بہت درد تھا۔ وہ کراہتی ہوئی پچھلی گیلری میں چلی گئی جو آگے جا کر بند ہو جاتی تھی۔ سدا کی نرم دل نین سے رہا نہ گیا۔ وہ اس کے پیچھے چلی آئی۔ وہ نیم تاریک راہداری کے آخر میں بیٹھی اپنا زخم دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی تھی۔ اسے دیکھتے ہی یوں میاؤں کیا جیسے مدد کے لیے بلا رہی ہو۔ وہ ذرا آگے بڑھی' مگر نیم تاریکی میں بلی کی چمکتی آنکھیں دیکھ کر ہمت جواب دے گئی۔ وہ الٹے قدموں واپس دوڑی' تاکہ کسی کو بلا لائے۔ زین گھر پر نہیں تھا۔ ماہی سو رہی تھی' اسے اٹھانا بے کار تھا۔

"وہ بلی ہے' کوئی بھوت تو نہیں جو مجھے کھا جائے گی۔ ہمت کرو نین! اگر آج ہمت ہار دی تو ساری زندگی یہ بوجھ ضمیر پر دھرا رہے گا۔" خود کو سمجھاتے ہوئے وہ بابا کے کمرے سے بینڈیج کا سامان لے آئی۔ کچن میں جا کر دودھ نیم گرم کر کے چھوٹے پیالے میں ڈالا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ گیلری میں داخل ہوئی' ہمت کر کے دودھ کا پیالہ اس کے قریب رکھ کر خود دوزانو ہو کر بیٹھ گئی' کاٹن ہاتھ میں لیے وہ واضح طور پر کانپ رہی تھی۔ بلی کے قریب پہنچ کر اس کا ہاتھ آگے بڑھنے سے انکار کر دیتا' لاکھ کوشش کرنے پر بھی وہ ڈر کے مارے اسے چھو نہیں پا رہی تھی۔ بلی کی آنکھوں میں بے بسی' تکلیف اور اپنی بے بسی پر وہ زور' زور سے رونے لگی۔ کچھ لمحوں بعد پیچھے قدموں کی آواز ابھری تو چونک کر پیچھے دیکھا۔ گیلری کے آغاز پر شاہ ظل کھڑے حیران نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ یہاں سے گزرتے ہوئے وہ رونے کی آواز سن کر چلے آئے تھے۔

"یہاں کیا کر رہی ہو؟" "بلی!" اس نے ہچکی لی۔ "زخمی ہے' اس کی بینڈیج کرنے آئی ہوں۔"

"تو پھر رو کیوں رہی ہو؟" انہوں نے اچنبھے سے پوچھا۔

"مجھے۔" وہ بتاتے ہوئے ہچکچائی۔ "بلیوں سے بہت ڈر لگتا ہے' اس لیے بینڈیج نہیں کر پا رہی۔" دھیمی آواز میں شرمندگی سے اعتراف کیا۔ "لاؤ! میں کر دیتا ہوں۔" وہ اس کے قریب آ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور بلی کو اٹھا کر اس کا زخم صاف کرنے لگے۔ نین چیزیں پکڑا کر ان کی مدد کرنے لگی۔

"لو! یہ تو ہو گیا' زخم زیادہ گہرا نہیں' ایک ہفتے تک ٹھیک ہو جائے گا۔" انہوں نے احتیاط سے بلی کو پیالہ کے قریب رکھ دیا۔ وہ دودھ پینے لگی۔ "دیکھو کتنی کیوٹ ہے اور تم اس سے ڈر رہی تھیں۔ بلیاں نہ تو زہریلی ہوتی ہیں اور نہ ہی خواہ مخواہ کاٹتی ہیں' اس لیے ان سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ اسے بالکل بچوں کی طرح ٹریٹ کر رہے تھے۔ وہ زور' زور سے سر ہلانے لگی' سر میں اٹکا پھول پھسل کر نیچے جا گرا۔

"چلو اب اس کے رہنے کا ٹھکانہ بھی کیے دیتے ہیں۔ یوں کرو وہ ڈبہ لے آؤ۔" نین جلدی سے ایک طرف پڑے کاٹھ کباڑ میں سے بڑا اور گہرا لکڑی کا ڈبا لے آئی۔ شاہ ظل نے اسے دیوار کے ساتھ سیدھا کھڑا کر کے اطراف میں اینٹیں رکھ کر فکس کر دیا۔ نین نے ادھر ہی پڑی خالی بوری جھاڑ کر ڈبے میں بچھا دی۔ جھٹ پٹ بلی کا عارضی گھر تیار ہو گیا۔ یہ آوارہ بلی تھی' ایک جگہ ٹکنا نہیں جانتی تھی' اس لیے ٹھیک ہو کر یہاں سے چلے ہی جانا تھا۔ وہ لوگ اٹھنے لگے تو بلی آنکھوں میں ممنونیت لیے میاؤں میاؤں کر کے ان کا شکریہ ادا کرنے لگی۔ نین کو ٹوٹ کر اس پر پیار آیا تھا۔ شاہ ظل کے سمجھانے پر اس کا ڈر بھی نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔

"تم روز آ کر اسے دودھ دے جایا کرنا' میں پٹی کر دیا کروں گا۔" ہاتھ دھوتے ہوئے انہوں نے ہدایت کی۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر اندر جانے لگی۔

"سنو!" انہوں نے پکارا۔ وہ پلٹی۔

شاہ ظل ہاتھ میں سرخ گلاب لیے کھڑے تھے۔ وہ انگشت بدنداں رہ گئی۔ انہوں نے اس کی طرف بڑھایا۔ وہ آنکھوں میں حیرت و خوشی کا جہاں آباد کیے کبھی انہیں اور ان کے ہاتھ میں پکڑے گلاب کو بس دیکھتی رہ گئی۔ دل ناداں نے لمحہ بھر میں خوش فہمیوں کے تاج محل بنا ڈالے تھے۔

"یہ تمہارا ہے نا۔" اپنے ازلی بے نیازانہ انداز میں پھول اسے پکڑا کر وہ اندر چلے گئے۔

"کیا ہوا جو یہ گلاب میرا تھا۔ دیا تو شاہ ظل نے اپنے ہاتھوں سے ہے نا۔" یہ عام سا گلاب اس وجہ سے اس کے لیے بہت قیمتی ہو گیا تھا۔ انتہائی احترام سے پھول کو آنکھوں سے لگا کر ہاتھوں کے پیالے میں سنبھال لیا۔

اس کی آنکھوں میں عقیدت اور چہرے پر [illegible] محبت پھیلی تھی۔ ٹیرس پر کھڑی دریہ نے یہ سب بہت غور سے دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

زندگی کی گاڑی اپنی مخصوص رفتار سے رواں دواں تھی' جب ایک زوردار جھٹکا لگا۔ دادی کو پہلا ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ رات کو عشاء کے بعد حسب معمول سب کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں کہ اچانک دل میں ناقابل برداشت درد اٹھا' وہ گرنے کو تھیں کہ بیٹوں نے آگے بڑھ کر تھام لیا۔ پورے گھر میں افراتفری مچ گئی۔ فوراً" ایمبولینس منگوا کر انہیں اسپتال شفٹ کر دیا گیا۔ بیٹوں نے ساری رات آئی سی یو کے باہر چکراتے گزار دی۔ گھر میں سب نیند سے بے نیاز دعاؤں میں مصروف رہے۔

دو' روز نزدیک کے جن جن رشتہ داروں کو اطلاع ملی' سب دوڑے چلے آئے۔ دادی کا وجود محبتوں سے گندھا تھا۔ یہ ان کی دی ہوئی بے پایاں محبت ہی تھی جو سب کو یوں بے چین کیے ہوئے تھی۔ بلاشبہ وہ بہت خوش قسمت تھیں جو اس پُر فریب دور میں ان کی محبتوں کی قدر کی جا رہی تھی۔

دو ہفتے اسپتال میں رہنے کے بعد انہیں ڈسچارج کر دیا گیا۔ وہ بہت بہتر تھیں' مگر کمزوری بہت ہو گئی تھی۔ زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتیں۔ بڑی دادی بھی کئی دن رہ کر گئی تھیں۔ پھوپھو اور پھوپھا آئے تھے۔ پھوپھا تو ہفتے بعد بزنس کی مصروفیت کی وجہ سے چلے گئے' جبکہ پھوپھو رک گئی تھیں۔ بیٹے' بیٹی' بہوؤں' پوتے' پوتیوں' نواسی نے مل کر ان کی ایسی خدمت کی کہ وہ مہینے بھر میں پہلے جیسی بھلی چنگی ہو گئی تھیں۔

کل دریہ لوگوں کی واپسی تھی۔ دادی نے کچھ سوچ کر بڑی بہو کو بلوایا۔ وہ اس وقت اکیلی تھیں۔

"ادھر میرے پاس آ جاؤ۔" انہیں صوفے پر بیٹھا دیکھ کر بولیں۔

"ماں! کوئی خاص بات ہے کیا؟" حیران حیران سی وہ

ان کے قریب آبیٹھیں۔

"بہت ہی خاص بہو! دراصل میں شاہ ظل کے متعلق بات کرنا چاہ رہی تھی۔ ماشاءاللہ سے پڑھائی مکمل کرچکا ہے۔ کاروبار میں بھی قدم جمالیے ہیں۔ اب اور کس چیز کا انتظار ہے؟ زندگی کا کیا بھروسا میں آج ہوں' کل نہیں۔ بڑی خواہش ہے میری اور کچھ نہیں تو مرنے سے پہلے پوتوں کی دلہنیں ہی دیکھ لوں۔"

"ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں اماں! اللہ آپ کو لمبی حیاتی دے۔ آپ کی دعائیں سدا اس گھر کو یوں ہی آباد رکھیں' میں تو خود بھی چاہتی ہوں جلد از جلد گھر میں بہو آئے۔ حسنہ کل واپس جارہی ہے۔ میں سوچ رہی تھی آج شاہ ظل سے بات کرکے اس کے کانوں میں دریہ اور شاہ ظل کے رشتے کی بات ڈال دوں' پھر جیسے ہی آپ سفر کے قابل ہوں گی ہم سب باقاعدہ رشتہ لے کر جائیں گے اور ساتھ ہی رسم بھی کرتے آئیں گے۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔" انہوں نے ان کا ہاتھ تھپتھپایا۔ وہ سارا پروگرام طے کیے بیٹھی تھیں' اٹھنے لگیں تو دادی نے اپنا نحیف ہاتھ ان کے کندھے پر رکھ کرانہیں روکا۔

"آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں اماں؟ کھل کر بتایئے ناں۔" انہیں متذبذب دیکھ کرانہوں نے اصرار کیا۔

"ہاں! وہ کیا ہے کہ رات میں شاہ ظل کی شادی کی بات کررہی تھی۔ ماہی میرے پاس ہی بیٹھی تھی۔ پتا ہے اس کے جو دل میں ہوتا ہے بغیر سوچے سمجھے بول دیتی ہے۔ کہنے لگی میں نے تو بھابھی کے روپ میں ہمیشہ نین کو ہی دیکھا ہے' اس کے سوا کسی کو بھابھی بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتی اور نہ ہی آپ کچھ ایسا سوچیں۔" دادی کافی الجھی ہوئی تھیں۔

"دراصل اماں! دونوں بچپن سے ساتھ رہی ہیں۔ ایک جان دو قالب ہیں' اسی لیے ماہی نے ایسا سوچ لیا ہوگا' ورنہ نین تو شاہ ظل سے بہت چھوٹی ہے۔" انہوں نے ماہی کی بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔

"ہوں!" دادی نے ہنکارا بھرا۔ وہ شاید نین اور دریہ کے درمیان الجھ سی گئی تھیں' دونوں ہی انہیں عزیز تھیں۔

"اماں! میرے لیے تو دریہ اور نین ایک برابر ہیں۔ دونوں ہی اپنی بچیاں ہیں۔ زندگی شاہ ظل کو گزارنی ہے تو کیوں نہ فیصلہ بھی اس پر چھوڑ دیں۔ اس طرح ہم بھی مطمئن رہیں گے اور شاہ ظل کی مرضی کے آگے ماہی بھی کوئی اعتراض نہ کرسکے گی۔" انہوں نے سادہ سا حل نکالا تو دادی بھی مطمئن ہوگئیں۔

"ہاں! یہ ٹھیک ہے گا۔" شاہ ظل اور دریہ کی انڈر اسٹینڈنگ دیکھتے ہوئے سب ہی اس کا فیصلہ جانتے تھے۔ یہ پوچھنا تو بس "رسما" ہی تھا۔

"اماں! آپ کی دوائیوں کا ٹائم ہونے والا ہے۔ پہلے سوپ پی لیجیے۔ ابھی یہ باتیں ہورہی تھیں کہ منجھلی بہو سوپ لیے چلی آئیں۔

"یہ رکھ کر تم بھی میرے پاس آبیٹھو۔" ان کے ہاتھ سے پیالہ لے کر تپائی پر رکھتے ہوئے انہیں اپنے قریب بٹھالیا۔

"اب جو بات میں تم سے کرنے جارہی ہوں بہت تحمل سے سننا' اسے میرا حکم نہیں صرف اور صرف مشورہ سمجھنا۔" وہ لحہ بھر کو چپ ہوئیں۔ دونوں بہوؤں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"کہیے ناں اماں۔" دونوں نے اصرار کیا۔

"دراصل میں ماہی اور زین کے متعلق سوچ رہی تھی۔"

"ماہی اور زین۔" دونوں نے بیک وقت اچنبھے سے پوچھا اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس دیں۔

"ارے اماں! یہ بات ہمیں نہیں بچوں کو تحمل سے سننا چاہیے۔"

"زندگی بچوں کو گزارنی ہے۔ پہلے ان کی رضامندی لو۔ کوئی زبردستی مت کرنا' کیونکہ زبردستی کے رشتے کچے دھاگے کی مانند ہوتے ہیں۔ حالات کا ایک ہی جھٹکا انہیں توڑنے کو کافی ہوتا ہے۔"

"وہ آج کل کے بچے ہیں اماں! کوئی زبردستی ہونے بھی نہیں دیں گے۔ آپ بے فکر رہیں۔" بڑی بہو نے یقین دلایا۔ سوپ پی کر دواؤں کے زیر اثر سوتے ہوئے وہ واقعی بے فکر تھیں۔

☼ ☼ ☼

لاؤنج کے ایک سرے پر ماہی اور عذیر پارٹنر بنے موجود تھے۔ دوسرے سرے پر زین' عمیر کو لیے بیٹھا تھا۔ لاؤنج میں ہر طرف کاغذ ہی کاغذ بکھرے تھے۔ دونوں کاغذ کے ڈرون تیار کرکے ایک دوسرے پر حملے کررہے تھے۔ نتیجتاً" سارا لاؤنج کاغذ کے جہازوں سے سجا تھا۔

"ماہی! زین! بابا تم دونوں کو۔" سکھاں جو دور سے کچھ کہتے ہوئے آرہی تھی' لاؤنج کی حالت زار دیکھ کر صدمے سے اس کی زبان گنگ رہ گئی۔

"میں نے کچھ دیر پہلے یہاں کی صفائی کی تھی۔ اب لاؤنج کو دیکھ کر لگ رہا ہے کہ کبھی اس کی صفائی بھی ہوئی ہوگی؟" وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر پھنکاری۔

"نہیں لگ رہا تو کیا ہوا' ہم ان بکھرے کاغذوں پر لکھ دیتے ہیں۔ محترمہ سکھاں صاحبہ نے کچھ دیر پہلے یہاں کی صفائی کی تھی۔"

"آپ تو چپ ہی رہو زین بابا! ماہی سچ کہتی ہے' پتا نہیں کیسے میڈیکل کالج میں پہنچ گئے آپ کو تو۔" اپنی ہی دھن میں بولتے ہوئے "ڈنگر ڈاکٹر ہونا چاہیے تھا۔" کہنے سے خود کو بمشکل روکا۔

"ہاں! آپ کو تو۔ بتاؤ! ذرا کیا آپ کو تو؟" اس نے زین کی دکھتی رگ کو چھیڑا تھا' اس کا طیش میں آنا یقینی تھا۔

"آپ کو تو۔ آپ کی امی بلا رہی ہیں اور ماہی! تم کو بھی تمہاری امی بلا رہی ہیں۔" اس نے جلدی سے بات پلٹی۔ دونوں کے والدین کے کمرے آمنے سامنے تھے۔ دونوں نے بیک وقت دروازوں پر دستک دی۔

"جی امی! آپ نے بلایا؟" زین امی کے قریب بیڈ پر بیٹھ گیا۔ دوسری طرف بڑی امی نے ماہی کے اندر آنے پر اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے قریب بیٹھایا۔

"زین! اب جو بات میں تم سے کرنے جارہی ہوں اسے بہت غور اور تحمل سے سننا۔" امی نے بات کرنے کے لیے تمہید باندھی۔ "اس بات کو ہر پہلو سے سوچنا' پھر ہی کوئی جواب دینا۔"

"اب بتا بھی دیں امی!" "سسپنس نہ پھیلائیں۔" انہوں نے ایک طویل سانس لے کر خود کو بات کرنے کے لیے تیار کیا۔

"زین! تمہاری دادی چاہتی ہیں کہ تمہاری شادی ماہی سے ہو۔"

ادھر بڑی امی ماہی سے کہہ رہی تھیں۔

"ماہی! تمہاری دادی کو بڑا ارمان ہے کہ تم سدا اس گھر میں رہو۔ ان کی خواہش ہے کہ تمہاری نسبت زین سے طے کردی جائے۔"

"کیا؟" مختلف الفاظ میں ایک ہی بات سننے کے بعد دونوں کی چیخ بے ساختہ تھی۔

"دیکھو! کچھ بھی کہنے سے پہلے یہ سوچ لو کہ یہ تمہاری دادی کی خواہش ہے۔" امی نے کہا۔

"تمہارے انکار سے انہیں بہت افسوس ہوگا۔" بڑی امی بولیں۔

"آخری فیصلہ تمہارا ہی ہوگا۔" دونوں کو یقین دلایا گیا۔

"زین اور میں؟ نو نیور۔ وہ تو سنتے ہی مجھ سے بڑی چیخ مارے گا۔"

"ماہی سے جب یہ بات کی جائے گی تو وہ تو سارا گھر سر پر اٹھالے گی۔"

"ماہی ڈیئر! بی کول۔ انکار تو زین نے کرنا ہی کرنا ہے' تم کیوں خوامخواہ دادی کی نظروں میں بری بنو۔" اس نے طویل سانس لیتے ہوئے خود کو سمجھایا۔

"ماہی کون سا راضی ہوگی' پھر میں انکار کرکے کیوں سب کی نظروں میں گروں۔" ادھر زین نے سوچا۔

"شکر الحمدللہ! میرے بڑے ابھی حیات ہیں اور مجھ سے زیادہ میرے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔"

ماہی نے گردن جھکائی۔ اس کی فرماں برداری نے

بڑی امی کی آنکھیں نم کر دیں۔

"مجھے تم پر فخر ہے میری جان!" انہوں نے جھٹ اسے گلے سے لگا کر پیار کیا اور دادی کو بتانے چل دیں۔

ادھر زین اپنی انوکھی شوخی لہجے میں سجائے کہہ رہا تھا۔

"امی! میں ایک مشرقی لڑکا ہوں اور مشرقی لڑکے ایسے معاملات میں بولا نہیں کرتے۔۔۔ جو آپ بڑوں کا فیصلہ ہوگا' وہی میری خوشی ہوگی۔"

"جیو میرے لال! تم نے تو مشرقی لڑکیوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ مجھے تم پر فخر ہے۔" اس کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے وہ بھی دادی کی طرف چلی گئیں۔

دادی کے سامنے ماہی کو ڈی گریڈ ہوتا دیکھنے کے لیے زین بھی ان کے پیچھے چل پڑا۔ کچھ ایسی ہی سوچ ماہی کو بھی دادی کے کمرے میں کھینچ لائی۔

☼ ☼ ☼

دروازے پر دونوں کا آمنا سامنا ہوا' ایک دوسرے کو دیکھ کر بھرپور طریقے سے مسکرائے۔ اندر کمرے میں دادی کو اپنے اپنے بچوں کی فرماں برداری کے بارے میں بتاتے ہوئے دونوں کی مائیں پھولی پڑ رہی تھیں۔ ناممکن کو ممکن ہوتا دیکھ کر دادی کی خوشی کا بھی ٹھکانہ نہیں تھا' جبکہ وہاں بیٹھی نین انگشت بدنداں تھی۔

"جگ جگ جیو میرے بچو! اللہ تعالیٰ تم دونوں کی جوڑی سلامت رکھے۔" اپنے ایک طرف زین اور دوسری طرف ماہی کو بٹھا کر گلے لگاتے ہوئے انہوں نے دعا دی۔ دونوں یوں اچھلے جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ ایک دوسرے کو پھنسانے کے چکر میں واقعی دونوں برے پھنسے تھے۔ اب پچھتانا بے کار تھا حیرت و بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"یہ ماہی تو اچھی خاصی خوب صورت ہے۔ حیرت ہے مجھے پہلے کیوں نہیں پتا چلا۔"

"ویسے یہ زین اتنا برا بھی نہیں۔ اچھا خاصا ہینڈسم ہے۔"

دونوں کی نظروں کے زاویے بدلے۔ زین کی آنکھوں میں گھر کرتی محبت نے جہاں ماہی کی نظریں جھکا دیں' وہیں اس کے ہونٹوں پر آتی شرمگیں مسکراہٹ نے زین کے شکوے دور کر دیے۔ جبکہ سامنے بیٹھی نین نظروں کے اس ڈرامائی طلسم کو بے یقینی سے دیکھتے ہوئے خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"سکھاں! شاہ ظل آفس سے آگیا؟" بڑی امی نے ٹرے جھلا کر سیڑھیاں اترتی سکھاں سے پوچھا۔

"جی! وہ تو کب کے آگئے' دریہ آپی کے ساتھ اسٹڈی میں بیٹھے ہیں۔" "ابھی انہیں چائے دے کر آرہی ہوں' آپ کے لیے بھی لاؤں؟"

"حسنہ نے پی لی؟" انہوں نے نند کے متعلق پوچھا۔

"نہیں۔"

"یوں کرو دو کپ امی کے کمرے میں لے آؤ۔ میں ادھر ہی جارہی ہوں۔" حسنہ پیکنگ میں مصروف تھیں' کل صبح کی فلائٹ سے ان کی واپسی تھی' انہیں آتا دیکھ کر خوشدلی سے مسکرا دیں۔ پھر دونوں کافی دیر بیٹھ کر باتیں کرتی رہیں۔ چائے بھی انہی باتوں کے درمیان پی گئی۔ اچانک انہیں خیال آیا۔

"اچھا موقع ہے' کیوں نہ دریہ کی بات کرلی جائے۔ شاہ ظل سے پوچھنا تو محض رسمی کارروائی ہے' اس نے کون سا انکار کرنا ہے۔" ابھی وہ اس بارے میں بات کرنے کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈ ہی رہی تھیں کہ حسنہ کے شوہر کا فون آگیا' وہ معذرت کرکے ادھر مصروف ہوگئیں۔

"چلو! میں شاہ ظل سے بات کر ہی لوں۔" یہ سوچ کر وہ بھی اٹھ گئیں۔ لاؤنج میں نین' ماہی کو گھیرے سکھاں کے ساتھ مل کر اس کا ناک میں دم کیے ہوئے تھی۔

"کاش میرے دو بیٹے ہوتے۔" کھلکھلاتی نین کو دیکھ کر بے ساختہ دل میں خواہش ابھری تھی۔ اسٹڈی

کا دروازہ کھلا تھا۔

شاہ ظل کھڑکی میں کھڑا تھا' جبکہ دریہ ٹیبل کے قریب بیٹھی پیپر ویٹ سے کھیل رہی تھی' انہیں آتا دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھو! تم کہاں چل دیں؟"

"نہیں ممانی جان! بس شاہ ظل سے کچھ خاص بات کرنی تھی' کرلی۔ آپ بیٹھیں! میں جاکر پیکنگ میں امی کی مدد کرتی ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے نیچے چلی گئی۔

"امی! آپ اوپر کیوں آئیں؟ مجھے نیچے بلالیا ہوتا۔" شاہ ظل گھٹنے ٹیک کر ان کے قدموں میں آ بیٹھا۔

"دراصل مجھے تم سے خاص بات کرنی تھی۔" انہوں نے "خاص" پر زور دیا۔

"ارے واہ! ایک خاص بات تو مجھے بھی آپ سے کرنی تھی۔" وہ بھی انہی کے انداز میں بولا۔

"لگتا ہے' آج بہت خاص دن ہے جو سب کو خاص خاص باتیں کرنی ہیں' چلو کہو۔"

"پہلے آپ۔۔۔ آپ خود چل کر آئی ہیں' اس لیے پہلا حق آپ کا ہے۔" اس نے اصرار کیا۔

"یہ بتاؤ! شادی کے کیا ارادے ہیں؟" وہ براہ راست موضوع پر آئیں۔

"بہت نیک۔" وہ خوشدلی سے بولا۔

"خوب! تمہاری دادی نے تمہارے لیے دو پروپوزل بھیجے ہیں' دریہ اور ماہ نین۔" انہوں نے رک کر بغور اسے دیکھا۔

"دونوں ہی اتنی خوب صورت اور خوب سیرت ہیں کہ ان میں سے ایک کا انتخاب کرنا آسان نہیں' مگر دل کا ووٹ سب سے بھاری ہوتا ہے' اس لیے میرا نہیں خیال کہ تمہیں انتخاب میں مشکل پیش آئے گی۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کے بال بگاڑے تو وہ بھی ہنس دیا۔

"آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ دل کے ووٹ کے ہوتے ہوئے مجھے واقعی انتخاب میں کوئی مشکل نہیں۔" ان کا ہاتھ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے وہ اب انہیں اپنی خاص بات بتا رہا تھا' کچھ دیر بعد نیچے اتر کر حسنہ کے کمرے میں جاتے ہوئے وہ بہت مطمئن اور خوش تھیں۔

☼ ☼ ☼

شاہ ظل نیم تاریک کمرے میں بڑی میٹھی نیند سوئے تھے۔ مسز شاہ ظل نے اندر آکر ایک نظر گھڑی پر ڈالی اور ایک نظر اپنے ڈھشنگ ہزبینڈ پر ڈال کر آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے سمیٹ لیے' کمرہ نرم کرنوں سے بھر گیا' شاہ ظل نے ذرا سا کسمسا کر کشن منہ پر لیتے ہوئے کروٹ بدل لی۔ وہ پیار بھری نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل پر بکھری چوڑیاں کلائیوں میں سجانے لگی' پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے شاہ ظل کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ قدرے جھک کر ان کے منہ پر سے کشن ہٹایا اور اپنی کلائی ان کے کان کے پاس چھنکانے لگی۔ چوڑیوں کی سریلی کھنک نے نیند کا طلسم توڑ دیا۔ وہ مسکراتے ہوئے ہاتھ پیچھے ٹکا کر اٹھ بیٹھے

"صبح بخیر!" وہ مسکرائی۔ پلٹنے لگی تو وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے کھڑکی کے پاس لے گئے' پٹ کھولے۔ گلابوں کی مہک نے پل بھر میں کمرہ تازہ کر دیا۔ انہوں نے جھک کر ٹیرس پر رکھے گملے سے پھول توڑا اور اس کے بالوں میں سجا دیا۔ گلاب کی ساری لالی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ شادی کے بعد شاہ ظل اتنے کیئرنگ اور رومانٹک ثابت ہوں گے' یہ تو اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ ان کی شادی کو تین سال ہونے کو آئے تھے' مگر نہ شاہ ظل کے پیار میں کوئی کمی آئی تھی اور نہ اس کی شرماہٹوں میں۔ بقول ماہی۔

"دونوں آج بھی نیو کپل لگتے ہیں"

اس سے پہلے کہ ان کے درمیان کوئی بات ہوتی' دروازے پر زور' زور سے دستک ہونے لگی۔ اس نے آگے بڑھ کر جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

ماہی ان کے بیٹے شاہ نور کو لیے کھڑی تھی جو زور و شور سے گلا پھاڑے رو رہا تھا۔

"لو! سنبھالو اپنے راج دلارے کو۔ نینو مما نینو مما کی رٹ لگا رکھی ہے۔" نین نے جیسے ہی چمکارتے ہوئے نور کو اپنی گود میں سمیٹا' وہ یوں چپ ہو گیا جیسے چابی ختم ہونے پر کھلونا۔

"دیکھ لیں بھیا! اپنے سپوت کے کرتوت۔ میں اٹھالوں تو محترم کا الارم شروع ہو جاتا ہے اور نین کی گود میں جا کر یوں ہو جاتا ہے جیسے رونا آتا ہی نہیں۔" وہ اچھی خاصی جلی بیٹھی تھی۔

"بھئی! بچے تو پیار کا لمس پہچانتے ہیں۔ اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" شاہ ظل نے قدرے شرارت سے مسکراتے ہوئے کندھے اچکائے اور نور کو نین کی گود سے لے لیا۔ وہ جیسے ہی ان کی گود میں آیا' اس کا بھونپو پھر بجنا شروع ہو گیا۔ ماہی نے شاہ ظل اور شاہ ظل نے ماہی کی طرف دیکھا۔ ماہی کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"بچے واقعی پیار کا لمس پہچانتے ہیں' چنانچہ اسے اپنی زوجہ محترمہ کو دیجیے اور نیچے تشریف لائیے! ناشتے پر آپ دونوں کا انتظار ہو رہا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے پلٹ گئی۔

"باپ کے ساتھ بدمعاشی۔" شاہ ظل' نور کے گال پر نرمی سے چٹکی لے کر چینج کرنے چلے گئے۔ نین ٹھیک اسی جگہ نور کے گال پر شاہ ظل نے ہاتھ لگایا تھا' آنکھوں میں عقیدت اور چہرے پر محبت ہی محبت سجائے پیار کرنے لگی۔ دل رب رحمان و رحیم کے شکر سے لبریز تھا' جس نے زندگی کی کوئی خواہش تشنہ نہیں رہنے دی تھی۔ اس کے دل سے نکلی دعاؤں کو قبولیت بخش کر اس کی سوچ اور طلب سے بھی زیادہ نوازا تھا۔

☼ ☼ ☼

آپ سب ماہ نین کو میری بیوی کی جگہ دیکھ کر ضرور حیران ہوں گے' بلکہ حیرت سے زیادہ الجھن میں ہوں گے۔ چلیے! میں۔ شاہ ظل حسین۔ آپ کی حیرت و الجھن دور کیے دیتا ہوں۔ یہاں اسٹڈی میں قدرے گھٹن ہے۔ میں پہلے کھڑکی کھول دوں۔ آج آسمان پر پھر سے بادل چھائے ہیں۔ پیڑ' پودے ساکت ہیں۔ کہیں ان کی ہلکی سی جنبش بادلوں کو اڑا نہ لے جائے۔ پیاسی زمین لب وا کیے منتظر ہے۔ میرا یہاں سے ہٹ جانا ہی بہتر ہے' نہیں تو منظر کشی میں بہت وقت لگا دوں گا۔ ہاں! تو میں آپ کو بتانے جا رہا تھا' کہاں سے شروع کروں؟

میں نے کہیں پڑھا تھا عورت اپنی طرف اٹھنے والی نظر کے رنگ فوراً پہچان لیتی ہے' مگر مرد کے متعلق کسی غلط فہمی کا شکار مت رہیے گا۔ وہ اپنی طرف اٹھتی نظر تو کیا جھکی نظر تک کے تیور پہچان لیتا ہے۔ ماہ نین کے دل کی چوری بھی میں نے تب ہی پکڑ لی تھی' جب شاید وہ اپنے دل کا راز اپنے سائے تک سے چھپائے پھرتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے' جب چھوٹے چاچو کے ہمراہ سب اسلام آباد گئے تھے۔ ماہ نین بیمار تھی' اس لیے وہ گھر پر تھی۔ میں لاہور گیا ہوا تھا۔ واپس آیا۔ تب پہلی بار باہر باغ میں' میں نے اس کی نظروں کے بدلتے رنگ محسوس کیے۔ روتی آنکھوں سے مسکراتی لڑکی پر مجھے غصہ آیا تھا' پھر ماہی کے ساتھ مل کر مجھے امپریس کرنے کی بے تو فانہ کوشش نے مجھے اپنے اندازے کی درستی کا یقین دلایا۔ میرے نزدیک یہ سب ٹین ایج کی نادانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لیے میں نے نظر انداز کر دیا۔ پھر میں نے اسے دعاؤں میں اللہ سے خود کو مانگتے دیکھا۔ پہلی بار مجھے لگا کہ یہ ٹین ایج کی نادانی سے بڑھ کر کچھ ہے' پھر اس نے ایک دم سے میرا سامنا کرنا کم کر دیا' مگر میں جب بھی باہر آ کر بیٹھتا' دو آنکھیں مسلسل میرے تعاقب میں رہتیں۔ میں خواہ پانچ گھنٹے بیٹھتا یا پانچ منٹ پہلے پہل تو مجھے بے حد الجھن ہوئی۔ ان نظروں کی بے خودی سے میں گھبرا جاتا تھا' پھر نہ جانے کب اور کیسے میں ان نظروں کا عادی ہوتا چلا گیا۔ ان میں اتنی عقیدت ہوتی کہ اپنا آپ معتبر لگنے لگتا۔ خواہ گرمی ہو یا سردی' بہار ہو یا خزاں ان آنکھوں میں سدا محبت کا موسم رہتا تھا' پھر میں لاشعوری طور پر ان نظروں کا منتظر رہنے لگا۔

یہ شادی اس کی دعاؤں کا اعجاز تھا۔ میں جو خود کو

ناقابل تسخیر گردانتا تھا' اس چھوٹی سی لڑکی کی نظروں نے مجھے تسخیر کرلیا۔

اس دوران اس نے خود کو اس طرح میری پسند کے سانچے میں ڈھالا کہ میں خود حیران رہ گیا۔ مجھے لمبے بال پسند تھے۔ اس کے کندھوں پر پڑے رہنے والے بال کمر پر جھولنے لگے۔ مجھے گلاب کی خوشبو بہت پسند تھی' میرے کمرے کی ونڈو کے باہر ٹیرس پر ہر طرف گلاب کے گملے سج گئے۔ آفس سے واپس آتے ہی میرے ٹیسٹ کے عین مطابق گرما گرم چائے کا بھاپ اڑاتا کپ میرا منتظر ہوتا' جس کے ہر گھونٹ میں رچا محبت کا ذائقہ مجھے بخوبی محسوس ہوتا تھا' حتیٰ کہ اس نے میرے فیورٹ سبجیکٹ تک رکھ لیے اور یہ سب کچھ اس نے مجھے دکھایا یا جتایا نہیں۔ اس کی معصوم خودداری نے اس کی قدرومنزلت میرے دل میں بڑھا دی۔ مجھے سامنے پاتے ہی وہ جس طرح بے خود ہو جاتی' اس کی بے خودی کے سامنے بھلا میں کب تک سکتا تھا؟

میرے دل کا کورا کاغذ اس کی شدتوں اور عقیدت کے سامنے آکر کب تک کورا رہتا؟ کہتے ہیں محبت کی نہیں جاتی 'ہو جاتی ہے۔ سچ کہتے ہیں' شاید مجھے بھی اس سے محبت ہو چلی تھی۔ "شاید" اس لیے کہ عقل یہ بات ماننے میں تامل کا شکار تھی' مگر پھر جس طرح محبت کا بار اٹھا کر چور ہوتے ہوئے' میرے ہاتھ پر بلک بلک کر روتے ہوئے اس نے اپنا آپ ہارا' مجھے جیت لیا۔ اس کے آنسوؤں نے میرے دماغ میں چھپے "شاید" کو بہا ڈالا اور پہلی بار دل و دماغ کی تمام تر رضا مندی سے میں نے خود سے اعتراف کیا' مجھے واقعی ماہ نین سے محبت ہو گئی ہے۔

پھر دریہ چلی آئی' میرے بچپن کی ساتھی' بہترین دوست اور بہن جی۔ ہاں! بہن۔ ماہی مجھ سے بہت چھوٹی ہے۔ میں نے بچپن سے لے کر آج تک بہن کی کمی دریہ سے پوری کی۔ میری اور اس کی بے تکلفی سے سب ہی غلط فہمی کا شکار تھے اور نین بھی۔ مجھے اس کے ساتھ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں اتنا خالی پن در آتا' مجھے لگتا کہ زمین و آسمان کی وسعتیں بھی اس خلا کو بھر نہیں پائیں گی۔ ایسے میں اپنی محبت سے اس خالی پن کو سجانے کی خواہش شدت سے ابھرتی تھی۔

اب آپ سوچ رہے ہوں گے نا کہ میں نے اپنی اس خواہش کو کبھی عملی جامہ کیوں نہیں پہنایا؟ بے نیازی کے خول میں خود کو کیوں قید رکھا؟ بڑوں کے درمیان پکنے والی کھچڑی سے بے خبر دریہ مجھ سے یہی خاص بات کرنے اس دن آئی تھی۔

"شاہ ظل! تمہیں پتا ہے کوئی بہت شدت سے تمہیں اپنی دعاؤں میں اللہ سے مانگتا ہے۔ تم کسی کی آنکھوں میں نور بن کر سجے ہو۔ کسی کے دل میں تمہارے لیے اتنی عقیدت ہے کہ تمہارا سایہ بھی جس چیز پر پڑ جائے' وہ اس کے لیے محترم ہو جاتی ہے۔"

"ہاں! میں جانتا ہوں۔" میں سکون سے بولا تھا۔

"کیا؟" وہ چیخ ہی تو پڑی تھی۔ "تم' تم جانتے ہو یعنی ادھر بھی معاملہ گڑبڑ ہے؟"

"کیا کروں! ایسی شدت' ایسی محبت و عقیدت دل کو خود بخود پگھلا کر معاملہ گڑبڑ کر ہی دیتی ہے۔"

"تو پھر اتنی بے نیازی کیوں؟" حیرت اس کی آواز سے مترشح تھی۔

"تو کیا کروں؟ اسے ڈیٹ پر لے کر جاؤں؟ لو لیٹر لکھوں یا گانے گاؤں؟" میرے لہجہ میں مزاح کے ساتھ ساتھ سنجیدگی کا عنصر بھی نمایاں تھا۔ وہ الجھ سی گئی تھی۔

"دیکھو دریہ! میں ہر کام ضابطے اور طریقے سے کرنے کا عادی ہوں۔ محبت کرنا اختیاری فعل نہیں۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں' مگر اظہار محبت تو اختیاری فعل ہے نا؟ تم ہی بتاؤ! آخر کس رشتے سے میں اظہار کروں؟ اس کی چاہتوں کو سراہوں۔ بے شک وہ میری کزن ہے' سب سے بڑھ کر میری محبت ہے' مگر کیا اس رشتے سے میں ساری دنیا کے سامنے اس سے اظہار محبت کر سکتا ہوں؟"

میرے پوچھنے پر وہ خاموش رہی۔

"نہیں نا؟ تو خود سوچو جو کام سب کے سامنے کرنا ناجائز ہے' وہ چھپ کر جائز کس طرح ہو سکتا ہے؟ چھپ کر محبتوں کا اظہار نہیں' عشق کیا جاتا ہے۔ وہ میری کزن ہے' میرے گھر کی عزت' میں کس طرح اس کی عزت کو داؤ پر لگا سکتا ہوں؟ اس لیے پہلے میں اسے اپنی عزت بنانا چاہتا ہوں اور پھر بہت ہی جائز اور باعزت طریقے سے اسے اپنا دل دکھانا چاہتا ہوں' جس میں اس کی محبت کے سوا کچھ نہیں۔ تاکہ وہ میری محبت پر برملا فخر کر سکے۔"

"شاہ ظل! آئی ریئلی پراؤڈ آف یو۔ تمہاری سوچ تمہاری طرح بہت شاندار اور خوب صورت ہے۔ یقین کرو! اگر یہی بات آج کی یوتھ سمجھ لے تو کبھی محبت کے نام پر محبت کی تذلیل نہ کرتی پھرے۔"

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ امی چلی آئیں۔ جو بات میں ایک عرصے سے ان سے کرنا چاہ رہا تھا' وہ انہوں نے خود پوچھ کر میری مشکل آسان کر دی۔ جہاں تک دریہ کا سوال ہے تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں' میں نے آج تک سے دوست سے زیادہ بہن سمجھا۔ ہماری انڈر اسٹینڈنگ بھی اسی ناتے سے تھی۔ اس نے ہمیشہ مجھے بھائیوں کا سامان دیا۔ میں نے امی کی غلط فہمی دور کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں اس بات کے لیے بھی تیار کیا کہ وہ پھوپھو کو دریہ کے لیے آنے والا اس کے کلاس فیلو کا رشتہ قبول کرنے پہ راضی کریں' کیونکہ دریہ لاکھ بولڈ سہی' یہ بات کبھی بڑوں سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ ایسے میں ایک دوست اور بھائی کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ میں بن کہے اس کی مشکل حل کروں۔

خیر! مختصر بتائے دیتا ہوں۔ ماہ نین کے گریجویشن کرتے ہی ہماری شادی ہو گئی' جبکہ ماہی اور زین کو بھی نکاح کے بندھن میں باندھ دیا گیا۔ ان کی نوک جھونک آج بھی جاری ہے' ہاں! مگر انداز بدل چکا ہے۔ پھوپھو نے بھی تھوڑے تامل کے بعد دریہ کے کلاس فیلو کا رشتہ قبول کر لیا۔ پچھلے سال اس کی بھی شادی ہو گئی ہے۔ ہماری شادی کے بعد جہاں میری محبت نے ماہ نین کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی لالی میں اضافہ کیا' وہیں اس کی محبت نے مجھے محبتوں کے نئے معنوں سے روشناس کرایا۔ اچھی بیوی کیسے زندگی کی بہترین متاع ہوتی ہے' ماہ نین کی سنگت نے یہ رمز مجھے اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔

شادی کے بعد وہ بہت اچھی بیوی ثابت ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین بہو بھی ثابت ہوئی ہے۔ گھر کی بڑی بہو کی حیثیت سے ذمہ داریاں نبھاتے دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ چند سال پہلے یہ لڑکی کیریوں کے پکوڑے بناتی اور سارے گھر میں کدکڑے لگاتی پھرتی تھی۔ تیز شاہ نور کی آمد نے ہماری زندگی مکمل کر دی ہے۔

"شاہ ظل! کیا کر رہے ہیں آپ؟ جلدی سے نیچے آئیے۔ آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔" باہر سے ماہ نین کی آواز آرہی ہے' مجھے چلنا چاہیے' اپنی پیاری بیوی کو انتظار کی زحمت دینا مجھے گوارا نہیں' مگر ہاں۔ ایک بات بتاؤں۔۔۔

یہ چار دن کی زندگی بہت سادہ ہے۔ اب یہ ہمارے قول و فعل پر منحصر ہے کہ اسے محبتوں سے سجا کر اس طرح خوب صورت بنا دیں یا نفرتوں سے اتنا بدصورت کر دیں کہ لوگ اس سے فرار کی راہیں تلاشنے لگیں۔

☆

سعدیہ غزل

چابی

"مجھ سے چابیاں نہیں سنبھلتیں۔۔۔" عفت علی نے بے بسی سے کہا تھا۔ "کھو جاتی ہیں۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ واقعی۔۔۔" اس کی قریبی' اکلوتی اور بچپن کی دوست ثانیہ عابد نے سنا تو ہنسی۔

"اگر چابیاں کھونے کے ریکارڈ مرتب کیے جاتے تو سارے اعزازات تمہارے ہی پاس ہوتے۔"

"میں کیا کروں ثانی!" عفت علی نے پہلے سے بھی زیادہ بے بس لہجے میں کہا۔

"میں کتنی ۔۔ کوشش کرتی ہوں کہ اپنے پاس موجود چابیوں کی حفاظت کر سکوں۔ انہیں سنبھال کر رکھ سکوں۔۔۔ اور میں احتیاط سے انہیں رکھ بھی دیتی ہوں۔ مگر پھر مجھے یاد کرنے پر بھی یاد نہیں آتا کہ میں نے کہاں رکھی تھیں۔"

"یعنی اتنی حفاظت سے رکھتی ہو۔۔۔ کہ وہ بالکل ہی محفوظ ہو جاتی ہیں۔۔۔ تم چابی رکھ کر بھول ہی جاتی ہو۔۔۔"

"ہاں۔۔۔" عفت نے ہچکچاتے ہوئے اعتراف کیا۔

"تمہارا مسئلہ عدم توجہی ہے۔" ثانیہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "ہر کام کے لیے یکسوئی اور پوری توجہ چاہیے ہوتی ہے۔"

"تمہیں پتا ہے' میں ہر کام توجہ اور یکسوئی سے ہی کرنے کی کوشش کرتی ہوں' مگر یہ چابیاں سنبھالنا۔۔۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"یار! کام کوئی بھی مشکل نہیں ہوتا۔" ثانیہ نے لاپرواہی سے کہا۔ "ہاں۔۔۔ آدمی مشکل بنا دیتا ہے تو وہ ضرور مشکل ہو جاتا ہے۔"

عفت اس سے کہہ نہ سکی۔ جان بوجھ کر تو کوئی بھی اپنے لیے مشکلات نہیں کھڑی کرنا چاہتا' ثانیہ مزید کہہ رہی تھی۔

"اور میں نے تم سے کئی بار کہا ہے۔ سات بادام نہار منہ روزانہ کھایا کرو۔ تاکہ یادداشت بہتر ہو۔"

"میری یادداشت خراب نہیں ہے۔" عفت نے قدرے برا مان کر کہا۔

"چابیاں رکھ کر بھول جانا' یادداشت کی خرابی کی ہی نشان دہی کرتا ہے۔" ثانیہ نے کندھے اچکائے۔

عفت نے اس کے حتمی انداز پر اس سے بحث نہیں کی تھی۔ تاہم اس کا انداز اسے برا ضرور لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس سے چابیاں کھو جاتی تھیں' یہ کوئی اب کی بات نہیں تھی۔ وہ چھٹی جماعت میں آئی تھی' جب علی احمد صاحب نے اسے کپڑوں کے لیے لکڑی کی الماری بنوا کر دی' جس کے دروازے مقناطیسی کشش کے تحت بند ہوتے تھے' مگر ان میں قفل بھی لگے تھے۔ اور اس میں چابیاں بھی لگی تھیں۔

ہر بار جب وہ کپڑے رکھنے یا نکالنے کے لیے الماری کھولتی تو دروازہ بند کرنے کے بعد لازمی لاک میں چابی بھی گھما دیتی۔ اور اگر یہ حرکت چابی گھمانے تک محدود رہتی تو کوئی بات نہیں تھی۔ وہ تو بے دھیانی میں چابی نکال بھی دیتی تھی۔ اور پھر کہیں رکھ کر بھول بھی جاتی اور پھر جب الماری کھولنے کی ضرورت پڑتی تو تلاش بسیار کے بعد بھی چابی نہ مل پاتی۔ نتیجتاً لاک توڑنا پڑتا۔ اس کے بعد تبدیل بھی کرنا پڑتا۔ تبدیل ہوتے لاک کے ساتھ چابی بھی تبدیل ہو جاتی۔ اور نئی چابی کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوتا۔۔۔

سب سے مزے دار بات یہ ہوتی کہ نیا لاک لگنے کے کچھ عرصے بعد ہی پرانی چابی بازیاب ہو جاتی مگر ظاہر ہے وہ پھر کسی کام کی نہیں ہوتی۔ گھر والوں کی ناراضی مول لینا پڑتی سو الگ۔۔۔

"پچھلی مرتبہ بھی تم سے کہا تھا کہ یہ لاک اور چابی صرف خوب صورتی کے لیے ہے۔" تیسری مرتبہ لاک تبدیل کروانے کے بعد علی احمد صاحب نے خفگی سے کہا تھا۔ "جب الماری کے دروازے مقناطیسی کشش کے تحت بند ہو جاتے ہیں تو۔۔۔ آخر تمہیں لاک میں چابی گھمانے کی ضرورت کیا پڑی رہتی ہے۔۔۔؟"

"اوں۔۔۔ چلو۔۔۔ لاک میں چابی گھما بھی دیتی ہے تو نکالنے کی کیا ضرورت ہے؟" علی احمد کے جملوں میں مزید کا اضافہ بیگم علی احمد نے کیا تھا۔

"اوں۔۔۔ اگر چابی نکال ہی دیتی ہو تو کم سے کم سنبھال کے تو رکھا کرو۔" علی احمد نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"سنبھال کے ہی تو رکھتی ہوں۔" عفت سر جھکا کر اب تک ماں باپ کی جھاڑ پھٹکار سن رہی تھی منمنائی۔

"سنبھال کے رکھتی ہوتیں تو تیسری بار لاک تبدیل کرنے کی ضرورت نہ پیش آتی۔" بیگم علی نے چڑ کر کہا تھا۔

"اوں۔۔۔ بس۔۔۔ اب یہ آخری بار ہے" علی احمد نے تنبیہ کی۔ "اس کے بعد اگر چابی کھوئی تو میں لاک ہی نکلوا دوں گا۔"

اور بدقسمتی سے کچھ ہی دن بعد انہیں اپنی تنبیہ پر عمل درآمد کرنا پڑا۔ خوب صورت مہاگنی الماری میں لاک کی جگہ اب ایک بدنما سا گول سوراخ رہ گیا تھا۔

اسکول لائف سے نکل کر کالج میں آنے تک چابیاں کھونے کے چند مزید واقعات رونما ہوئے۔

یونیورسٹی میں آنے پر پریکٹیکل کلاس کے لیے ہر گروپ کو ایک لاکر الاٹ ہوا۔ گروپ لیڈر ہونے کی حیثیت سے لاکر کی چابی عفت کے ہاتھ میں آئی۔ پھر یکے بعد دیگرے دو چابیاں کھو جانے کے بعد گروپ کے باقی افراد اس کو چابی دینے سے ہچکچانے لگے اور فیصلہ کیا گیا کہ ہر ممبر باری باری چابی اپنے پاس رکھے گا اور دیگر افراد کی باریوں میں عفت کی باری جان بوجھ کر چھوڑ دی جاتی تھی۔ شروع شروع میں عفت کو

محسوس ہوا کہ یہ محض اتفاق ہے، مگر بعد میں اپنے گروپ کے لوگوں کا گریز اسے سمجھ میں آنے لگا تھا۔
ان دنوں سلمیٰ مشتاق کے پاس لاکر کی چابی تھی اور چھٹیاں کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔
"کیا مصیبت ہے آخر۔؟" اس دن بالآخر عفت کا پیمانہ صبر لبریز ہی ہو گیا۔ "سامان رکھنا یا نکالنا ہوتا ہے اور سلمیٰ صاحبہ عین پریکٹیکل والے دن ہی غائب ہوتی ہیں۔"
"تم تب ہی ہوتی ہے نا۔" ثانیہ نے جو اس وقت ثانیہ محبوب تھی اس پر بھرپور چوٹ کی۔
"تم سے کم اطمینان تو ہوتا ہے کہ چابی اس کے پاس موجود ہے۔ محفوظ ہے۔ تمہاری طرح کھو تو نہیں دیتی۔"
عفت اس چوٹ پر خفت زدہ سی ہو گئی۔
"اب ایسا بھی چابی کی حفاظت کیا کرنا۔!" گروپ کی ایک اور فرد نے منہ بنا کر کہا۔ "جب وقت ضرورت لا کر کام نہ آسکے تو اس چیز کا فائدہ کیا ہے؟"
"ہاں۔ ہاں بھئی! آئندہ سے سلمیٰ کو چابی نہیں دی جائے گی۔" گروپ کے باقی افراد نے بھی تائید کی تھی۔
یونیورسٹی کا تکلیف دہ دور بھی گزر گیا۔ عملی زندگی میں قدم رکھنے کا مرحلہ آگیا۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ اس نے اور ثانیہ نے ایک ساتھ ایک ہی جگہ سے جاب لائف کا آغاز کیا۔ کچھ مہینے جاب کرنے کے بعد ثانیہ نے مسز ثانیہ عابد کے درجے پر فائز ہو کر جاب چھوڑ دی۔ اسے جاب کرتے ہوئے مزید کچھ سال گزرے۔ اس سے چھوٹی بہنوں کی بھی شادیاں ہو گئیں۔ چھوٹے بھائیوں کی بھی جاب لگ گئی۔
گھر میں جو گنتی کے چند افراد رہ گئے تھے۔ ان کے گھر لوٹنے کے اوقات بھی مختلف تھے۔ لہٰذا مختلف اوقات میں گھر کے افراد کی آمد پر اطلاعی گھنٹی بجتی ہی رہتی تھی۔
"بھئی۔ ہم سے ہر وقت دوڑ دوڑ کر دروازے نہیں کھولے جاتے۔" بیگم علی نے ایک دن جھنجلا کر کہا تھا۔ "آپ لوگ اپنے لیے چابیاں بنوالیں۔ اور ہمیں زحمت سے بچائیں۔"
گھر کی چابیوں کا ایک سیٹ عفت کے حوالے بھی کر دیا گیا تھا، مگر اس سے چابی سنبھالی کب جاتی تھی۔ نتیجتاً" ایک مرتبہ چابیاں کھوئیں تو گھر بھر میں ہلچل مچ گئی۔
"ارے بیٹے۔ کہیں گرا دو تو نہیں دیں۔" بیگم علی نے بوکھلا کر پوچھا۔
"نہیں۔ نہیں۔ امی۔" عفت علی سراسیمہ ہوئی۔ "میں نے پرس میں رکھی تھیں۔"
"پرس سے کہیں گر گئی ہوں گی۔" چھوٹے بھائی مظفر نے اطمینان سے خیال آرائی کی۔
"نہیں۔ کیسے گر سکتی ہیں۔؟" عفت علی روہانسی ہوئی۔ "چھلے میں دو چابیاں تھیں۔ گرتیں تو آواز آتی۔ مجھے پتا چلتا۔"
"آپا! یاد کرلو اچھی طرح۔ پرس میں رکھی بھی تھیں؟" دوسرے چھوٹے بھائی اظفر کا لہجہ عفت کو طنزیہ لگا۔ تاہم ضبط کر گئی۔
"بیٹے ایک بار پھر چیک کرلو۔" بیگم علی نے ہدایت کی۔
"امی۔ اتنی دیر سے یہی تو کر رہی ہوں۔" عفت علی نے بے بسی سے کہا۔
"تو بھئی! تلاش کرو۔" علی احمد نے حکم صادر کیا۔ "گھر کی چابیاں ہیں کوئی مذاق نہیں۔"
"جاؤ۔ دوسری جگہوں پر بھی دیکھ لو۔" بیگم علی نے ایک بار پھر کہا۔
اور عفت نے ہر ممکنہ جگہ پر تلاش کرنے کی کوشش کرلی۔ مگر چابیاں ملنی تھیں نہ ملیں۔ وہ تھک ہار کے بیٹھ گئی۔ علی احمد نے اسے طوعاً" کرہاً" دوسری چابیوں کا سیٹ بنوا کے دیا۔
نئی چابی بنوانے کے کچھ ہی دن بعد دراز کی صفائی کے دوران پرانی چابیوں کا سیٹ بھی برآمد ہو گیا۔
"دیکھا! اسی لیے کہہ رہی تھی کہ دوسری جگہوں پر بھی دیکھ لو۔" بیگم علی نے اطمینان کی سانس لے کر

کہا۔
"خیر! چلو اچھا ہوا، یہ سیٹ مل گیا۔" چابیاں لینے کے لیے عفت کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بیگم علی نے کہا۔ "میرے پاس بھی اضافی چابیاں ہونی چاہئیں۔"
عفت نے خوشی خوشی اضافی چابیوں کا سیٹ اپنی امی کو دے دیا۔ ابھی اس کی خوشی کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ ایک واقعہ منتظر تھا۔ اس دن وہ گھر آئی تو پیچھے پیچھے مظفر بھی اندر چلا آیا۔
"آپا۔ یہ کیا ہے؟" کرسٹل کی کی چین میں لٹکتی چمکتی دمکتی دھات کی دو چابیاں اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے مظفر نے پوچھا۔
"میری گھر کی چابیوں کا سیٹ ہے۔" عفت حیران ہوئی۔ "تمہارے پاس کیا کر رہا ہے؟"
"میں بھی آپ سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ یہ سیٹ چابیوں کے سوراخ میں کیا کر رہا تھا؟"
"چابیوں کے سوراخ میں۔؟" عفت نے استعجاب سے دہرایا۔
"جی ہاں۔ آپ۔ یہ کی ہول میں لگا کر نکالنا بھول گئی تھیں۔"
"کیا ہوا مظفر؟" بیگم علی جو اونچی آوازیں سن کر وہیں چلی آئی تھیں، بیٹے کو دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ "اتنی زور زور سے کیوں بول رہے ہو؟"
"امی! یہ آپا کو دیکھیں۔" مظفر نے ماں کو دیکھ کر فوراً" شکایت کی۔ "چابی کی ہول میں لگا کر چھوڑ دی۔"
"ارے بیٹے عفت! یہ دن بہ دن تیری یادداشت کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔" بیگم علی نے اسے لتاڑا۔ "کبھی چابیاں کھو دیتی ہے، کبھی کی ہول میں لگا کر چھوڑ دیتی ہے۔"
"امی! وہ تو شکر ہوا کہ چابی مین گیٹ میں لگا کر نہیں چھوڑی۔" مظفر کہہ رہا تھا۔ "ورنہ سوچیں کیا ہوتا۔"
"ارے! ہونا کیا تھا۔ جس کے ہاتھ بھی لگتی اس کی عید ہو جاتی۔" بیگم علی نے کہا۔ "تو بتاؤ! شہر کے حالات دیکھو۔ چور ڈاکو، لٹیرے بغیر دعوت کے گھروں میں گھس جاتے ہیں۔ اس صورت میں تو بلا دے پر آمد ہوتی۔"
"میرا خیال ہے ان چابیوں کا سیٹ بھی مجھے اپنے پاس رکھ لینا چاہیے۔"
بیگم علی، مظفر کے ہاتھ سے چابیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھیں اور عفت ہونقوں کی طرح سے ان کی شکل تک رہی تھی۔ احتجاج کے لیے اس کو الفاظ نہیں مل پا رہے تھے۔ ویسے۔ وہ احتجاج کرتی بھی تو کس بنا پر۔؟؟؟ فرد جرم عائد ہونے کے لیے سارے شواہد دن کی طرح روشن تھے۔
اب جبکہ گھر کی چابیاں اس کے پاس نہیں تھیں تو گھر میں داخلے کے لیے اطلاعی گھنٹی بجا کر اسے کافی کافی دیر انتظار کرنا پڑتا تھا کیونکہ جو وقت اس کی آمد کا تھا۔ وہی وقت بیگم علی کی نیند کا تھا۔ یہ سلسلہ مزید طویل ہوتا۔ اگر چھوٹے بھائیوں کی شادی نہ ہو جاتی۔ چھوٹی بھابھیوں کے آجانے کے بعد اس کو قدرے آرام ہوا، مگر تب دوسرے مسائل سر اٹھانے لگے تھے۔
عفت اب چالیس سال کی ہو چکی تھی۔ یہ اتفاق تھا کہ وہ اور ثانیہ عابد ایک بار پھر ایک ساتھ ایک ہی جگہ پر کام کر رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"عفت! یہ ایک کلائنٹ کی فائل ہے۔" آفس سے نکلنے سے کچھ دیر پہلے ثانیہ نے ایک نیلے رنگ کی فائل عفت کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔
"باس کہہ رہے ہیں، تمہیں دے دوں، کیونکہ فائلز کا ریکارڈ تو تمہارے ہی پاس ہوتا ہے نا۔"
عفت نے خاموشی سے فائل اس کے ہاتھ سے لے کر فائل کیبنٹ میں رکھ دی، مگر برا ہو اس کی خراب عادت کا۔ ساتھ ہی لاک لگا کر چابی بھی اپنی دراز میں ڈال لی۔
اگلے دن عفت آفس پہنچی ہی تھی اور ابھی بیگ بھی کندھے سے نہ اتار پائی تھی کہ ثانیہ اس کے سر پر

آن موجود ہوئی۔
"عفت! کل جو فائل میں نے تمہارے پاس رکھوائی تھی' باس منگوا رہے ہیں۔"
عفت فرمانبرداری سے فائل کیبنٹ کی طرف بڑھی۔ ہینڈل پکڑ کر دراز کھینچی تو اسے لاک پایا۔ کی ہول کی جانب نگاہ کی تو دل دھک سے رہ گیا۔ وہاں چابی کا نام و نشان نہیں تھا۔ اسے ایک دم یاد آیا کہ اس نے چابی دراز میں رکھ دی تھی۔
"مگر کس دراز میں۔۔۔؟"
"کیا ہوا؟" عفت کو ایک کے بعد دوسری دراز کھنگالتا دیکھ کر ثانیہ نے اچنبھے سے دریافت کیا۔
"کچھ نہیں۔"
عفت نے بدستور دراز میں سر اور ہاتھ گھسائے گھسائے سکون سے کہا۔
"جیسے ہی چابی ملتی ہے' تمہیں فائل دے دیتی ہوں۔"
"کیا مطلب ہے۔۔۔ چابی ملتی ہے؟" ثانیہ کے ماتھے پر بل آگئے۔ "چابی کہاں گئی؟"
"کہیں نہیں گئی۔۔۔" عفت نے مصروف سے انداز میں بتایا۔ "دراز میں رکھی تھی۔"
"دراز میں رکھنے کی کیا ضرورت تھی' جب چابی فائل کیبنٹ میں لگی رہتی ہے؟" ثانیہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔
"اب بتاؤ! کلائنٹ آیا بیٹھا ہے۔ باس فائل منگوا رہے ہیں۔۔۔ کیا کروں۔۔۔؟"
"تم پریشان مت ہو ثانیہ!" عفت نے تلاش جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "چابی مل جائے گی۔"
"پریشان مت ہوں؟" ثانیہ نے استہزا سے دہرایا۔ "اچھا مشورہ ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ تمہیں زندگی میں کبھی کوئی کھوئی ہوئی چابی ملی بھی ہے؟"
عفت نے اس بار اسے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے دراز کا سامان چھانتی رہی۔ اسٹیپلر' کاٹن بڈز کا ڈبہ' جیم کلپس' مارکر' اسکاچ ٹیپ' گم اسٹک۔۔۔
یہ شاید اسٹیشنری کی دراز تھی۔ جو ایک کے بعد ایک چیز اس کے ہاتھ لگتی رہی' مگر صرف چابی کے چھلے میں لگی چابی ہی اس کے ہاتھ نہیں لگ سکی۔
ثانیہ نے بھی اب مختلف درازوں کو کھولنا' بند کرنا شروع کر دیا تھا۔ ساتھ ہی اس کی بڑبڑاہٹ بھی جاری تھی۔
"غلطی کر دی میں نے تمہیں فائل دے دی۔ خود ہی کہیں سنبھال کے رکھ دیتی۔ اب پتا نہیں چابی کہاں ہوگی۔ باس انتظار میں ہوں گے۔ غصہ بھی ہو رہے ہوں گے۔ یہاں تلاش ہی ختم نہیں ہو رہی۔" ایک زوردار آواز کے ساتھ اس نے دراز بند کرتے ہوئے کہا۔
"تمہیں پتا ہے عفت۔۔۔" چند لمحے توقف کے بعد اس نے اچانک عفت کو مخاطب کیا۔
"اتنی عمر ہو جانے کے باوجود ابھی تک تمہاری شادی کیوں نہیں ہوئی؟ کیونکہ یہ ایک ذمہ داری ہے اور تم سے ایک عام سی چابی کی ذمہ داری سنبھالی نہیں جاتی تو بھلا گھر اور اس کی چابی کی ذمہ داری کیا سنبھالے گی۔"
ثانیہ کی کی گئی چوٹ سیدھا عفت کے دل پر پڑی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو اس کا دراز میں ٹٹولتا ہاتھ ساکت ہو گیا۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں ثانیہ پر ٹکائے وہ کچھ لمحوں کے لیے تو بھی بھول گئی کہ آخر کیا کر رہی تھی اور کرنا کیا تھا۔ جبکہ ثانیہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی اور مزید کہہ رہی تھی۔
"واقعی! اللہ تعالیٰ بھی بندوں کو دیکھ کر انہیں ذمہ داریاں دیتا ہے۔"
عفت چاہتی تو تھی کہ اسے ایک کرارا سا جواب دے۔ تاہم وہ ایک لفظ بھی کہے بغیر خاموشی سے چابی کی تلاش کی جانب متوجہ ہو گئی۔
بہرحال چابی مل گئی تھی۔ فائل ثانیہ کو دے دی گئی۔ وہ باس کے پاس چلی بھی گئی۔ اس ساری کارروائی میں بمشکل پانچ منٹ لگے ہوں گے۔ ثانیہ کے کہے الفاظ آفس ٹائم کے بعد بھی اس کے آس پاس ہی گونجتے رہے۔

اس دن اسے مظفر کی بیوی کے دیر سے دروازہ کھولنے پر ذرا کوفت نہیں ہوئی۔
اظفر کی بیوی کے ناروا اور روکھے انداز کا بھی اس نے برا نہیں مانا۔
دونوں چھوٹے بھائیوں کے تلخ لہجوں پر اسے دکھ نہیں ہوا۔
بھتیجے' بھتیجیوں کی بدتمیزیوں پر اس کا دل نہیں کڑھا۔
بیگم علی کی سرد آہوں اور علی احمد کے خاموش انداز نے اسے افسردہ نہیں کیا' کیونکہ ثانیہ کے کہے الفاظ کی تکلیف کی شدت ہی کم نہیں ہو رہی تھی۔
اس رات جب عشاء پڑھنے کے بعد اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو بے اختیار آنکھوں میں آنسو آگئے۔
"اے اللہ تعالیٰ! مجھ سے چابیاں کھو جاتی ہیں۔ میں بھول جاتی ہوں۔ غیر ذمہ دار ہوں۔ میں نے کب انکار کیا ہے اس بات سے۔" اس نے فریاد کی تھی۔ "مگر تو بادشاہ حقیقی ہے' آسمانوں اور زمین کے خزانوں کی چابیاں تیرے پاس ہیں۔۔۔ میرے نصیب کا تالا ابھی تک سختی سے بند پڑا ہے۔ زنگ آلود ہو چکا ہے۔ مگر تیری "الفتاح" (کھولنے والا) صفت ہونے کے آگے تالے کا زنگ آلود ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔۔۔ اور میرے نصیب کی چابی تیرے پاس سے کیسے کھو سکتی ہے۔۔۔! تو تو حفیظ (حفاظت کرنے والا) ہے۔۔۔ اور رقیب (بڑا نگہبان) بھی۔۔۔ تو بھولتا نہیں ہے۔۔۔ اور نہ تیری ذات غیر ذمہ دار ہے۔۔۔ اگر ایسا ہوتا۔۔۔ تو اتنی بڑی کائنات کا نظام اب تک تلپٹ ہو چکا ہوتا۔"
عفت دعا مانگتے مانگتے روتے ہوئے جائے نماز پر ہی سو گئی۔
اگلے دن آفس گئی تو ثانیہ کے وہی طور طریقے تھے۔ اسے اپنی کل کی کسی بات پر کوئی شرمندگی اور افسوس نہیں تھا۔ عفت کو اس کی شرمندگی اور افسوس کی ضرورت بھی نہیں تھی' بلکہ وہ تو اس سے بات تک نہیں کرنا چاہتی تھی۔
شام میں جب وہ گھر پہنچی تو چند اجنبی صورتوں کو ڈرائنگ روم میں موجود پایا۔ بیگم علی کو کھلکھلاتا اور علی احمد کو مسکراتا پایا۔
"یہ وہ لوگ تھے۔۔۔ جو پانچ سال پہلے تمہیں دیکھ کر گئے تھے۔" ان لوگوں کے جانے کے بعد بیگم علی نے بتایا۔
"اور اگلے پانچ سالوں کے لیے سو جائیں گے۔۔۔!" عفت نے سنجیدگی سے کہا۔
"شش۔۔۔ کیسی باتیں کر رہی ہو۔" بیگم علی کا موڈ آج بہت خوش گوار تھا' سو برا منائے بغیر اسے ٹوکا۔ "پاگل! تاریخ دینے کے لیے کہہ رہے تھے۔"
عفت استعجاب اور بے یقینی کے عالم میں اپنے گھر کے ہر فرد کی شکل دیکھتی رہی۔
"کمال ہے۔۔۔ دعائیں۔۔۔ یوں بھی قبول ہوتی ہیں۔۔۔!"
وجہ چاہے جو بھی رہی ہو'
بہرحال اس کی شادی ہونے جا رہی تھی۔
جس دن اس کے آفس میں کارڈ پہنچا' اسی دن ثانیہ کی کال اس کے موبائل پر آئی۔
"بہت مبارک ہو عفت۔۔۔"
"ہاں۔۔۔ اللہ تعالیٰ کے بندے تو نامہربان اور بے رحم ہیں۔" اس نے بے تاثر لہجے میں کہا تھا۔ "بڑی بڑی باتیں کتنے آرام سے کہہ جاتے ہیں۔ مگر وہ رحمٰن بھی ہے اور رحیم بھی۔۔۔"
"آئی ایم سوری!" ثانیہ سمجھ گئی کہ اشارہ اسی کی طرف ہے لہٰذا شرمندہ سے لہجے میں کہا۔
"مجھے اس طرح نہیں کہنا چاہیے تھا۔"
"مجھ پر اپنے الفاظ ضائع نہ کرو' بلکہ بچا کے رکھو۔ کسی اور کے کام آئیں گے۔" باوقار انداز میں اس نے کہا۔
"ہاں۔۔۔ ایک بات میں تم سے ضرور کہنا چاہتی ہوں۔۔۔ کہ اللہ تعالیٰ اکثر اوقات بندوں کا امتحان لینے کے لیے بھی ان کو ذمہ داریاں دیتا ہے۔" ثانیہ نے مزید کچھ کہے بغیر فون بند کر دیا۔

☆ ☆ ☆

"لو بہو! آج سے خزانوں کی چابیاں تمہارے حوالے۔" ولیمہ والی رات اس کی ساس نے چابیوں کا گچھا اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "سیاہ کرو۔ سفید کرو۔ تم مالک۔"

"آپ۔۔۔ آپ۔۔۔" عفت جواب عفت ابراہیم حسن تھی' چابیوں کا گچھا دیکھ کر ہونق سی ہو گئی' سو ہکلانے لگی۔

"میں نے بہت دیکھ بھال کر لی۔" وہ مشفقانہ انداز میں مسکرائیں۔ "اب بس آرام کروں گی۔ چھوٹے بیٹے کے یہاں چلی جاؤں گی۔ اس کے بچوں میں دل اٹکا رہتا ہے میرا۔ ہاں! اگر تم جلد ہی مجھے یہ خوشی دے دو گی تو میں ادھر ہی رہ جاؤں گی۔" عفت ان کی بات پر جھینپ سی گئی۔

اس کی ساس اگلے دن ہی چھوٹے بیٹے کے یہاں چلی گئیں۔ عفت نے گھر کی چابیاں سنبھالنے سے پہلے چابیوں کو الگ الگ چھلوں میں ڈالنے کے بعد LABEL کر دیا تھا۔ پھر ان چابیوں کو ایسی جگہ لٹکایا تھا' جس کے آس پاس اوپر نیچے' دائیں بائیں کہیں کسی دراز' الماری' شوکیس یا میز جیسی دیگر چیزوں کے آثار نہیں تھے۔

ابراہیم حسن نے جب یہ انتظام دیکھا تو مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ "بڑا ترتیب وار انتظام ہے۔"

عفت بھی مسکرا دی تھی۔ اس ترکیب کے ساتھ کافی دن خیریت سے گزر گئے۔

پھر اس رات جبکہ وہ لوگ ایک شادی سے واپس آئے تو گھر کی چابی نکالنے کے لیے اس نے پرس میں جھانکا۔ ایک جیب' دوسری جیب' پھر تیسری جیب۔۔۔ چابی کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔

"کہاں چلی گئی۔۔۔؟" عفت خاصی سراسیمگی سے پرس ٹٹول رہی تھی۔ اور اسی دم ابراہیم نے جو گاڑی پارک کر کے آگیا تھا' خاموشی سے چابی اس کی جانب بڑھا دی۔

"چابی ڈھونڈ رہی ہیں محترمہ۔" مسکراتے ہوئے اس نے کہا۔

"یہ لیجیے۔۔۔ میں گھر کی ایک اضافی چابی ہمیشہ اپنے پاس رکھتا ہوں۔"

"مجھے اچھی طرح سے یاد ہے' نکلنے سے پہلے میں نے چابی پرس میں ہی رکھی تھی۔" ابراہیم کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے عفت مزید باریکی سے پرس چھاننے لگی۔

اب وہ اسے کیا بتاتی کہ چابی کی برآمدگی اس کے لیے کتنی ضروری تھی۔ کیونکہ کسی بھی موقع پر ثانیہ کے کہے الفاظ اسے بھولتے نہیں تھے۔ شعوری اور لاشعوری طور سے وہ کوشش کر رہی تھی کہ گھر اور اس کی چابی کی ذمہ داری بطریق احسن اٹھا سکے۔۔۔ اور ابھی۔۔۔ کیا واقعی اس کی بات سچ ہونے جا رہی تھی۔۔۔؟

عفت حواس باختہ سی ہو گئی۔

اتنے میں ابراہیم' عفت کو نرمی سے ایک طرف کر کے کی ہول میں چابی لگا چکا تھا۔ "کلک" کی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور اسی دم سب سے چھوٹی والی جیب میں رکھی چابی سے اس کا ہاتھ ٹکرایا تھا۔

"دیکھا۔۔۔ میں کہہ رہی تھی نا۔۔۔ میں نے چابی پرس میں ہی رکھی تھی۔" ابراہیم کے پیچھے گھر میں داخل ہوتے ہوئے اس نے شکر کی سانس لے کر چابی نکالی۔

"میں۔۔۔ میں۔۔۔ غیر ذمہ دار نہیں ہوں۔" آخری جملہ کہتے ہوئے بے اختیار اس کا لہجہ بھیگ گیا۔ ابراہیم نے ایک دم پلٹ کر اسے دیکھا۔

"کس نے کہا۔۔۔ تم غیر ذمہ دار ہو۔۔۔؟" استعجاب سے اس نے سوال کیا۔

"محترمہ! میں اس مختصر سے عرصے میں آپ کے ذمہ دار خاتون ہونے کا پوری طرح سے قائل ہو گیا ہوں۔" پھر لطیف سے انداز میں اضافہ کیا۔

"کہیں تو سرٹیفکیٹ دے دوں۔۔۔؟"

عفت ابراہیم نے پانی بھری آنکھوں میں احترام سجا کے اپنے شریک سفر کو دیکھا' جس کے چند الفاظ نے اسے زندگی اور حوصلے دونوں بخش دیے تھے۔

☆

راحت جبیں

ساری بھول ہماری تھی

عریشہ عادلہ کی بیٹی ہے۔ عادلہ بیوہ ہیں اور اسکول میں ملازمت کرتی ہیں' مکان کے دوسرے حصے میں ان کے جیٹھ اور جٹھانی اپنے بچوں نعمان' ثوبان' فرید' فاطمہ اور مریم کے ساتھ رہتے ہیں' بانو اور ساجدہ شادی شدہ بیٹیاں ہیں' عریشہ ثوبان کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتی ہے۔ ثوبان کو علم ہے مگر ابھی اس کی طرف سے اعتراف نہیں ہے۔ عادلہ کو یہ چیز پسند نہیں کیونکہ ان کے جیٹھ کا گھرانہ جاہل ہے۔

نبیلہ' عادلہ اور حمیداں کی نند ہیں' ان کے دو بیٹے ہیں محسن اور جمال' جمال ملک سے باہر مگر اس کی بد مزاج بیوی طیبہ یہیں رہتی ہے۔

ابرار جمیلہ کا بیٹا ہے شہر میں پڑھتا ہے' باپ کی وفات کے بعد چچا کے ساتھ رہتا ہے۔ چاچی کبریٰ کا سلوک اس کے اور اس کی ماں کے ساتھ ناروا ہے۔ اپنے شوہر اصغر سے اکثر ڈانٹ پڑواتی ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ اس کی بیٹی بشریٰ کی ابرار سے شادی ہو جائے مگر ابرار صاف انکار کر دیتا ہے۔ اصغر کو غصہ آتا ہے وہ ابرار پر ہاتھ اٹھا دیتا ہے۔ ابرار ناراض ہو کر گھر چھوڑ دیتا ہے اور شہر آ کر حمیداں کے گھر رہنے لگتا ہے۔ برکت حسین اس کی ماں کے چچا زاد بھائی ہیں۔ حمیداں' ابرار سے سخت بیزار رہنے لگتی ہیں۔

نعمان اپنے اسٹور سے سودا لینے والے ماسٹر صاحب کی بیٹی عائشہ کو پسند کرتا ہے۔ وہ گورنمنٹ ٹیچر ہے۔ نعمان عائشہ کی ماں سے رشتے کی بات کرتا ہے اور ان سے فاطمہ کی شادی تک انتظار کرنے کو کہتا ہے کیونکہ حمیداں کا دونوں بیٹیوں سے پہلے بیٹوں کی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔ عائشہ اور اس کے گھر والے تھوڑی سی حیل حجت کے بعد مان جاتے

ناولٹ

ہیں۔
عادلہ نبیلہ کے کہنے پر بچت کرکے عریشہ کے لیے سونے کا سیٹ بنواتی ہیں۔ عادلہ کے منع کرنے کے باوجود عریشہ حمیداں کو وہ سیٹ دکھا دیتی ہے۔ حمیداں کی عریشہ سے لگاوٹ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔
فاطمہ کی شادی پر حمیداں' عادلہ سے وہ سیٹ مانگتی ہیں۔ عادلہ پریشان ہو جاتی ہیں کیونکہ انہوں نے وہ سیٹ عریشہ کے لیے بہت مشقت سے بنایا ہوتا ہے۔ حمیداں بضد ہوتی ہیں کہ فاطمہ کو شادی پر سونے کا سیٹ دیا جائے جبکہ ان کی حیثیت نہیں ہوتی۔ وہ ثوبان کی فیس کے پیسے نکال لیتی ہیں۔ ثوبان بہت بگڑتا ہے۔ عریشہ' ثوبان کی پریشانی دیکھ کر چپکے سے وہ سیٹ نکال کر حمیداں کو دے دیتی ہے۔
شادی والے دن نبیلہ' فاطمہ کے گلے میں وہی سیٹ دیکھتی ہیں تو عادلہ سے کہتی ہیں۔ عادلہ' عریشہ سے پوچھتی ہیں تو وہ بجائے شرمندہ ہونے کے دھڑلے سے اعتراف کرتی ہے کہ اس سے ثوبان کی پریشانی نہیں دیکھی گئی۔ عادلہ' عریشہ کی حرکت سے اتنی دل برداشتہ ہوتی ہیں کہ ان کا دل بند ہو جاتا ہے۔ عریشہ پچھتاتی ہے۔ ثوبان لگاوٹ سے اسے بہلانے کی کوشش کرتا ہے۔
ابرار کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ عریشہ ثوبان کو پسند کرتی ہے' ساتھ ہی وہ یہ بھی جان لیتا ہے کہ ثوبان اپنے فائدے کے لیے سب کچھ کر سکتا ہے۔ اس کی خود غرضی جان کر ابرار اس سے سخت کبیدہ خاطر ہو جاتا ہے۔
حمیداں کو نعمان کی خواہش کا علم ہو جاتا ہے اور جب عائشہ کی والدہ عادلہ کی تعزیت کرنے حمیداں کے پاس آتی ہیں تو وہ ان سے خوش اخلاقی سے نہیں ملتیں۔
"آج کل ماں باپ نے لڑکوں کو پھانسنے کے لیے اپنی لڑکیوں کو آگے کر رکھا ہے اور لڑکیاں خود ہی معاملہ سیٹ کر لیتی ہیں۔" جیسے سخت الفاظ کہہ کر ان کی بے عزتی کر دیتی ہیں۔
عائشہ کی والدہ دلبرداشتہ ہو کر ان کے گھر سے چلی جاتی ہیں بلکہ وہ عائشہ کو لے کر اپنے بھائی کے گھر چند دنوں کے لیے دوسرے شہر چلی جاتی ہیں۔ نعمان اس تمام عرصہ میں سخت پریشان رہتا ہے۔ ان کی واپسی پر ان کے گھر جاتا ہے تو وہ بتاتی ہیں کہ انہوں نے عائشہ کا کہیں اور نکاح کر دیا ہے۔ وہ مغموم سا واپس آجاتا ہے۔
نبیلہ' عریشہ کا سیٹ لے لینے پر فاطمہ سے برگشتہ ہوتی ہیں تاہم فاطمہ کے وہ سیٹ لوٹا دینے کا وعدہ کرنے پر وہ راضی ہو جاتی ہیں۔
ابرار' باسط کو ٹیوشن پڑھانے جاتا ہے۔ وہاں باسط کی بڑی بہن سنعیہ کے ساتھ ثوبان کی بے تکلفی دیکھ کر حیرت کا اظہار کرتا ہے۔
ابرار' عریشہ کو ثوبان کے ساتھ چھت پر تنہا دیکھ کر اسے متنبہ کرتا ہے کہ دو نامحرم کے درمیان تیسرا شیطان ہوتا ہے۔
گاؤں میں کوئی جمیلاں کی بھینس کو زہر دے کر مار دیتا ہے۔ عریشہ اور مریم نے بی ایڈ میں داخلہ لے لیا۔ وہاں مریم کا کوئی افیئر شروع ہو جاتا ہے۔ جس سے عریشہ بے خبر ہوتی ہے۔
سنعیہ' ثوبان کو شادی کی آفر کر کے حیران کر دیتی ہے۔

۵
پانچویں قسط

کچھ لمحے ثوبان کچھ بھی نہ بول سکا۔
سنعیہ دلچسپ نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔
"تم مذاق کر رہی ہو؟" ثوبان نے بمشکل خود کو سنبھالا۔
"بالکل نہیں۔" وہ فوراً" بولی۔ "تم اچھے انسان ہو' گلڈ لکنگ ہو۔ کچھ کرنا چاہتے ہو' مگر یاد رکھو' بہت سال لگیں گے' اس لائف اسٹائل تک پہنچنے میں جو میرا ہے' سو ایک سمپل فارمولا ہے۔ تم مجھے اپنا آپ دے دو' میں تمہیں وہ اسٹیٹس دوں گی' جو تم چاہتے ہو۔"
"مگر تمہارے گھر والے؟" وہ اب بھی شاک میں تھا۔
"یہ تمہارا مسئلہ نہیں۔" وہ اطمینان سے کندھے اچکا کر کھانا کھانے لگی تھی' جبکہ ثوبان ہونقوں کی طرح اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ کھانا' ذائقہ' بھوک ہر چیز بے معنی ہو کر رہ گئی۔
سنعیہ سے شادی کا مطلب تھا۔ وہ ایک ہی پل میں اپنے سارے خوابوں کو چھو لیتا۔ زمین سے اٹھ کر رنگ رنگ آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرتا۔ اور اس کے بدلے اسے کرنا کیا تھا؟
ثوبان نے چاولوں کا چمچہ بھرتی سنعیہ کو دیکھا۔
اسے اپنا آپ سنعیہ کے سپرد کرنا تھا۔ سنعیہ سے شادی' خود سے دست برداری۔
ایک امیر کبیر لڑکی ایک سفید پوش گھرانے کے عام سے لڑکے سے شادی کیوں کرتی ہے؟
وہ ہی وجوہات ہو سکتی تھیں۔
یا تو وہ اس سے محبت کرتی ہے۔
یا اسے شوہر کے نام پر ایک کاٹھ کا الو چاہیے ہوتا ہے۔ جو ساری زندگی آنکھیں اور کان بند کیے اس کے اشارے پر ناچ سکے۔
سنعیہ کے معاملے میں اسے دوسری بات زیادہ سچ لگ رہی تھی۔ پھر بھی اس نے حواس باختہ ہو کر پوچھ ڈالا۔
"ڈو یو لومی؟" (کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟)
کولڈ ڈرنک کا گھونٹ بھرتی سنعیہ کو اچھو لگ گیا۔ ہنستے ہنستے اس کی سنہری آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ اردگرد کے لوگ مڑ کر دیکھنے لگے۔ ثوبان غصے' خجالت اور شرمندگی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ غرایا۔
"اسٹاپ اٹ۔"
"مائی گاڈ! ثوبان' تمہارے ذہن میں یہ چل رہا ہے۔" سنعیہ نے بمشکل ہنسی روکی۔
"وہ ٹیپیکل انڈین پاکستانی مووریز والی مینٹیلٹی' اس دور میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔ امیر لڑکی' غریب لڑکا۔ لو۔ ڈونٹ سونگ۔ مائی گاڈ۔"
ثوبان لب بھینچے اسے دیکھتا رہا۔
"اب تو شادیاں بھی نفع نقصان سامنے رکھ کر کی جاتی ہیں۔ اس پر بھی give and take (کچھ دو' کچھ لو) کا اصول لاگو ہونے لگا ہے' سمجھے۔"
"چلنا چاہیے۔" ثوبان نے سنجیدگی سے گود میں گرا نیپکن اٹھا کر میز پر پھینکا۔
"زیادہ ایموشنل ہونے کی ضرورت نہیں' کھانا ختم کرو۔ میں نے تمہارے سامنے ایک آپشن رکھا تھا۔ نہیں تو نہ سہی۔"
"تمہارے نزدیک شادی ایک آپشن ہے؟"
"اور کیا ہے؟" سنعیہ نے الٹا حیرت سے پوچھا۔
ثوبان خاموش رہا۔ اس کا ذہن گہرے سمندر میں پھنسے جہاز کی طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔
"آئی تھنک! تمہیں باہر جانے کے لیے' ویزا اپلائی کر دینا چاہیے۔" سنعیہ اسی اطمینان اور سکون سے اپنا پروپوزل واپس لے رہی' جس سکون سے ثوبان کے سامنے رکھا تھا۔
اسے لگ رہا تھا کہ قسمت نے اس کے دروازے پر دستک دی تھی۔ مگر اس نے دروازہ نہیں کھولا۔

☼ ☼ ☼

رات ہو گئی تھی۔ مگر نہ تو اس کے کمرے میں لائٹ جلی تھی اور نہ ہی وہ کھانا کھانے باہر نکلا تھا۔ کتنے دن ہو گئے۔ ہر وقت ذہن میں ماں کی باتیں سنپولیوں کی طرح رینگتیں۔ اس کا دل چاہتا وہ ایک بار تو ماں سے پوچھے' کیا وہ ان کی سگی اولاد ہے۔
مگر ہونٹوں پر گہری چپ تھی۔ جو صدمے کی بکل مارے اداس بیٹھی تھی۔
مائیں بھی اپنی اولاد میں اتنا فرق کرتی ہیں؟
کیا اپنے فائدے کے لیے اپنی ہی اولاد کے دل کی

خوشی چھین سکتی ہیں؟

سوالوں کا جنگل اگ کر اتنا گھنا ہو گیا تھا کہ اب تو سانس لینا بھی دشوار تھا۔ مگر ابھی تک جواب کی ایک ٹہنی بھی نہیں ٹوٹی تھی... کہ روشنی کی کوئی لکیر اندر جا کر اس کے وجود کے اندھیرے بانٹ سکے۔

نعمان کو بہت پہلے اپنے دوست یاسر کے ساتھ گزری رات یاد آئی... وہ دونوں اک اوپن ایر ہوٹل میں بیٹھے نان کے ساتھ چکن کڑاہی انجوائے کر رہے تھے۔ جب یاسر نے اچانک کہا۔

"ایک بات تو بتا۔"

"پوچھ..." نعمان نے نوالہ حلق سے اتارنے کو بوتل کا گھونٹ بھرا۔

"تو شادی کیوں نہیں کر رہا؟"

"شادی؟ بس یوں ہی' کبھی خیال نہیں آیا۔" اس نے تعجب کے ساتھ دو اکر لاپروائی سے کہا۔

"تو کب خیال آئے گا' اکتیس کا ہو گیا ہے' کاروبار تیرا سیٹ ہے' اب کس بات کا انتظار ہے؟"

"ہو جائے گی شادی' جلدی کس بات کی ہے؟"

"جلدی نہیں دیر ہو رہی ہے' اگر گھر والوں کو خیال نہیں آ رہا تو' تو ہی یاد کروا دے۔" یاسر کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔

"اوہ یار! ایسی کوئی بات نہیں۔" اس کی پوری توجہ کھانے پر تھی۔

"میرے ساتھ تو ایسی ہی بات ہے۔ میری امی نے تو کہہ دیا ہے' جب تک بہنوں کی شادیاں نہیں کرو گے' اپنی شادی کا نام بھی نہیں لینا۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" نعمان حیران ہوا۔

"یہی بات ہے' یار! یہ جو مائیں ہوتی ہیں نا... یہ ایسی ہی ہوتی ہیں' ساری زندگی بیٹوں کو اچھا سے اچھا کھلائیں گی' اچھے سے اچھا پہنائیں گی۔ سب سے اچھی بوٹی بیٹے کی پلیٹ میں ڈالیں گی۔ سب سے اچھا پھل بیٹے کے لیے رکھیں گی' دودھ' بادام' پھل' سونے جاگنے ہر شے کا خیال رکھیں گی' پر جہاں شادی کی بات آئی' وہیں بیٹا پرایا' بیٹی اپنی۔" وہ کہتا چلا گیا۔

"عجیب بات کی ہے تو نے۔"

"ہو گی عجیب... پر سچ یہی ہے... کم از کم میرے معاملے میں تو ایسا ہی ہے۔ میں اپنے گھر میں کمانے والی مشین ہوں۔ سب کی ضروریات پوری کرنا میرا فرض ہے۔ سوا اپنی زندگی کی خوشیوں پر میرا کوئی حق نہیں۔"

یاسر اس دن کچھ زیادہ ہی جلا بھنا بیٹھا تھا۔

"اگر تو کہے تو میں خالہ سے بات کروں۔"

"کیا بات کرے گا؟"

"یہی کہ بیٹا شادی کے لیے اتاولا ہو رہا ہے۔"

"چھوڑ یار! گلے پڑا ڈھول بجانا ہی ہے۔ اسی لیے سمجھا رہا ہوں۔ گھر والوں کے لیے پیسہ کمانے والی مشین نہ بن جانا۔ اپنے حصے کی خوشیاں وقت پر حاصل کر لینا۔" یاسر نے بے زاری سے کہتے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"نعمان بھائی!" مریم نے آواز دے کر دروازہ کھولا۔ "کھانا لاؤں؟"

وہ چونک کر اپنے خیالوں سے باہر نکلا اور بے حد رکھائی سے بولا۔

"نہیں اور اب نہ دروازہ کھولنا۔"

مریم فوراً" دروازہ بند کر گئی۔

نعمان نے کروٹ بدل لی۔ خیالوں کی رو پھر وہیں جا نکلی۔ اسے وہ دن یاد آئے' جب اس نے پہلی بار ان ہی راہوں سے عائشہ کو گزرتے دیکھا۔ اس کے ذہن میں شادی کا خیال تک نہ آیا تھا۔ بس وہ اسے اچھی لگی تھی۔ وہ نظر باز انسان نہیں تھا۔ مگر اس نے عائشہ کو بہت دیر اور دور تک دیکھا تھا۔ پھر یہ دیکھنا اس کے لیے اتنا ضروری ہو گیا' جتنا کہ کھانا پینا یا شاید اس سے بھی کچھ بڑھ کر۔ عائشہ کو تو خبر بھی نہ تھی کہ کوئی ہر روز اس کے قدموں کے نشان گنتا ہے۔

تب ہی ایک دن یاسر نے اس سے پوچھا۔

"یار نعمان! تجھے زندگی میں کبھی کسی لڑکی سے محبت ہوئی ہے؟" اس کا انداز بے حد کھویا کھویا تھا۔ جیسے وہ یہ سوال نعمان سے نہیں خود سے کر رہا ہو۔

"محبت... نہیں... یا شاید ہاں..." وہ خود بھی ہاں نہ پر اٹکا تھا... کہ ابھی خود پر بھی یہ راز افشا نہیں ہوا تھا۔

"کوئی لڑکی اچھی تو لگی ہو گی؟"

"ہاں..." اس نے ایمان داری سے اعتراف کیا۔

"پھر...؟"

"پھر کیا؟"

"اس سے شادی کا خیال نہیں آیا؟"

"سچی بات بتاؤں تو نہیں۔"

"میری ایک بات یاد رکھنا۔" یاسر نے ہاتھ اٹھاتے ناصحانہ انداز اختیار کیا۔ "جب کسی لڑکی سے محبت ہو اور تو اس سے شادی بھی کرنا چاہے' تو کبھی اپنی ماں کو نہ بتانا کہ وہ تیری پسند اور محبت ہے۔"

"کیوں؟" نعمان نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔

"یار! یہ مائیں ان سیکیور ہو جاتی ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ اگر بیٹے نے پسند کی شادی کر لی تو انہیں گھر سے نکال دے گا۔"

اس وقت نعمان نے یہ بات ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دی تھی۔ اس نے تو یاسر کے لہجے میں چھلکتا دکھ بھی محسوس نہ کیا تھا۔ مگر جب عائشہ سے شادی کا سوچا تو یہی خدشہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ فاطمہ کے رشتے کے وقت جب اس نے مذاق مذاق میں اپنی شادی کا ذکر کیا تو حمیدہ تڑپ اٹھیں۔

"صبر کر... صبر... دو بہنیں گھر بیٹھی ہیں۔ پہلے انہیں تو رخصت کر لے' اپنی پڑ گئی ہے۔"

"مطلب بہنوں کو بیاہتا بیاہتا بوڑھا ہو جاؤں؟"

چچی نے بات کو پلٹ دیا تھا مگر اس نے ماں کے منہ کے بگڑتے زاویے دیکھے تھے۔

تب ہی گھر میں اپنی خواہش کا اظہار کرنے کے بجائے زبیدہ کی مدد لی تھی۔

مگر ہوا کیا؟

کتنی آسانی اور سہولت سے اس کی خواہش کو کچل دیا گیا۔

کتنی بے دردی سے اس کے دل کی خوشی چھینی گئی۔

وہ بھی کسی اور نے نہیں' خود اپنی ماں نے۔

"کروا دوں گی اس کی شادی۔ کنوارا نہیں رکھوں گی۔ ہونہہ! میرا بیٹا پھانسنے چلی تھی۔ ایسی باتیں سناؤں اس ماسٹنی کو کہ دوبارہ نعمان کا سوچے گی بھی نہیں۔"

لفظ "نہیں" پھنکارتے ہوئے سانپ تھے۔ جو اسے گھیرے ڈس رہے تھے۔

"کس کا نکاح...؟"

"اپنی عائشہ کا..."

وہ اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔

کس سے پوچھے...؟

کس کو کٹہرے میں کھڑا کرے؟

کس کا گریبان پکڑے؟

وہ بچوں کی طرح رونے لگا۔

یہ رونا ایک لڑکی کے لیے نہیں تھا۔

یہ رونا اپنی محبت کے بچھڑنے پر بھی نہیں تھا۔

یہ رونا تو اپنی بے قدری کا تھا۔

وہ سچ مچ اس گھر اور گھر والوں کے لیے کمانے والی مشین بن گیا تھا۔

اسے اتنے عرصے کے بعد اب جا کر یاسر کے لہجے میں چھلکتا دکھ سمجھ میں آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

مریم حسب عادت ارد گرد کے گھروں میں تانک جھانک کر رہی تھی۔ عریشہ کرسی پر بیٹھی دونوں پاؤں سامنے چارپائی پر رکھے' ایک کاغذ پر پنسل اسکیچ بنا رہی تھی۔

"لگتا ہے لیلیٰ کی شادی ہو رہی ہے۔ ان کے گھر میں بڑی افراتفری ہے۔"

"شاید..." عریشہ نے بغیر نظریں اٹھائے جواب دیا۔

"سب کی شادیاں ہو رہی ہیں۔ ایک ہمارے گھر

میں کسی کو خیال نہیں۔ سب نے یونہی بڈھے ہونا ہے۔" وہ جھنجلا کر بولی۔

"اگر پانو آپا کالا لا یا رشتہ قبول کر لیتیں۔ تو لیلیٰ سے پہلے دلہن بن جاتیں۔"

"پلیز! اس سے تو بہتر ہے۔ میں کنواری ہی مرجاؤں۔"

"ایسے تو مت کہو مریم! کون جانے کس کے نصیب میں کیا لکھا ہے۔" عریشہ نے سنجیدگی سے ٹوکا۔

"ہاں۔ تم کہہ سکتی ہو۔ تمہیں تو میرا بھائی مل گیا نا۔" وہ چارپائی کے قریب آگئی۔ "اور سن لو' میرے مقدر بھی اتنے خراب نہیں۔ کرے گا کوئی نہ کوئی مجھے بھی پسند۔"

"آج کل تمہارے انداز بڑے بدلے بدلے سے ہیں۔ کہیں کسی نے پسند تو نہیں کر لیا۔" عریشہ نے یونہی تکا لگایا۔ مریم گڑبڑا گئی۔

"میں تو یونہی اک بات کر رہی ہوں۔ تم خوامخواہ پر کا کوا بنانے کی کوشش مت کرو۔"

"چلو تم نے یہ تو مانا کہ "پر" موجود ہے۔"

"فضول مت بولو۔ کیا بنا رہی ہو۔" مریم نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

"اسکیچ ہے۔"

"کس کا؟" مریم نے شرارت سے پوچھا۔

"ہے کوئی۔" عریشہ مسکرا دی۔

"میرے بھائی پر ڈورے ڈالتی ہو۔ شرم نہیں آتی۔"

"ہاں۔۔۔" عریشہ کا منہ کھل گیا۔ "میں نے کچھ نہیں کیا۔" اس نے پنسل مریم کو دے ماری۔

"ہاں۔ تم تو بہت نیک پروین ہو۔ لاؤ مجھے بھی دکھاؤ۔ کیا بنایا ہے۔"

وہ پنسل کھینچ کر کے چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"جس کے لیے بنایا ہے اسی کو دوں گی۔"

"پھر میں بھی پنسل نہیں دے رہی۔" مریم آرام سے کہہ کر پنسل دانتوں میں چبانے لگی۔ کچھ بھی تھا' وہ عریشہ کا دھیان ہٹانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

✡ ✡ ✡

ساجدہ کے بچوں نے گھر میں ہڑبونگ مچا رکھی تھی ثوبان آفس سے آتے ہی انہیں دیکھ کر بے زار ہو گیا۔ ویسے بھی یہ بے زاری آج کل اس پر چھائی ہی رہتی تھی۔

"ماموں آ گئے۔۔۔ ماموں آ گئے۔"

چھوڑو مجھے سارے کپڑے خراب کر دیے۔"

"ماموں! امی کہہ رہی تھیں۔ آپ ہمیں آئس کریم کھلائیں گے اور چاکلیٹ لے کر دیں گے۔"

ایک بچے نے اپنی بہتی ناک اس کے پینٹ سے رگڑتے ہوئے کہا۔ وہ جوابا" جھڑکنے والا تھا جب اندر سے ساجدہ آپا آگئیں۔ اس نے بمشکل لبوں پر مسکراہٹ سجائی۔

"کیسی ہو آپا؟"

"شکر ہے میرے بھائی کو حال پوچھنے کا خیال تو آیا۔ جب سے نوکری ہوئی ہے تم تو دکھائی ہی نہیں دیتے۔ کبھی بھولے بھٹکے بہن کے گھر کا چکر ہی لگا لیا کرو۔ تمہارے بھانجے ہر وقت تمہیں یاد کرتے ہیں۔ یہ چھوٹے والا اب دوسری کلاس میں ہے۔۔۔ اور۔۔۔"

اس سے قبل کہ وہ نان اسٹاپ بولتی باقیوں کی کلاسیں بتاتیں۔ ثوبان بول اٹھا۔

"ضرور آپا! ضرور چکر لگاؤں گا۔ میں نہالوں۔ بہت گرمی میں آیا ہوں۔"

"ہاں۔ ہاں جاؤ نہالو۔" ساجدہ نے بچوں کو کھینچ کر پیچھے کیا۔ ثوبان موقع غنیمت جان کر فورا" سیڑھیاں چڑھ گیا۔

"اس گھر میں ایک لمحے کو سکون نہیں۔ ہر دوسرے دن چلی آتی ہیں۔ ساتھ میں وہ بدتمیز' جاہل بچوں کی فوج جو اس زمانے میں بھی سرکاری اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔"

اس نے بڑبڑاتے ہوئے موبائل اور بائیک کی چابی

رائٹنگ ٹیبل پر رکھی۔ خود کرسی پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ تب ہی نگاہ میز پر پیپر ویٹ کے نیچے دبے کاغذ پر پڑی۔ بغیر متجسس ہوئے اس نے کاغذ اٹھا لیا کہ عریشہ اکثر کچھ نہ کچھ رکھتی رہتی تھی مگر اس بار وہ اپنا اسکیچ دیکھ کر سراہے بغیر نہ رہ سکا۔

"کیسا لگا؟"

عریشہ کی آواز پر اس نے کاغذ سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔ کچھ دنوں سے ان کے درمیان دوری سی آگئی تھی۔ وہ مصروف ہوا تھا یا عریشہ۔۔۔ مگر پہلے کی طرح مل بیٹھنے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔

"ہوں۔ مجھے نہیں پتا تھا' تم یہ کام بھی کر لیتی ہو۔ ویسے میری ناک اتنی موٹی تو نہیں۔"

عریشہ کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ وہ پلٹنے لگی تو ثوبان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چھوڑو۔"

"او' تو محترمہ' ابھی تک بچوں کی طرح ناراض ہوتی ہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ تمہیں نہیں اچھا لگا تو نہ سہی۔" عریشہ نے کاغذ اس کے ہاتھ سے لیا اور پرزے پرزے کر دیا۔

"یہ۔ یہ تم نے کیا کیا؟" ثوبان ہکا بکا رہ گیا۔

"جب تمہیں اچھا ہی نہیں لگا تو رکھنے کا فائدہ۔" وہ بدقت مسکرائی۔

"مگر تم نے اتنی محنت سے بنایا تھا۔"

"اس محنت کا فائدہ ہی کیا جو تمہیں متاثر نہ کر سکے۔" عریشہ نے پرزے ڈسٹ بن میں ڈال دیے۔

"میں تو مذاق کر رہا تھا۔ یہ تو بہت زبردست تھا۔ اور۔۔۔" وہ تھوڑا شرمندہ ہو گیا۔

"چھوڑو۔ یہ قصہ ختم ہوا۔ تم نے کھانا کھایا؟"

"یار! کیا چیز ہو تم؟"

"میں تو ہمیشہ سے ہی ایسی ہوں۔"

"سنو عرشی! تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش' سب سے بڑا خواب کیا ہے؟" بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

"تم۔" عریشہ کو ایک سیکنڈ سوچنے کی ضرورت نہ تھی۔

(اب تو شادیاں بھی نفع نقصان سامنے رکھ کر کی جاتی ہیں)

آخر نعمان بھی تو تھا پھر عریشہ مجھ میں ہی انوالو کیوں ہوئی۔ کیا اسے بھی لگتا ہے کہ مجھ سے شادی کے بعد بہتر زندگی گزار سکتی ہے۔ عجیب سی سوچ نے ذہن پر پنجہ مارا۔

"اور تمہارے نزدیک سب سے اہم کیا ہے؟" عریشہ نے پوچھا۔

ثوبان کو گمان نہ تھا کہ عریشہ یہ سوال کرے گی۔ مگر وہ سوال کر کے منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم۔"

یہ لفظ کہتے ہوئے ثوبان کو خود بھی احساس ہوا کہ اس کے انداز میں وہ بے ساختگی اور جذب کا فقدان تھا جو کہ عریشہ کے انداز میں تھا۔ عریشہ دھیمے سے مسکرا دی۔ اس کے لیے تو لفظ "تم" ہی کافی تھا۔

✡ ✡ ✡

نعمان کے سامنے کھانے کی ٹرے رکھتے ہوئے حمیدہ خود بھی بیٹھ گئیں۔ نعمان ذرا سا ٹھٹکا۔ اور بے دلی سے نوالہ توڑنے لگا۔ آج کل وہ ہر کام بس ضرورتا" ہی کر رہا تھا۔ خواہ وہ کھانا کھانا ہی کیوں نہ ہو۔

"تیری طبیعت ٹھیک ہے؟" یہ غالبا" تمہیدی جملہ تھا۔

"میری طبیعت کو کیا ہونا ہے۔"

"پہلے جیسا نہیں رہا' چپ چپ رہنے لگا ہے۔ پہلے کی طرح غصہ بھی نہیں کرتا۔"

"غصہ۔۔۔" نعمان نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔

(غصہ تو بہت چھوٹا لفظ ہے۔ میرے اندر تو جہنم دہک رہا ہے۔ ایسا لاوا پک رہا ہے کہ خود ہی ڈر جاتا ہوں۔ کہیں یہ لاوا ابل گیا تو اس سارے گھر کو جلا کر راکھ نہ کر دے۔ لیکن دل تو چاہتا ہے کہ کچھ تو ایسا

کروں کہ ایک بار سارا گھر بل کر رہ جائے بالکل اسی طرح جس طرح تم نے مجھے ہلا ڈالا تھا۔ سگی ماں ہو کر سلوک سوتیلوں والا کیا۔)

"اب کیا سوچنے لگے؟"

وہ حمیدہ کی آواز پر چونکا۔ بلی نے دیوار سے چھلانگ لگائی اور قریب آکر میاؤں کرنے لگی۔

نعمان نے ہاتھ میں پکڑا نوالہ دیکھا اور بلی کو ڈال دیا۔

"ہوا اپنے منہ کا نوالہ کیوں ڈال دیا۔"

"مجھے تو بچپن سے عادت ہے۔ اپنے منہ کا نوالہ دوسروں کو دینے کی۔ یاد ہے بچپن میں جب بھی میں کوئی اچھی چیز کھانے لگتا تھا تو ثوبان اپنا حصہ کھا کر میرا حصہ مانگنے لگتا۔ حالانکہ اماں! تم نے پہلے ہی اسے سب سے اچھا حصہ نکال کر دیا ہوتا تھا مگر تم کہتیں، چھوٹا بھائی ہے دے دو۔" وہ بلی کو کھاتے دیکھ کر کھوئے کھوئے انداز میں بولتا گیا۔

"ہاں تو وہ چھوٹا تھا۔ اور ضدی بھی۔ بڑے بھائی اسی طرح کرتے ہیں۔"

حمیدہ نے لاپروائی سے سالن پر چکراتی مکھی کو اڑایا۔

"ہاں اماں! تم نے ساری زندگی اس کے لیے اچھا سوچا اور میرے لیے؟ تمہارے نزدیک اس کے دل کی خوشی اہم تھی اور میری بالکل فالتو بے کار۔ کیا تم ثوبان کے ساتھ وہ سب کر سکتی ہو جو میرے ساتھ کیا۔ اس سے عرشہ کو اسی طرح چھین سکتی ہو۔ جس طرح مجھ سے عائشہ کو چھینا۔"

وہ اب بے حد غور سے حمیدہ کو دیکھ رہا تھا۔

"اچھا تجھ سے ایک ضروری بات کرنا تھی۔"

"کہو اماں! میں تو کب کا منتظر ہوں کہ تم میرے پاس کوئی ضروری بات کرنے ہی بیٹھی ہو گی۔"

نعمان کا لہجہ گہرے طنز کا غماز تھا۔ مگر حمیدہ کچھ نہ سمجھ سکیں۔ انہیں صرف اپنے مطلب کی بات سمجھ میں آئی تھی۔

"ثوبان باہر جانا چاہتا ہے۔ دو لاکھ چاہییں۔"

"دو لاکھ میں باہر چلا جائے گا۔"

"کچھ رقم اس کے دوست دیں گے۔ تجھے تو پتا ہے اس کے دوست اچھے خاصے امیر گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ تھوڑا بہت اپنی تنخواہ سے جوڑ رکھا ہے اور۔۔۔"

"اسی لیے آج تک گھر میں ایک دھیلا نہیں دیا۔"

نعمان نے سنجیدگی سے ان کی بات کاٹی۔ بلی اب چارپائی کے ارد گرد بے تاب میاؤں میاؤں کر رہی تھی۔

"وہ تو شروع ہی سے ایسا ہے۔ لاپروا۔ صرف اپنے بارے میں سوچنے والا۔"

(اور میں نے ساری زندگی گھر والوں کے بارے میں سوچا۔ ان کی خواہشیں، فرمائشیں، ضرورتیں۔ اسی کا صلہ بھی پا رہا ہوں)

"ویسے کہہ رہا ہے۔ جب باہر چلا گیا تو سب سے پہلے میرے لیے سونے کے کڑے بنوا کر دے گا۔"

حمیدہ نے خوش ہو کر بتایا۔

"اچھا۔ تو دے گا نا دو لاکھ۔"

"جب میرا پرائز بانڈ نکلے گا تو دے دوں گا۔" نعمان نے پانی کا گلاس منہ کو لگایا۔

"تو نے پرائز بانڈ خریدا ہے۔ کتنے کا؟" حمیدہ نے ناک پر انگلی رکھ کر حیرت و اشتیاق سے پوچھا۔

نعمان نے ٹرے سے روٹی اٹھا کر بلی کے سامنے ڈال دی۔ اب تک حمیدہ نے غور نہیں کیا کہ نعمان نے کھانے میں سے ایک نوالہ نہیں لیا تھا۔ وہ پرائز بانڈ میں اٹکی تھیں۔

انہیں ثوبان کے ویزے کی فکر تھی۔

انہیں سونے کے کڑوں کی چاہ تھی۔

یہ اس کی ماں تھیں؟

نعمان اپنے اندر ابلتے اشتعال پر قابو پاتے کھڑا ہوا۔

"تو نے بتایا نہیں کہ۔۔۔"

"اماں!" نعمان نے سختی سے ان کی بات کاٹی۔

"میں نے ثوبان کو پڑھا لکھا دیا بہترین سے بہترین کپڑا پہنایا۔ اس کی ہر ضرورت کو پورا کیا۔ اب وہ اپنا بوجھ

خود اٹھا سکتا ہے۔ میں اپنا فرض پورا کر چکا ہوں۔ اب میرے پاس اس کے لیے ایک دھیلا بھی نہیں۔ سمجھا دینا اسے۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

حمیدہ ہکا بکا رہ گئیں۔

بلی چپڑ چپڑ روٹی کھا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تمہارے ویزے کا کیا بنا؟" منیعہ احتیاط سے ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ ثوبان ساتھ والی سیٹ پر تھا۔ منیعہ نے اسے آفس سے پک کیا تھا کہ لنچ ساتھ کریں گے۔

"پیسوں کا بندوبست کر رہا ہوں۔" ثوبان نے اس سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔

ہو جائے گا؟" وہ اپنے بے احتیاط کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ ثوبان اسے اچھا لگتا تھا۔ اور جب پتا چلا کہ ایک سفید پوش گھرانے سے تعلق رکھتا ہے تب بھی اسے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ بلکہ کام زیادہ آسان ہو گیا۔

"میری مدد کی ضرورت ہو تو کہو؟"

تمہاری مدد کی ضرورت ہوتی تو تم سے شادی ہی نہ کر لیتا۔" وہ ہنسا۔

"خیر۔ اب تم نے خود ہی اپنے لیے مشکل رستہ چنا ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"یار! میں پہلے سے کمیٹڈ ہوں۔"

"وہ تمہاری کزن، جو اپنی مدر کی ڈیتھ کے بعد تمہارے ساتھ رہ رہی ہے۔" منیعہ نے احتیاط سے موڑ کاٹا۔

"ہاں۔"

"اسے کبھی میرے برابر کھڑا کر کے دیکھنا۔ وہ تمہیں نظر بھی نہیں آئے گی۔" وہ اعتماد سے ہنسی۔

ثوبان نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتی تھی۔ یہ عام سے خدوخال کی لڑکی مگر اس کے وجود سے پھوٹتی کرنیں کسی کی بھی آنکھوں کو خیرہ کر سکتی تھیں اور یہ کرنیں تھیں، دولت، اسٹیٹس، خاندان اور اعتماد کی۔ ان سب نے مل کر منیعہ کی شخصیت کو کیا سے کیا بنا دیا تھا۔

"دیکھ لیا۔ اب اسی نظر سے جا کر اپنی کزن کو بھی دیکھنا۔" منیعہ نے محظوظ سی مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے کہا۔ ثوبان سامنے دیکھنے لگا۔

"لنچ کے لیے کہاں چلیں؟" منیعہ نے بات بدلی۔

"کہیں بھی۔ مجھے کچھ خاص بھوک نہیں ہے۔" ثوبان نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

منیعہ نے کندھے اچکاتے گاڑی کا رخ موڑ دیا۔

☼ ☼ ☼

کچن میں سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ نعمان دانستہ دروازے کے پاس ہی رک گیا۔

"آپ نے بھائی سے بات کی؟" ثوبان پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔ کرلی تھی۔ صاف جواب دے دیا ہے۔ کہنے لگا اب میرے پاس ایک دھیلا بھی نہیں۔" حمیدہ نے بتایا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میں واپس کر دوں گا۔"

"واپس تو تب کرے گا جب وہ دے گا۔ اس کی تو آنکھیں ہی بدلی ہوئی ہیں۔"

"اماں! یہ کیا بات ہوئی۔ مجھے ایک مہینے کے اندر اندر پیسے ارینج کرنے ہیں ورنہ یہ چانس ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ویزا موجود ہے صرف پیسے دے کر اٹھانا ہے وہاں میرے دوست نے میرے لیے جاب بھی دیکھ رکھی ہے۔" وہ جھنجلایا۔

"تو نے ہمیشہ ہتھیلی پر سرسوں جمائی ہوتی ہے۔ اب میرے پاس کون سا خزانہ دفن ہے۔ جو میں لاکھوں روپے نکال کر تجھے دے دوں۔" حمیدہ تنخ کر بولیں۔

"اماں! سوچ لیں۔ ایک بار باہر چلا گیا تو سب کچھ بدل دوں گا۔ یہاں سے اٹھا کر ڈیفنس میں لے جاؤں گا۔ صرف میرا نہیں پورے گھر کا مستقبل سنور جائے گا۔"

"تو نکلوا عریشہ سے' لاکھوں روپیہ دبائے بیٹھی ہے۔"

"لاکھوں... جب سب کچھ تو اس سے نکلوالیا ہے۔ اب اس کے پاس رہا کیا ہے؟؟"

"مکان..."

"مکان...؟"

"ہاں... یہ عادلہ کا گھر کس کی ملکیت ہے۔ عریشہ کی نا۔ اور اس نے بیاہ کر اسی گھر میں آنا ہے۔ وہ مکان کا کیا کرے گی؟" حمیدہ نے اطمینان سے کہا۔

"وہ مکان دے دے گی؟"

"زیور نہیں دیا تھا؟ تو چاہے گا تو مکان بھی دے دے گی۔ تجھ سے محبت کرتی ہے۔ مرتی ہے تجھ پر۔"

نعمان چونک گیا۔ زیور والے قصے سے وہ بالکل لاعلم تھا۔

"دکانیں نعمان نے سنبھال لیں' مکان تو لے لے۔ باقی رہا فرید... وہ تو بچہ ہے۔ بڑا ہوگا تو دیکھی جائے گی۔"

"اماں! کچھ بھی کریں' ایک ماہ کے اندر اندر مکان بیچ کر مجھے پیسے دیں۔"

"میں نے نہیں تم نے کرنا ہے۔ مکان کے کاغذات اسی کے پاس ہیں۔ پیار محبت سے نکلوا لے۔ کہہ دینا کہ اس کا بھی ویزا لگوانا ہے۔"

"اچھا!"

نعمان خاموشی سے اندر چلا گیا۔ اس کے اندر پکنے والا لاوا اب ابلنے کو تیار تھا۔

☼ ☼ ☼

رات بہت گہری تھی۔ اور نیند آنکھوں سے کوسوں دور... وہ ایک لفظ نہیں پڑھ پایا تھا۔ سماعتیں تھیں کہ بس بارش کی رم جھم سنتی تھیں۔ لفظ تھے کہ مل کر ایک ہی منظر بناتے۔

وہ بارش میں دھلے اَدھ کھلے گلاب جیسی لڑکی۔

اور پانیوں پر رقصاں سپید کبوتری سے پاؤں۔

"یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔" اس نے کتاب بند کر کے کھلی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ گلی میں چاندنی بکھری تھی۔

بارش' چاندنی' خوشبو...

اس نے زندگی میں کبھی ان چیزوں کو اتنی شدت سے محسوس نہیں کیا تھا۔

"نہیں۔ ابھی زندگی اتنی سہل نہیں ہوئی کہ وقت کو ان رنگین خوابوں کے سپرد کر دوں۔ اس طرح تو میرا رستہ کھوٹا ہوگا۔ منزل تک پہنچنے سے پہلے تو ہرگز نہیں۔"

اس نے خود ہی اپنا ہاتھ پکڑ کر خود کو سمجھانا چاہا۔

"یوں بھی وہ میری دسترس میں نہیں۔ وہ اور ثوبان... لیکن ثوبان؟" وہ بے چین ہو کر کمرے میں چکرانے لگا۔

"یہ کن باتوں میں الجھ رہے ہو ابرار... یہ تمہاری منزل تو نہیں۔ بس کرو۔ یہیں ٹھہر جاؤ۔" وہ اک طویل سانس لے کر خود کو جبراً" کتابوں میں گم کرنے لگا۔ وہ ایک بار بھی گاؤں نہیں گیا تھا۔ البتہ ماں سے فون پر بات ضرور کرتا۔ جمیلہ نے بتایا تھا کہ بشریٰ کا رشتہ چوہدری یاسین کے بیٹے سے طے ہو گیا ہے۔ وہ چاہتی تھی بشریٰ کی شادی پر ابرار گاؤں ضرور آئے۔ جو کچھ بھی ہے' اس کا چچا بالکل اکیلا تھا۔ بھتیجے کے ہوتے غیر آکر ہاتھ بٹائیں۔ یہ جمیلہ کو اچھا نہ لگتا۔ شاید ابرار ماں کے مجبور کرنے پر چلا ہی جاتا مگر اصغر نے صاف کہہ دیا' وہ اس کے گھر میں اب قدم بھی نہیں رکھ سکتا۔ اگر وہ آیا تو اپنی ماں کو بھی ساتھ لے کر جائے گا۔

سو جمیلہ نے ابرار کو منع کر دیا۔ وہ بیٹے کی مشکلات میں مزید اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔" یکسوئی نہ پا کر ابرار نے غصے سے سوچا۔ "ہاسٹل میں رہ لوں گا یا کوئی فلیٹ شیئر کر لوں گا۔ مگر یہاں نہیں رہوں گا۔"

اس نے مصمم ارادہ کیا۔

☼ ☼ ☼

عریشہ نے رات کے کھانے کے برتن دھوتے دھوتے رک کر اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ اور مضمحل سا مسکرا دی۔ بہت پہلے تائی کا کہا جملہ یاد آیا۔ ایسا نہیں کہ حمیدہ اب اس سے محبت نہیں کرتی تھیں۔ مگر فاطمہ کی شادی کے بعد کاموں کا بوجھ تائی پر آگیا تھا۔ وہ کام بھی کرتیں اور شور بھی مچاتیں۔ مریم تو من موجی تھی دل چاہا تو کام کر لیا نہ چاہا تو کان لپیٹ کر کھسک لیتی۔ سو بہت سے کام از خود عریشہ کی ذمہ داری بن گئے۔ حمیدہ آرام سے کہتیں۔

"شادی کے بعد بھی تو عریشہ نے ہی سب کچھ سنبھالنا تھا۔"

"عرشی..." ثوبان کی آواز پر وہ چونک کر پلٹی۔

"ابھی تک تمہارا کام ختم نہیں ہوا؟"

"بس ہو گیا۔" اس نے جلدی جلدی آخری دو کپ کھنگال کر رکھے اور ہاتھ دھونے لگی۔

"کچھ چاہیے؟"

"تم مجھے کام کرتی بالکل اچھی نہیں لگتیں۔" ثوبان نے پاس آکر اس کے پانی میں بھیگے ہاتھ تھام لیے۔

"تو تم ملازمہ رکھوا دو۔" وہ ہنسی۔ ثوبان کا یوں خیال کرنا اس کی روح تک کو سرشار کر دیتا تھا۔

"ضرور رکھواؤں گا۔ اتنے نرم ہاتھ تھے۔ اب دیکھو کیسے سخت ہوتے جا رہے ہیں۔" وہ دھیرے دھیرے اس کے ہاتھ سہلانے لگا۔ اس کے ہاتھوں کی ٹھنڈک ثوبان کے ہاتھوں کی گرمی میں تحلیل ہونے لگی۔ اس نرم گرم حرارت سے عریشہ کے ہاتھ ہی نہیں سارا وجود جلنے لگا۔

عریشہ نے سراسیمگی سے ثوبان کو دیکھا۔ وہ بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

دونوں کے مابین اک معنی خیز سی خاموشی آکھڑی ہوئی۔ ثوبان کے ہاتھوں میں غیر محسوس سا ارتعاش اترا۔ عریشہ کا دل سینے میں شور مچانے لگا۔

پھر خواہش صرف ہاتھوں تک محدود نہیں رہی۔

"دو نامحرموں میں تیسرا شیطان ہوتا ہے۔"

وہ جو اسے روکنا چاہتی تھی۔ ٹوٹ کر بکھرنے لگی۔

تب ہی اک آہٹ ہوئی۔

وہ تڑپ کر پیچھے ہوئی اور خوف زدہ نظروں سے ثوبان کو دیکھنے لگی۔

اس کی اپنی کیفیت عجیب سی تھی۔ گویا سمجھ نہ پایا ہو کہ ابھی کیا ہوا؟

"عرشی!" اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہ تھی۔

"چلے جاؤ۔" عریشہ کو اپنی ہی آواز اجنبی لگی۔

"عریشہ!" وہ ایکدم آگے بڑھا۔

"نہیں۔ پلیز چلے جاؤ۔" وہ سنک سے جا لگی۔

ثوبان تیزی سے باہر نکل گیا۔

عریشہ کا جسم ہولے ہولے لرزنے لگا۔ اسے رونا آرہا تھا۔ مگر منہ پر ہاتھ رکھے خود کو سنبھالنے کی سعی کر رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" نعمان کی آواز پر وہ اچھل پڑی اور تیزی سے رخ بدل گئی۔

"ایک کپ چائے بنا دو۔" کچھ لمحے انتظار کے بعد نعمان نے کہا۔ عریشہ نے دھلی ہوئی کیتلی نل کے نیچے کر کے نل کھول دیا۔

"میں نے ایک کپ کہا ہے۔"

نعمان کی آواز پر حواسوں میں آئی عریشہ نے کیتلی کو دیکھا۔ وہ آدھی بھر گئی تھی۔ اس نے پانی گرایا۔

"ثوبان کیا کہہ رہا تھا؟"

کیتلی چھوٹ کر سنک پر گری۔ بہت زور کی آواز آئی۔

"ک... کچھ بھی نہیں۔" اسے اپنی پشت پر نعمان کی چبھتی نگاہوں کا احساس ہو رہا تھا۔

"چائے بنا کر کمرے میں دے جاؤ۔"

نعمان کہہ کر چلا گیا۔ عریشہ نے کس طرح چائے بنائی اسے خود بھی خبر نہ تھی۔ کچن کی لائٹ آف کر کے دروازہ بند کیا۔ پورے گھر پر ہو کا عالم تھا۔ برآمدے میں جلتے بلب کی پیلی روشنی صحن کے اندھیرے کو کاٹ رہی تھی۔ وہ نعمان کے کمرے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"نعمان بھائی! چائے لے لیں۔" اس نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔

"دروازہ کھلا ہے۔ اندر آجاؤ۔"
نعمان کی آواز ابھری۔ کچھ لمحوں پہلے گزرنے والے پل کا خوف تھا کہ عریشہ نے دروازہ بجا کر ٹرے نیچے رکھ دی۔ جب تک نعمان نے دروازہ کھولا۔ وہ بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں جا گھسی تھی۔
نعمان نے دروازہ کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر نگاہ نیچے گئی۔ اسے طیش آگیا۔ اس نے ٹھوکر سے ٹرے اڑا دی۔ کپ صحن میں جاکر ٹوٹا۔ چائے برآمدے سے صحن تک نقش و نگار بناتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"اچھی بھلی اس کی نوکری ہے۔ ہزاروں میں تنخواہ ہے۔ اگرچہ ہمیں تو آج تک ایک دھیلا نہیں دکھایا۔ پھر باہر جانے کی ضرورت کیا ہے؟" برکت حسین نے اعتراض کیا۔
"برکت حسین! تیری نیت تو ساری زندگی نہیں بھرے گی۔" حمیدہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔
"ہاں۔ تو تو تت نئے جوڑے پہن رہی ہے۔ مجھے دکھائی دیتا ہے۔ نانہجاروں کو اتنی فکر نہیں کہ دو جوڑے باپ کو سلوا دیں۔ بلاؤ اس لڑکی کو۔ میں کہتا ہوں خبردار جو انہیں اپنا مکان دیا۔ ایک اسی کا کرایہ تو میری جیب میں جاتا ہے۔" وہ غضب ناک ہوئے۔
"اے برکت حسین 'چپ' آہستہ! کیا ہو گیا ہے۔ اب کیا محلے والوں کو سنائے گا۔"
حمیدہ بوکھلا گئیں۔ نعمان نے ایک نظر دونوں کو دیکھا اور اندر آگیا۔
"ابا!"
"ہاں بول۔" وہ اسی ٹون میں بولے۔
"ابا! مجھے شادی کرنا ہے۔" اس نے واضح الفاظ میں مدعا بیان کیا۔
دونوں نے ٹھٹک کر نعمان' پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر برکت حسین حمیدہ پر الٹ پڑے۔
"شرم کر شرم' بیٹے اپنے منہ سے کہنا شروع ہو گئے ہیں۔ تو پڑی سوتی رہ۔"
"خوامخواہ سو رہی ہوں۔ دیکھ تو رہی ہوں لڑکیاں۔"
وہ جزبز ہو کر بولیں۔
"لڑکیاں دیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟" نعمان نے تیوری چڑھائی۔
"تو پھر؟" حمیدہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اتنی بے عزتی کے بعد بھی وہ استانی کی ماں رشتہ دینے کو تیار ہے۔ بڑے ہی بے غیرت لوگ ہیں۔
حمیدہ کی سوچ کی پرواز بس یہیں تک تھی۔
"جو گھر میں ہے اس کا کیا اچار ڈالنا ہے۔"
کئی لمحے وہ کچھ بول ہی نہ سکیں۔
"عریشہ؟" برکت حسین نے بیوی کو دیکھا۔
"ہاں کیوں؟"
"مگر عریشہ تو... میرا مطلب ہے۔ تم سے چھوٹی ہے۔" وہ ہکلائیں۔ بیٹے کے تیور ایسے تھے کہ ساری عمر اس کو چٹکیوں میں اڑانے والی ماں گڑبڑا گئی۔
"اتنی بھی چھوٹی نہیں ہے۔" نعمان استہزائیہ انداز میں ہنسا۔
"ہمارا خیال تھا کہ..."
"مجھے شادی اسی سے کرنا ہے۔ دل میں کوئی اور خیال ہے تو بھی نکال دیں۔"
وہ قطعی لہجے میں کہہ کر دوسرے لفظوں میں اپنا فیصلہ سناتا چلا گیا۔ اس کے جلتے بلتے دل کو قرار آگیا تھا۔ وہ اپنے خود غرض گھر والوں کو ہلانا چاہتا تھا اور وہ انہیں ہلا گیا تھا۔
"اب کیا ہوگا؟ تم تو کہہ رہی تھیں کہ ثوبان اور عریشہ۔"
حمیدہ گم صم بیٹھی تھیں۔
انہیں نعمان کے اندر سے خطرے کی بو آرہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اس سے تو اچھا تھا' وہ استانی بیاہ لاتی۔"
وہ کف افسوس ملتیں۔ بات ایسی تھی کہ کسی کے ساتھ شیئر بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی

تھیں کہ دونوں بھائی ایک دوسرے کے مقابل آکھڑے ہوں۔ جو کچھ بھی کرنا تھا خود ان ہی کو کرنا تھا۔ اور وہ اسی بات کا جائزہ لے رہی تھیں کہ دو دریاؤں میں سے وہ کس دریا کا رخ موڑ سکتی تھیں۔

"کیسا گھنا میسنا نکلا۔ میرے پیٹ کا جنا۔ اور میں ہی اسے سمجھ نہ سکی۔ مجھے لگا وہ استانی کو پسند کرتا ہے۔ کیا پتا تھا۔ ناک کے نیچے یہ کچھ ہو رہا ہے۔ خوامخواہ استانی کی ماں کی اتنی بے عزتی کی۔ ہائے اللہ! اب کیا کروں؟" وہ اسی ادھیڑبن میں تھیں۔ جب محلے کی ایک وچولن کے توسط سے ایک اچھا رشتہ ہاتھ آگیا۔

"بات سن مریم!"

مریم جو اطمینان سے بیٹھی اپنی بھنویں نوچ رہی تھی۔ ٹیوزر اور چھوٹا شیشہ چھپانے لگی۔

نوٹس رتی عریشہ نے بھی مڑ کر حمیدہ کو دیکھا۔ جو افتاں وخیزاں اندر داخل ہوئی تھیں۔

"کیا ہے اماں! اب کروانا ہو گا کوئی نہ کوئی کام۔"

"ہاں۔ پہلے ہی تو نے سارا گھر اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا ہے۔" وہ چمک کر بولیں۔

"کیا بات ہے؟" مریم نے بےزاری سے پوچھا۔

"شام کو کچھ لوگ تمہیں دیکھنے آرہے ہیں۔ جو کریمیں شریمیں ملنی ہے مل لو۔"

"خوامخواہ ہی۔" مریم تپ گئی۔

"کیا خوامخواہ؟" حمیدہ نے گھورا۔ "اچھے لوگ ہیں۔ پڑھا لکھا لڑکا' سرکاری ملازم' اپنا گھر اور تمہیں کیا چاہیے۔"

"بس آپ اسے منع کردیں۔"

حمیدہ تو حیران تھیں ہی' عریشہ بھی مریم کا منہ دیکھنے لگی۔ جو سوچ کر کیا ہو گیا تھا۔ نجانے وہ اتنا چڑ کیوں گئی تھی۔ پھر حمیدہ کو جوش اٹھا۔

"تیری زبان کے ساتھ ساتھ ٹانگیں بھی کاٹ کے رکھ دوں گی۔ بدذات' منہ نہ متھا۔ یہ نہیں پسند' وہ نہیں پسند۔ تو کسی لینڈ لارڈ کی اولاد ہے۔ ارے ہزار کا نوٹ دیتی ہوں۔ تب جتنوں' بہانوں سے کوئی آدھ رشتہ جڑنے لگتا ہے۔ ان کو بھی تو پسند آجائے تو غنیمت ہے۔"

"میں نے کہا نا۔ مجھے نہیں کرنی اس سے شادی۔" مریم چیخ اٹھی۔

"جس سے کرنی ہے' اس کا نام بتادے۔ جو ناک رکھا ہے' اسی کے ساتھ تیرا منہ کالا کردوں گی۔"

عریشہ ٹکر ٹکر دونوں کا منہ دیکھنے لگی۔

"کن جاہلوں کے خاندان میں پیدا ہو گئی۔" مریم جھٹکے سے اٹھی اور دھپ دھپ کرتی باہر نکل گئی۔

حمیدہ کی توپوں کا رخ عریشہ کی طرف ہو گیا۔

"سچ سچ بتا' اس کا کسی کے ساتھ آنکھ مٹکا چل رہا ہے۔"

"ن۔۔۔ نہیں تائی امی!" وہ بوکھلا گئی۔

"لڑکی جب اتنی بدزبان ہو جائے تو سمجھ لو کوئی چکر چل رہا ہے' کسی کی شہ پر لمبا اچھل رہی ہے۔ اتنی سودائی نہیں ہوں کہ اس کے تیور نہ پہچان سکوں۔ اس کو کہہ دینا شام کو تیار ہو کر مہمانوں کے سامنے آئے ورنہ نعمان سے کہہ کر ٹنڈیاں تڑوا دوں گی۔"

نعمان کا نام لیتے انہوں نے ٹھٹک کر عریشہ کا منہ دیکھا۔ پھر سر جھٹک کر غصے سے باہر نکل گئیں۔

عریشہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا۔ گھر میں کچھ ہنگامہ ہونے ہی والا ہے۔ اور اگر معاملہ نعمان کے سامنے چلا جاتا تو اس کے غصے سے سب ہی واقف تھے۔ وہ کتابیں چھوڑ کر مریم کو ڈھونڈتی اوپر آگئی۔ جو چھت پر ٹہل ٹہل کر اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"لے آئیں اماں کا پیغام۔" وہ تلملا کر بولی۔ عریشہ نے من وعن پیغام اس تک پہنچا دیا۔

"جو مرضی کریں۔ ٹانگیں تڑوائیں یا جان سے ماریں۔ شادی یہاں نہیں کروں گی۔" اس کے لہجے میں بغاوت ہی بغاوت تھی۔

"تو کہاں کرو گی؟" عریشہ نے رسانیت سے پوچھا۔

مریم متذبذب سی اسے دیکھنے لگی۔

"تم کسی کو پسند کرتی ہو؟"

"ہاں۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد مریم نے

جواب دیا۔

"کون ہے؟"

"ہے کوئی۔" وہ رخ بدل گئی گویا نام بتانے کا ارادہ نہ تھا۔

"تو تائی امی کو بتادو۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہو گا' غیر خاندان' غیر ذات' بے روزگار' اماں کہاں مانیں گی۔"

"تو۔ پھر مریم؟" عریشہ پریشان ہو کر قریب آئی۔

"ہم دونوں کو تھوڑا وقت چاہیے۔ اسے بھی جاب ڈھونڈنی ہے۔ اپنے گھر والوں کو منانا ہے اور یہاں اماں ہیں کہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کو تیار ہیں۔" وہ بےبسی سے بولی۔ عریشہ بھی سوچ میں پڑ گئی۔

"اچھا سنو! اب شام کے لیے اور کوئی پھڈا نہیں کرو۔" وہ کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے بولی۔

"مگر میں۔"

"ان باتوں کا ابھی وقت نہیں ہے۔ تم مہمانوں سے مل لو۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ تمہیں پسند کر ہی لیں۔ فی الحال یہ وقت ٹالو۔ بعد میں دھیرے دھیرے تائی امی کو سمجھالیں گے۔"

عریشہ نے سمجھایا تو وہ تھوڑے سے پس وپیش کے بعد مان گئی کہ اور کوئی رستہ بھی تو نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"کباب' سموسے' فروٹ کیک' دہی بھلے' چائے کے ساتھ اتنا کچھ ہی کافی ہے۔ اور کھانے میں۔"

حمیدہ کی لسٹ لمبی ہی ہوتی جارہی تھی۔ عریشہ نے بےچارگی سے انہیں دیکھا۔

"کھانا ابھی رہنے دیں۔ بات پکی ہو جائے تو کھانے پر بلا لیجیے گا۔"

"ہاں۔ یہ بھی ٹھیک ہے' ویسے مجھے امید ہے بات پکی ہو جائے گی۔ لڑکے کی یہی شرط ہے کہ لڑکی استانی ہو۔ شکل وصورت کی خیر ہے۔ خود بھی بس پورا سارا ہی ہے۔ انہوں نے کہا ہے لڑکی پسند آگئی تو ساتھ ہی نشانی بھی کر جائیں گے۔ صغریٰ نے بڑی امید دلائی ہے۔" حمیدہ نے وچولن کا نام لیا۔ عریشہ ہکا بکا تائی کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

"مگر۔۔۔ مریم۔"

"مریم نے ناں کی تو میں اسے زہر دے دوں گی۔" حمیدہ کے ارادے خطرناک تھے' عریشہ چپکی ہو رہی۔ مریم جانے اور تائی۔ وہ خوامخواہ اس پھڈے میں آکر بری نہیں بننا چاہتی تھی۔

"اچھا نعمان کو فون کر۔ سموسے تو گھر میں۔۔۔" انہوں نے عریشہ کو دیکھا۔ وہ مسکینی صورت بنائے انہیں دیکھنے لگی۔

"چل چھوڑ۔ کباب اور دہی بڑے گھر میں بنالینا۔ اسے کہو کیک اور سموسے لیتا آئے۔ یہ فاطمہ ابھی تک نہیں آئی۔ آکر کچھ اپنے باپ کو سمجھا دیتی۔ وہ تو جب بولنے پر آتا ہے تو قبریں پھاڑتا ہے۔"

عریشہ نے کچھ بھی تبصرہ کیے بغیر نعمان کا نمبر ملایا۔

"اچھا دیکھ دو بوری چینی۔ اور وہ سبز الائچی۔" وہ اپنے دھندے میں الجھا تھا۔

"نعمان بھائی!"

"ہاں۔۔۔ بولو عریشہ!"

"وہ شام کو مہمان آرہے ہیں۔۔۔" اس نے تائی کا پیغام من وعن پہنچایا۔

"ٹھیک ہے۔ تم نے کچھ منگوانا ہے' کوئی کریم۔۔۔ پرفیوم وغیرہ۔"

"مہمان مریم کو دیکھنے آرہے ہیں' مجھے نہیں۔" وہ ہنسی۔

حمیدہ نے چونک کے عریشہ کو دیکھا اور بےچین ہو کر ٹوکا۔

"اب بس بھی کرو' کیا کہانیاں سنانے بیٹھ گئی ہو۔"

"نعمان بھائی! مجھے فاطمہ آپی کو فون کرنا ہے۔"

اس نے جلدی سے لائن کاٹ دی۔

"عریشہ!" وہ وہاں پھینٹ رہی تھی۔ جب سرخ سوٹ میں کھلی کھلی سی فاطمہ اس کے پیچھے چلی آئی۔ شادی کے بعد اس کی شخصیت ہی بدل گئی تھی۔ محسن کی رفاقت نے اس کی شخصیت کو بلا کی جاذبیت اور

اعتماد بخشتا تھا۔ جب سے طیبہ جمل کے ساتھ گئی تھی۔ راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔

"جی آپی۔۔۔؟"

"مجھے مریم کچھ خوش نہیں لگ رہی۔" وہ ابھی ابھی مریم سے مل کر آئی تھی اور الجھی ہوئی تھی۔ عریشہ ایک پل کو سوچ میں پڑ گئی۔ اسے فاطمہ سے یہ بات شیئر کرنی چاہیے کہ نہیں۔ پھر اسے لگا یہ موقع مناسب نہیں ہے۔ تب ہی بہانہ گھڑ دیا۔

"ہوں لڑکے والوں کا بار بار دیکھنے آنا آتی بھی خوش آئند بات نہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔"

"بات سن فاطمہ!" حمیدہ اندر آئیں۔۔۔ وہ موتیا رنگ کا نفیس سا سوٹ پہنے اس کا پتلا سا دوپٹہ سنبھالنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھیں۔

"اپنی ساس کو بھی لیتی آتی۔"

"ارے کیوں آپ کو تو میری ساس گوارا ہی نہیں ہوتیں۔" فاطمہ نے ہنستے ہوئے چوٹ کی۔

"ہاں پر باتیں تو پڑھے لکھوں جیسی کرتی ہے۔"

"ہاں! وہ پڑھی لکھی ہیں۔" فاطمہ نے یاد کروایا۔

"ہاں۔۔۔ وہی۔۔۔ مریم کی سسرال پر اچھا رعب پڑتا۔"

"وہ شام میں چکر لگائیں گی نہ۔۔۔ کہہ رہی تھیں ابھی تو لڑکے والے دیکھنے آ رہے ہیں۔ اتنی بھیڑ لگانا اچھا نہیں لگتا۔" دونوں باتیں کرتی باہر نکل گئیں عریشہ مریم کی سسرال پر ہی غور کرتی رہ گئی۔ تب ہی ابرار ہاتھوں میں کچھ شاپرز اٹھائے چلا آیا۔

عریشہ نے چونک کر دوپٹہ سر پر لیا۔

"یہ نعمان بھائی نے کچھ سامان بھجوایا ہے۔"

"ہوں رکھ دو۔" عریشہ نے اشارہ کیا۔۔۔ تو وہ شاپرز رکھنے کو جھکا اور سیدھے ہوتے ہوئے عریشہ کو غور سے دیکھا۔۔۔ بس ایک لمحے کا دیکھنا تھا اور وہ سیدھا ہو گیا۔۔۔ مگر ایک لمحے میں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ الجھی ہوئی ہے۔

عریشہ نے اس کا دیکھنا محسوس کیا یا نہیں۔ البتہ اس کی کہی بات ضرور کانوں میں گونج اٹھی۔

"مرد اور عورت کی تنہائی میں تیسرا شیطان ہوتا ہے۔"

اس نے گھبرا کر ابرار کو دیکھا۔ وہ دروازے پر کھڑا تھا۔

"کچھ اور تو نہیں منگوانا"

"نہیں۔۔۔" اس نے بنا شاپرز دیکھے ہی کہہ دیا۔۔۔ تو وہ خاموشی سے پلٹ گیا۔ عریشہ بے دلی سے کام نمٹانے لگی۔ تھوڑی دیر تک مہمان بھی آ گئے۔۔۔ فاطمہ ذرا دیر وہاں بیٹھی پھر کچن میں آ گئی۔

"یہ میں دیکھ لیتی ہوں۔ تم ذرا مریم کو دیکھ لو۔۔۔ اس کے موڈ کا کچھ پتا نہیں چلتا۔۔۔ حالانکہ ہم جیسے سفید پوش گھرانوں کی لڑکیوں پر ایسے نخرے کہاں جچتے ہیں۔"

"میں دیکھتی ہوں۔" وہ اندر مریم کے پاس چلی آئی۔ مریم تیار تھی۔ مگر چہرے کے تاثرات سخت اور غصہ ناک پر دھرا ہوا۔

"اب موڈ تو ٹھیک کر لو۔"

"مجھے کون سا یہاں شادی کرنی ہے۔۔۔ جو ہنس ہنس کر دکھاؤں۔" وہ تنک کر بولی۔

"وہ تو بعد کا مسئلہ ہے۔۔۔ ابھی تو وہاں سب گھر والے موجود ہیں۔" عریشہ نے رسانیت سے سمجھانا چاہا تو وہ اور چڑ گئی۔

"ہاں سب مل کر میرا تماشا لگاؤ۔"

"کوئی تماشا نہیں لگ رہا۔۔۔ اٹھو چائے لے جاؤ۔" اس نے ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا۔ حریم نے بدک کر ہاتھ چھڑایا۔

"میں نہیں لے جا رہی چائے وائے۔۔۔ خود جا رہی ہوں یہی کافی ہے۔"

"توبہ کتنے نخرے کرتی ہو۔۔۔ اٹھو۔"

وہ با دل ناخواستہ اٹھی۔

"دوپٹہ تو سر پر لے لو۔۔۔ وہاں تایا جی بیٹھے ہیں۔"

"گلے میں ڈال کر پنکھے سے نہ لٹک جاؤں۔"

"اس کا موقع بعد میں آئے گا۔" عریشہ زچ ہو گئی تھی۔ مریم تن فن کرتی گئی۔ مگر باپ کو دیکھ کر دوپٹہ بھی سر پر آ گیا اور بھائیوں کے لحاظ میں مہمانوں سے بھی تمیز سے مل لی۔ چائے لے کر عریشہ کو جانا پڑا۔

"یہ بچی بھی آپ کی ہے؟" مہمان خاتون نے دلچسپی سے شہابی رنگت والی عریشہ کو دیکھا۔

"جی۔۔۔ یہ میری ہونے والی بہو ہے۔" حمیدہ نے کسی خطرے کے پیش نظر فورا" وضاحت کی۔

"بڑی بہو یا چھوٹی بہو۔" خاتون کو کچھ زیادہ ہی کرید کی عادت لگتی تھی۔ نعمان کی نظریں عریشہ کی طرف اور عریشہ کی ثوبان کی طرف اٹھیں۔۔۔ جبکہ تایا' تائی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ فاطمہ کو خاموشی کا یہ مختصر سا وقفہ غیر ضروری اور بے معنی سا لگا۔

"مریم۔۔۔ چائے تو دو۔" انہوں نے مسکرا کر سوال کو ان سنا کر دیا۔

مریم ٹس سے مس نہ ہوئی۔ بلکہ عریشہ کو ٹھوکے دینے لگی۔ فاطمہ اور عریشہ نے جلدی جلدی چائے سرو کر دی۔ چائے خوشگوار ماحول میں پی گئی۔ تایا اور تائی مدبر بنے بیٹھے رہے۔ زیادہ گفتگو لڑکوں اور فاطمہ نے کی اور جاتے جاتے مریم کی متوقع ساس نے پرس سے دو ہزار نکال کر مریم کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔

"بس بہن! اب ہم لوگ نہیں' آپ لوگ آئیں گے۔"

مارے خوشی کے حمیدہ کے منہ سے کوئی بات نہیں نکلی۔ انہیں لگا سینے پر دھرا آخری پہاڑ بھی سرک گیا ہے۔

مریم تیزی سے اٹھ کر اندر بھاگی۔۔۔ سب سمجھے شرما گئی ہے۔

یہ تو عریشہ جانتی تھی کہ وہ شرمائی ہے یا احتجاجا" واک آؤٹ کر گئی ہے۔

☼ ☼ ☼

کمرے میں ابھی تک محفل جمی تھی۔ سب لوگ مطمئن سے بیٹھے تھے۔ عریشہ کچن میں آ کر باقی بچی چیزیں سمیٹنے لگی۔ تب ہی خیال آیا' مہمانوں کے چکر میں آج دوپہر کا کھانا گول ہو گیا۔ سب نے چائے کے ساتھ کچھ نہ کچھ کھا پی لیا تھا۔ مگر ابرار۔۔۔؟ آج نہ جانے کیسے عریشہ کو اس کا خیال آ گیا۔ اس نے کچھ چیزیں ٹرے میں رکھیں اور فرید کے ہاتھ بیٹھک میں بھجوا دیں۔

ابرار خود بھی اس عنایت پر حیران رہ گیا۔

"کس نے بھجوائی ہیں؟"

"عرشی باجی نے' مریم باجی کا رشتہ پکا ہو گیا ہے۔" فرید نے بتانے کے ساتھ ساتھ اطلاع دی۔

"اچھا۔۔۔ پھر تو تمہاری مریم باجی بیاہ کر چلی جائیں گی۔"

"اچھا ہے نا' جان چھوٹے گی' ہر وقت ڈانٹتی رہتی ہیں۔" وہ منہ بنا کر بولا۔

"اور عرشی باجی۔۔۔ وہ نہیں ڈانٹتیں۔" اس نے سموسہ اٹھاتے سرسری انداز میں پوچھا۔

"پہلے تو وہ بہت ڈانٹتی تھیں۔ مگر جب سے چچی فوت ہوئی ہیں' وہ بہت بدل گئی ہیں۔"

"ہوں۔" ابرار نے ہنکارا بھرا۔۔۔ فرید واپس بھاگ گیا۔ اسے اپنا حصہ کھانا تھا۔

"بدل تو وہ واقعی گئی ہے۔"

☼ ☼ ☼

"عریشہ۔۔۔" ثوبان اسے کچن میں دیکھ کر وہیں چلا آیا۔ وہ اس دن سے ثوبان سے کترانے لگی تھی۔ اکیلے ملنے اور اکیلے اس کے کمرے میں جانے سے گھبرانے لگی تھی۔

"ہوں۔۔۔ کچھ چاہیے۔" اس نے سنجیدگی سے ثوبان کو دیکھا۔

"تم ناراض ہو؟"

"نہیں۔" وہ سر جھکا کر مٹھائی واپس ڈبے میں ڈالنے لگی۔

"اس دن۔۔۔"

"اس دن۔۔۔" عریشہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اس دن احتیاط کا دامن میرے ہاتھ سے بھی چھوٹا تھا۔ اس لیے صرف تمہیں قصوروار نہیں ٹھہرا سکتی۔"

"عرشی! یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے' ایک معمولی سی لغزش۔۔۔"

"ایک معمولی لغزش بھی بڑی تباہی کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے ثوبان! خاص طور پر ایک لڑکے اور لڑکی کے درمیان اور اس لغزش میں نقصان ہمیشہ لڑکی کا ہوتا ہے۔" اس نے ایک ہلکی سی نگاہ ثوبان پر ڈالی۔

"تم مجھ پر شک کر رہی ہو۔" ثوبان کے ماتھے پر شکن ابھری۔

"میں تو خود پر بھی شک کر رہی ہوں۔" وہ مضمحل سی ہو گئی۔ "کتنا کمزور نفس تھا میرا کہ ایک پل میں پھسلتی چلی گئی۔"

"تم خوامخواہ ایک چھوٹی سی بات کو بڑھا کر کہاں سے کہاں لے جا رہی ہو۔" وہ جھنجلا گیا۔ مرد تھا۔ اس لیے عرشہ کے محسوسات سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا۔ اس کے نزدیک یہ چھوٹی موٹی لغزشیں زندگی کا حصہ تھیں۔

"ثوبان! پتا ہے یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہماری مائیں' ہمیں بہت پہلے سے سمجھانا شروع کر دیتی ہیں۔ امی بھی سکھایا کرتی تھیں۔ مگر میں ایسی نادان تھی کہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتی۔ مگر کبھی کبھی آگہی کا ایک چھوٹا سا پل عقل و شعور کے سارے دروازے کھولتا چلا جاتا ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولتی چلی گئی۔

"تم تو بہت بڑی بڑی باتیں کرنے لگی ہو۔۔۔ واقعی استانی بن گئی ہو۔" ثوبان نے طنز کیا تھا یا مذاق اڑایا تھا۔۔۔ اس نے سنبھل کر نظریں اٹھائیں۔

"اچھا اب اپنا لیکچر بند کرو۔" وہ سچ مچ بور ہو گیا۔

"ثوبان! اب شادی کر لیں؟"

وہ جاتے جاتے رک گیا۔ عرشہ سب کام چھوڑے اسی کو دیکھ رہی تھی۔

"ابھی؟" اس نے مذاق میں ٹالنا چاہا۔

"جلد سے جلد۔" وہ سنجیدہ تھی۔

"دیکھیں گے۔ سوچتے ہیں اس بارے میں۔" ثوبان نے کہا اور چلا گیا۔ عرشہ بجھے دل کے ساتھ چیزیں سمیٹنے لگی۔ اسے ابھی سوچنا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کچھ مت کہنا۔ خبردار جو مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔ ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گی۔" مریم پورے کمرے میں چکرا رہی تھی۔ ہزار کے دونوں نوٹ بیڈ پر چُرمُرے پڑے تھے۔

"میں یہ شادی کبھی نہیں کروں گی۔"

"ابھی کون سا شادی ہو رہی ہے۔" عرشہ نے اکتا کر مریم کو دیکھا۔

"جس طرح پکڑ کر یہ رشتہ طے ہوا ہے' اسی طرح شادی بھی کر دیں گے۔" عرشہ کو محسوس ہوا' وہ خوف زدہ ہے' ڈری ہوئی ہے' اپنی جھنجلاہٹ میں اس ڈر کو چھپانے کی سعی کر رہی ہے۔

"مریم! وہ اچھے لوگ ہیں۔"

مریم رک کر عرشہ کو دیکھنے لگی اور عجیب سے لہجے میں بولی۔

"عرشی! تم تو محبت کرتی ہو' پھر یہ کیسے کہہ سکتی ہو۔ وہ اچھے ہوں گے۔ مگر وہ فہد تو نہیں ہیں۔"

"فہد!" عرشہ بری طرح چونکی۔ "تمہارا مطلب ہے۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں میرا وہی مطلب ہے۔" وہ چیخ اٹھی۔

"چلاؤ مت۔" عرشہ نے ناگواری سے ٹوکا۔ "میری آنکھوں کے سامنے یہ کھیل ہوتا رہا اور مجھے ہی خبر نہیں۔ اب پتا چلا' وہ ساری چہ میگوئیاں تم دونوں کے متعلق تھیں۔"

"کیسا کھیل؟ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی ہیں اور تم اسے کھیل کہہ رہی ہو۔" مریم اسی پر الٹ پڑی۔

"اچھا ٹھیک ہے' اگر تم دونوں ایک دوسرے سے اتنی محبت کرتے ہو۔ ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھا چکے ہو تو فہد سے کہو اپنے گھر والوں کو بھیجے۔۔۔ تاکہ بات

کچھ آگے بڑھے۔" عرشہ نے نرم لہجے میں کہا۔

"کیسے بھیج دے۔ ابھی اس کے پاس کوئی جاب نہیں ہے۔ ابھی تو اس کے گھر والے بھی نہیں مان رہے۔" وہ تھک کر بیڈ پر بیٹھی۔

"تو پھر؟" عرشہ نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔

"پھر یہ کہ میں زہر کھا لوں گی۔۔۔ اور یہ۔۔۔" اس نے جھپٹ کر روپے اٹھائے اور دروازے کی طرف دے مارے۔ "یہ جا کر انہیں واپس کر دو۔"

نوٹ اڑتے ہوئے حمیدہ کے قدموں میں گرے۔ عرشہ کی جان ہوا ہو گئی۔

حمیدہ نے غضب ناک نگاہوں سے مریم کو دیکھا' چیل کی طرح جھپٹیں اور مریم کو بالوں سے پکڑ لیا۔

"تو کیا زہر کھائے گی۔ میں دوں گی تجھے زہر' بتا کون ہے وہ۔ جس کے لیے یہ سب کر رہی ہے' کس نے سبز باغ دکھائے ہیں۔" انہوں نے مریم کے منہ پر کئی تھپڑ کھینچ مارے۔ عرشہ نے ہوش میں آئی اور بھاگ کر مریم کو پکڑا۔

"خدا کے لیے تائی امی! چھوڑ دیں' کوئی بھی نہیں ہے۔ میں سچ کہتی ہوں' وہ مان جائے گی۔" کن وقتوں سے حمیدہ کے بھاری بھرکم وجود کو پیچھے کیا۔

"آج کے بعد اس کا گھر سے نکلنا بند۔۔۔ کالج جانا بند۔۔۔ اور اگر اس نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو یاد رکھنا میں اپنے ہاتھوں اسے زہر پلاؤں گی۔"

فاطمہ دروازے میں افتاں و خیزاں آ کھڑی ہوئی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ لڑکے گھر سے باہر نکل گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"کیا کروں؟ کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ یہ دو آفتیں میرے سر پر کھڑی ہیں' کیسے نمٹوں۔" وہ دونوں ہاتھ مسلتے پریشانی سے کہہ رہی تھیں۔ فاطمہ تو منہ سے ایک لفظ نہ نکال سکی۔ بس حیرت سے ماں کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

"اماں! اب کیا ہو گا؟"

"مریم تو لڑکی ہے۔۔۔ کچھ مار پیٹ کر کے منا ہی لوں گی۔۔۔ پر سمجھ میں نہیں آتا نعمان کا کیا کروں۔۔۔ اسے بیٹھے بٹھائے کہاں سے عرشہ کا خیال آ گیا۔"

"آپ نے بھائی کو بتانا تھا کہ عرشہ اور ثوبان۔۔۔"

"اس کے تیور ٹھیک نہیں ہیں۔۔۔ کچھ نہ کچھ کر بیٹھے گا۔۔۔ بڑا عجیب انداز تھا اس کا۔۔۔ تو نے دیکھا نہیں' پہلی بار مجھے اس سے ڈر لگا۔" وہ واقعی نعمان کے رویے سے خائف ہو گئی تھیں۔ نعمان نے اگر چاہا تھا کہ وہ انتقاماً سب کو ہلا دے۔۔۔ تو اس نے ہلا دیا تھا۔

"تو کیا کریں گی؟"

"کچھ نہ کچھ تو کروں گی۔۔۔ تم لوگوں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو نہیں بیٹھوں گی' پاگلوں کی طرح میری شکل دیکھنے لگتی ہیں۔"

فاطمہ شرمندہ سی ہو گئی۔ پھر آہستگی سے بولی۔

"پھپھو آج شاید بات کریں۔"

"تمہاری ساس کو بڑا شوق ہوتا ہے ہمارے معاملات میں ٹانگ اڑانے کا' وہ بات کرے گی تو میں جواب بھی دے دوں گی اور جو بھی جواب دوں' تم نے کچھ نہیں بولنا۔ سمجھ میں آئی بات۔"

فاطمہ نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یقیناً اماں کچھ نہ کچھ سوچ بیٹھی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"اس جمعے کو تمہارا اور عرشہ کا نکاح ہے۔" وہ بات کرتے ہوئے بہت غور سے ثوبان کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

"کیا کہہ رہی ہیں اماں؟" ثوبان نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"کان بند ہیں؟" انہوں نے جان بوجھ کر رکھائی سے کہا۔

"میں کن چکروں میں پھر رہا ہوں۔۔۔ آپ کو شادی کی پڑ گئی ہے۔" اس نے جھنجلا کر چمچہ پلیٹ میں پٹخا' ساری کھیر کا مزا خراب ہو گیا تھا۔

"شادی نہیں کرنی؟" وہ نعمان کو ٹٹول چکی تھیں۔۔۔ اب ثوبان کو دیکھنا چاہتی تھیں۔ ابھی کل رات ان کی نعمان سے بات ہوئی تھی۔ اس نے

صاف کہہ دیا۔ اس کی عریشہ سے شادی نہ ہوئی تو وہ گھر چھوڑ جائے گا اور نعمان کا گھر چھوڑنا وہ افورڈ ہی نہیں کر سکتی تھیں۔

"کرنی ہے 'مگر ابھی نہیں' میں باہر چلا گیا تو چار' پانچ سال سے پہلے واپس نہیں آسکتا ہوں۔ ایسے میں اسے کیسے یہاں نکاح کر کے چھوڑ جاؤں۔"

"اور تمہیں لگتا ہے کہ میں اسے پانچ سال تک تمہارے انتظار میں بٹھائے رکھوں گی۔" وہ چمک کر بولیں۔ ثوبان نے الجھ کر اں کو دیکھا۔

"اب بول۔" "نہیں اپنی پسند کا پتا چل گیا تھا۔

"ہاں! عریشہ مجھے اچھی لگتی ہے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن ابھی یہ ذمہ داری نہیں اٹھا سکتا۔"

"اور اتنے سال میں اس یتیم کو لارے لپے میں بٹھائے رکھوں' کیوں؟"

"آپ نے تو مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔"

"تو اس سے پیار کرتا ہے؟"

"ہاں۔" بڑی سوچتی ہوئی ہاں تھی۔

"کتنا؟"

"اب یہ کیسے بتاؤں؟"

"اس کے لیے جان دے سکتا ہے؟"

"ہاں۔" وہ حیران ہوا۔

"پتا؟" انہوں نے اصرار کیا۔

"آج کل کون کسی کے لیے جان دیتا ہے۔"

"اس کی خاطر باہر جانا چھوڑ سکتا ہے؟" حمیدہ نے ہاتھ اٹھا کر حتمی انداز سے پوچھا۔

"میں کسی کی بھی خاطر اپنا مستقبل داؤ پر نہیں لگا سکتا۔" ذرا رک کر اس نے صاف لہجے میں کہہ دیا۔

"بس پھر۔" مارے خوشی کے حمیدہ نے اپنے ہاتھ پر دوسرا ہاتھ مارا۔ "عریشہ کو چھوڑ دے۔"

"جی۔"

"دیکھ ثوبان! تو پڑھا لکھا ہے۔ خوش شکل ہے۔ تجھے بڑی سے بڑی نوکری مل جائے گی۔ باہر جا کر کسی امیر گھرانے میں بیاہ کر لینا۔ بچی خود جتنی مرضی نکریں مارے۔ سسرال بھاری مل گئی تو یوں پکڑ کر۔۔۔ آسمان تک لے جائے گی۔ عریشہ کے پاس کیا ہے۔ دس' پندرہ ہزار پر معمولی سی استانی۔۔۔ شکل و صورت بھی بس گوارا ہی ہے۔ وہ چار بچے ہو گئے تو ساجدہ بانو جیسی لگنے لگے گی۔ تو تو شہزادہ ہے اور تیرے لیے تو شہزادی ہونی چاہیے۔" انہوں نے خود ہی ثوبان اور عریشہ کو ایک دوسرے کی طرف متوجہ کیا تھا۔ اب خود ہی اپنی غلطی کو سدھارنا چاہتی تھیں۔

"کیا بات کر رہی ہیں اماں۔ آپ جانتی ہیں کہ میں اور عریشہ۔۔۔" وہ حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔

"کیا؟ ہم نے کون سا تم دونوں کی منگنی کی تھی۔"

"لیکن آپ نے ہمیشہ کہا کہ میری شادی عرشی سے ہوگی۔ وہ بھی یہی سپنے دیکھ رہی ہے۔ اب یوں اچانک میں کیسے۔۔۔؟"

"یا اس کے سپنے بچا لے یا اپنے۔" وہ تاؤ کھا کر اٹھیں۔ "اچھی طرح سوچ لے ثوبان۔۔۔ اگر عریشہ سے شادی کرتا ہے تو باہر جانے کا خیال دل سے نکال دے۔"

وہ غصے سے کہہ کر چلی گئیں۔ ثوبان سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

☆ ☆ ☆

عریشہ' مریم کی وجہ سے خود بھی کئی دن کالج نہیں گئی۔ پھپھو کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ وہ آنہ سکیں۔ محسن آکر فاطمہ کو لے گیا۔ چوتھے دن وہ کالج جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ جب مریم اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ عریشہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"سوری مریم آنٹی میں۔۔۔"

"کوئی بات نہیں عرشی! میری خاطر تم کیوں اپنا مستقبل تباہ کرو۔ میرا اک کام کرو گی؟"

"ہاں کہو۔" عریشہ جانتی تھی۔ وہ اس وقت اپنی زندگی کے مشکل ترین دور سے گزر رہی ہے' تب ہی محبت سے بولی۔

"یہ فہد کو دے دینا۔" اس نے ایک سفید لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔

"نہیں... میں یہ نہیں دے سکتی۔" عریشہ بدک کر پیچھے ہوئی۔

"کیوں عرشی؟"

"مریم! یہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیوں؟ میں صرف ایک آخری کوشش کرنا چاہتی ہوں' شاید فہد اپنے والدین کو لے ہی آئے' پلیز عرشی! ہمیں زندگی بھر یہ پچھتاوا تو نہ ہو کہ ہم نے کوشش ہی نہیں کی۔"

عریشہ متذبذب سی اسے دیکھنے لگی۔

"تم تو خود محبت کرتی ہو عرشی! تم بھی میرا درد نہ سمجھو گی۔" مریم نے ایسے لہجے میں کہا کہ عریشہ پگھل گئی۔ اگر کوئی اسی طرح ثوبان کو اس سے الگ کرنے کی کوشش کرے تو اس کا کیا حال ہو۔

"ٹھیک ہے' مگر تمہیں بھی ایک وعدہ کرنا ہوگا۔" اس نے لفافہ تھام لیا۔

"میں وعدہ کرتی ہوں۔" وہ بعجلت بولی۔

"سن تو لو۔" عریشہ اس کی بے تابی پر مسکرائی۔ "اگر فہد اپنے والدین کو نہ لاسکا تو تم کوئی ایسا ویسا قدم نہیں اٹھاؤ گی۔ خاموشی سے شادی کرلوگی۔"

"ظاہر ہے۔ اس کے بعد میرے پاس اور کوئی آپشن بھی تو نہیں رہے گا۔" مریم نے آہستگی سے کہا اور جاکر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ عریشہ نے احتیاط سے وہ لفافہ اپنے بیگ میں سنبھال لیا۔

اسے لفافہ دینے کے لیے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔ فہد گیٹ کے آس پاس ہی چکرا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بے تابی سے پاس آیا۔

"مریم..." وہ کہتے کہتے رکا۔ "آپ لوگ اتنے دنوں سے کالج کیوں نہیں آرہیں۔"

عریشہ نے اسے غور سے دیکھا اور بیگ سے لفافہ نکال کر اسے تھمادیا۔

"یہ مریم نے دیا ہے۔"

لفافہ دے کر وہ رکی نہیں' تیزی سے کلاس روم کی طرف چلی گئی۔

سارا دن اس کی متلاشی نگاہیں فہد کے تعاقب میں رہیں۔ وہ کچھ چپ اور بے چین لگ رہا تھا۔ لڑکے بار بار اسے چھیڑ رہے تھے اور کیوں چھیڑ رہے تھے۔ عریشہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ ایک' دو نے پاس آکر مریم کے نہ آنے کی وجہ بھی پوچھی۔ عریشہ نے بخار کا بہانہ کردیا۔ چھٹی کے وقت جب وہ کتابیں سمیٹ رہی تھی۔ فہد نے ایسا ہی ایک لفافہ چپکے سے اس کی کتابوں میں رکھ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلا دن چھٹی کا تھا۔ عریشہ نے مشین لگالی۔ سارے گھر کے کپڑے ایک طرف اور نعمان کے کاٹن کے سوٹ ایک طرف' جنہیں دھو کر کلف لگانا پڑتی تھی۔ عریشہ کو یہی کام سب سے برا لگتا تھا۔

"وہ کپڑے دھو رہی ہے تو... تو اٹھ کر ہنڈیا بنالے... کیا معذوروں کی طرح پلنگ توڑ رہی ہے۔ عریشہ تیرے باپ کی نوکر لگی ہے۔"

حمیدہ نے مریم کو لتاڑا۔ آج کل سارا نزلہ اسی پر تو گرتا تھا۔ وہ بغیر کوئی جواب دیے باورچی خانہ میں چلی گئی۔ عریشہ جانتی تھی۔ یہ سارا اعجاز اسی خط کا ہے۔ جو فہد نے دیا۔

تب ہی ثوبان اندر آیا۔

عریشہ سامنے ہی بالٹی میں کپڑے نچوڑ رہی تھی۔ بالوں کو کس کر کیچر میں جکڑا تھا۔ بھیگا ملگجا لباس' جب تک عادلہ زندہ تھیں۔ وہ اچھے کپڑوں میں تتلی کی طرح اس کے گرد منڈلاتی تھی۔ مگر اب گزرتے وقت نے اس کی طبیعت میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ پیدا کردیا تھا۔ مزاج میں احتیاط کا عنصر بڑھ گیا تھا اور اب اس عام سے حلیے اور عام سے لباس میں وہ کتنی عام اور بے رنگ سی نظر آتی تھی۔

"اسے کبھی میرے برابر کھڑا کرکے دیکھنا وہ تمہیں نظر بھی نہیں آئے گی۔" اسے سنبعہ کی بات یاد آئی۔

"عریشہ کے پاس کیا ہے؟ دس' پندرہ ہزار پر معمولی سی استانی بنے گی۔ شکل و صورت بھی بس گوارا ہی ہے۔ وہ' چار بچے ہوگئے تو ساجدہ باجو جیسی لگنے لگے گی۔"

ثوبان نے اسے پھر سے غور سے دیکھا۔

وہ کم عمر تھی۔ اس سے محبت کرتی تھی۔ آگے پیچھے پھرتی تھی۔ ثوبان کا متوجہ ہونا فطری عمل تھا۔ مگر اب وہ تصور ہی تصور میں اس کا مستقبل دیکھ کر بدک رہا تھا۔

وہ' چار بچوں میں گھری گورنمنٹ اسکول کی بھاری بھرکم استانی۔

محبت تو شاید تھی ہی نہیں اور وقتی کشش پر لگا کر اڑ گئی۔

عریشہ کی نگاہ ثوبان پر پڑی۔

"تم کب آئے؟"

"ابھی..." وہ آگے بڑھا۔

"کھانا لاؤں؟" وہ نل کے نیچے ہاتھ دھونے لگی۔

"نہیں۔" ثوبان نے اسے آخری بار غور سے دیکھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ جھجکی۔

"کیا یہ لڑکی اس قابل ہے کہ میں اس کی خاطر اپنے خوابوں سے دستبردار ہوجاؤں؟" ثوبان نے خود سے سوال کیا۔ "نہیں' ہرگز نہیں۔ یہ عام سی لڑکی میرے خوابوں کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔"

فیصلہ ہوگیا تھا اور اسے یہ فیصلہ کرنے میں ایک پل لگا تھا کہ زندگی کی ترجیحات بالکل واضح تھیں۔ جن میں عریشہ بالکل آخری نمبر پر آتی تھی۔

وہ تیزی سے بغیر جواب دیے سیڑھیاں چڑھ گیا۔

عریشہ نل بند کرنا بھول گئی۔

وہ بے حد حیرت سے اسے اوپر جاتا دیکھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

عریشہ کمرے میں آئی تو مریم فہد کا خط کھولے بیٹھی تھی اور نہ جانے کتنی بار وہ یہ کام کرچکی تھی۔

"کیا لکھا ہے؟"

"ہوں۔" مریم چونکی۔

"فہد نے کیا لکھا ہے؟" اپنے بستر پر بیٹھتے ہوئے عریشہ نے دوبارہ پوچھا۔

"وہی جو تم نے کہا تھا۔" اس نے خط موڑ کر کتاب میں رکھا۔

"مطلب؟"

"اس کے والدین نہیں مان رہے۔ وہ چاہتا ہے میں گھر والوں کی مرضی سے شادی کر لوں۔"

"اچھا۔" عریشہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ پھر سوچتے ہوئے بولی۔ "چلو' یہ بھی اچھا ہوا کہ اس نے تمہیں دھوکے میں رکھنے کے بجائے صاف صاف بات کر دی۔ اب تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں نے کیا سوچنا ہے۔ جب سب کچھ ختم ہی ہو گیا۔" وہ لیٹ گئی۔ عریشہ کو حیرت ہوئی۔ وہ کتنی آسانی سے اس حقیقت کو تسلیم کر گئی۔ یا وہ بہت زیادہ مضبوط تھی۔ یا اسے فہد سے محبت ہی نہیں تھی۔ صرف وقتی کشش تھی۔ کیونکہ عریشہ کو اس کے چہرے پر نہ تو ملال کے رنگ نظر آئے' نہ کھو دینے کا دکھ۔

"سنو! تم نے اماں کو تو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔" کچھ دیر بعد مریم نے پوچھا۔

"نہیں اور شکر کرو اس دن تائی نے پوری بات نہیں سنی تھی۔"

"تب تو اماں سے معافی مل سکتی ہے۔" وہ چھت کو گھورتے ہوئے بڑبڑائی۔

"تم ان سے معافی مانگو گی؟" عریشہ کو خوشگوار حیرت ہوئی۔ مریم کے معافی مانگنے کا مطلب تھا اتنے دنوں کی چھائی ٹینشن کا خاتمہ۔

"غلطی کی ہے تو معافی بھی مجھے ہی مانگنا ہو گی۔" مریم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ہاں' اس طرح تم کالج بھی جا سکو گی۔ تمہارے بغیر بالکل دل نہیں لگتا مریم!"

مریم نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"عریشہ! تم بہت اچھی ہو۔"

"اچھا۔ حالانکہ تم ہمیشہ مجھ سے جیلس ہوتی رہی ہو۔" وہ ہنسی۔

"لیکن ہم اتنے اچھے نہیں ہیں۔" مریم سنجیدہ تھی۔

"مطلب؟"

"پتا چل جائے گا۔" وہ کچھ دن گھر میں رہی تھی تو اندازہ ہو گیا تھا کہ گھر میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"یہی کہ ہم سب اپنی اپنی غرض کے بندے ہیں۔ دوسروں کے احساسات اور جذبات کی اہمیت ہمارے نزدیک ہماری خواہشوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔" مریم نے پہلی بار عریشہ کے لیے بے حد حساس ہو کر سوچا تھا۔ شاید یہ دل پر لگی چوٹ کا اثر تھا۔

"پتا نہیں تم کیا کہہ رہی ہو' مجھے نیند آ رہی ہے۔" وہ تھکی ہوئی تھی' سو لیٹ گئی۔

"اچھی بات ہے' یہ چند راتوں کی نیند غنیمت سمجھو۔" مریم ہولے سے بڑبڑائی۔

☆ ☆ ☆

صبح اٹھتے ہی مریم نے حمیدہ کے پاؤں پکڑ لیے تھے اور اتنا بلک بلک کر روئی کہ عریشہ تو عریشہ حمیدہ بھی حیران رہ گئیں۔ مریم کا یہ روپ ان دونوں کے لیے نیا تھا۔

"اماں! مجھے معاف کر دیں۔ میں بھٹک گئی تھی۔ جذباتی ہو گئی تھی۔"

"پہلے یہ بتا' یہ کس کی شہ تھی۔"

"قسم خدا کی' کسی کی نہیں' بس میں کسی امیر گھر میں شادی کرنا چاہتی تھی اس لیے۔"

عریشہ کانپ کر رہ گئی۔ اس نے کس دھڑلے سے رب کی جھوٹی قسم کھائی تھی۔

"ٹھیک ہے پر یاد رکھ مریم! آئندہ ایسا کوئی کم ظرف کیا تو میں زہر کھا لوں گی۔"

عریشہ نے دہل کر حمیدہ کو دیکھا۔ نظروں میں عادلہ کا چہرہ گھوم گیا۔

"نہیں اماں! اب نہیں کروں گی۔" اس نے کان پکڑ لیے۔

"تائی امی! اب اسے کالج جانے کی بھی اجازت دے دیں۔" عریشہ نے سفارش کی۔

"کالج تو بھیجنا ہی پڑے گا۔ ٹھیک ہے' پر دھیان سے۔" وہ بڑی مشکلوں سے مانی تھیں۔ دل مطمئن تو نہ تھا۔ مگر کوئی واضح وجہ بھی سامنے نہ تھی۔ اس لیے اجازت دے دی۔

صبح وہ دونوں کالج جانے کے لیے تیار ہوئیں۔ عریشہ نے دیکھا وہ بالکل سادہ سے انداز میں تیار ہوئی تھی۔

"مریم۔"

"ہوں۔!" وہ بیگ میں کتابیں رکھ رہی تھی۔

"ماؤں کے دل بہت نازک ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی بیٹیوں کی معمولی سی غلطی پر دھڑکنا بھی چھوڑ دیتے ہیں۔" مریم نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔

"وہاں فہد بھی ہو گا' سو بی کیئر فل۔"

"تم فکر نہ کرو۔" وہ سکون سے مسکرائی۔

اور کالج میں عریشہ نے دیکھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بکسر انجان بنے بیٹھے تھے۔

گویا دونوں ہی یہ حقیقت تسلیم کر چکے تھے۔ عریشہ مطمئن ہو گئی۔

وہ کچن میں ہنڈیا بھون رہی تھی' جب نعمان نے اک کالا شاپر لا کر اس کے پاس رکھا۔ عریشہ یہی سمجھی کہ کچھ کھانے کی چیز ہو گی۔ وہ اکثر سب گھر والوں کے لیے کچھ نہ کچھ لاتا ہی رہتا تھا۔

"آج کیا لے آئے نعمان بھائی؟"

"تمہارے لیے کچھ چیزیں ہیں۔"

"میرے لیے؟" اس نے مڑ کر شاپر دیکھا۔

"ہوں' مریم تو اکثر ہی کچھ نہ کچھ منگواتی رہتی ہے۔ مگر تم نے کبھی فرمائش نہیں کی۔" وہ وہیں کھڑا تھا۔ عریشہ نے کچھ الجھ کر شاپر کھولا۔ شیمپو' کلینزنگ ملک' لپ اسٹک اور ایک عدد گھڑی۔

"مجھے لگا لڑکیوں کو ان ہی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"مجھے کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔" اس کی چھٹی حس نے الارم دیا تھا۔ وہ مڑ کر آنچ تیز کر کے ہنڈیا بھوننے لگی۔ "اگر ہوتی تو کہہ دیتی۔"

تب ہی ثوبان اندر آیا۔ نعمان اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"کسی اور چیز کی ضرورت ہوئی تو بتانا اور یہ چیزیں تو سمیٹو۔ تحفوں کی ناقدری نہیں کرتے۔"

"جی میں سمیٹ لوں گی' شکریہ۔" وہ ثوبان کی آمد سے بے خبر تھی۔

"گھڑی تو اچھی لگی؟" وہ خوامخواہ بات کو طول دے رہا تھا۔

"جی بہت اچھی ہے۔" عریشہ نے ٹالا تو نعمان مسکرا کر باہر نکل گیا۔

ثوبان نے ایک نظر عریشہ کو دیکھا اور فریج کھول کر پانی کی بوتل نکالنے لگا۔ اسے خود اپنی کیفیت سمجھ میں نہ آئی۔ اگر وہ خود ہی عریشہ سے دستبردار ہونے کو تیار تھا تو پھر یہ جلن کیسی؟ فریج کی آواز پر عریشہ مڑی۔

"او' تم ہو۔"

"یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہے؟" اس نے منہ سے بوتل ہٹائی۔

"کون سا؟" عریشہ نے ہنڈیا میں پانی کا چھینٹا دیا۔

"یہی تحائف والا۔"

عریشہ کو ثوبان کا لہجہ عجیب سا لگا۔

"یہ تو نعمان بھائی خود ہی۔۔۔"

"میں اتنا بھی بے وقوف نہیں ہوں کہ سارا کھیل سمجھ نہ سکوں۔" وہ غرایا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" عریشہ پوری کی پوری اس کی سمت مڑی۔

"یہی کہ تحفے اس سے وصول کرتی ہو اور بے وقوف مجھے بنا رہی ہو۔"

عریشہ کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

فرحت اشتیاق

جیسے ہیں سنگ سمیٹ لو

شہریار خان معزز اور اعلا خاندان سے تعلق رکھنے والے بے مثال ذہانت اور سحر انگیز شخصیت کے مالک ایک مغرور شخص ہیں۔ ورلڈ بینک میں ایک اعلا عہدے پر فائز ہیں اور بیوی بچوں کے ساتھ واشنگٹن میں رہتے ہیں۔ ان کی بیوی آمنہ خوب صورت اور ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں مگر گھریلو زندگی گزار رہی ہیں۔ سکندر اور زین ان کے دو بیٹے ہیں۔ سکندر اپنے باپ کا عکس ہے اس لیے شہریار خان کی تمام تر توجہ اور امیدوں کا مرکز ہے۔ زین ذہانت میں سکندر سے کم ہے۔ باپ کے امتیازی سلوک کی وجہ سے سکندر سے خائف رہتا ہے۔

محمود خالد نے عیسائی عورت وثوریا سے شادی کی مگر دونوں میں نبھ نہ سکی اور لیزا اور سیم کی پیدائش کے بعد دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ سیم اپنے باپ کی طرح ذہین اور خوب صورت تھی۔ علیحدگی کی صورت میں اسے اپنی ماں کے ساتھ رہنا پڑا ۔لیزا ذہانت و خوب صورتی میں درمیانے درجے کی تھی۔ وہ محمود خالد کے پاس رہی۔ وثوریا نے ارب پتی بزنس مین سے دوسری شادی کی اور میلان چلی گئی۔ نشے کی حالت میں وثوریا کا دوسرا شوہر سیم پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد لیزا کو اپنے والدین سے نفرت ہو جاتی ہے۔ وہ محمود خالد کو چھوڑ کر اپنی نینی کے ساتھ روم شفٹ ہو جاتی ہے۔ محمود خالد عائشہ سے دوسری شادی کر کے پاکستان شفٹ ہو جاتے ہیں۔ محمود خالد اپنا کاروبار بچانے کے لیے سیم کی شادی اس سے پندرہ سال بڑے ہاشم اسد سے کروا دیتے ہیں۔ لیزا کو اپنے باپ اور بہنوئی کی وجہ سے پاکستانی مردوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ لیزا ایک مصورہ ہے۔ روم میں ملازمت کے سلسلے میں آئے ہوئے سکندر سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ سکندر کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوتی ہے اور اس کو پینٹ کرنا چاہتی ہے مگر سکندر انکار کر دیتا ہے۔

مکمل ناول

زین کی زندگی میں ذہین اور حسین ام مریم آتی ہے۔ زین اسے پروپوز کرتا ہے۔ شہریار خان بھی راضی ہوجاتے ہیں۔ یوں ان دونوں کی منگنی ہوجاتی ہے۔ منگنی کے بعد زین ام مریم کو لے کر اپنے والدین کے پاس آتا ہے۔ وہاں ام مریم کی سکندر سے ملاقات ہوتی ہے۔ ام مریم سکندر کو بہت عزت دیتی ہے اور احترام سے پیش آتی ہے مگر سکندر اس سے بد اخلاقی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس بات پر زین ' سکندر سے مزید برگشتہ ہوجاتا ہے۔ اسی دوران گھر والوں کی عدم موجودگی میں سکندر ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے مگر بروقت زین اور شہریار خان کی آمد سے ام مریم بچ جاتی ہے۔
ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرنے پر شہریار سکندر کو اپنے گھر سے نکال دیتے ہیں اور اس سے ہر تعلق توڑ دیتے ہیں مگر کبھی کبھی آمنہ شہریار 'سکندر کو فون کرلیتی ہیں۔ زین کی شادی ہوچکی ہے اور اس کا ایک بیٹا علی ہے۔
سکندر کو احساس ہوجاتا ہے کہ لیزا بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ اسے اپنا پورٹریٹ بنانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ تصویر بنانے کے دوران دو مقامی لڑکے ان دونوں کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں مگر سکندر ان سے مقابلہ کرکے انہیں مار بھگاتا ہے۔ لیزا آہستہ آہستہ اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ سکندر روم سے ہمیشہ کے لیے چلا آتا ہے۔ آخری بار وہ لیزا کے گھر دعوت میں جاتا ہے۔ لیزا اس کے چلے جانے سے بہت غمگین ہوجاتی ہے۔ نینی کو اندازہ ہوجاتا ہے کہ پاکستانی مردوں سے نفرت کرنے کے باوجود لیزا سکندر سے محبت کرنے لگی ہے۔ لیزا سیم کو فون کرکے اپنی ناکام محبت کے بارے میں بتا دیتی ہے۔

ام مریم 'زین سے منگنی ختم کرکے واپس چلی جاتی ہے۔ سکندر دوسرے دن دوبارہ گھر آتا ہے مگر شہریار خان اسے دھکے دے کر نکال دیتے ہیں امو جان رو رو کر التجا کرتی ہیں کہ سکندر کو معاف کردیں 'وہ بہت چھوٹا ہے مگر شہریار خان ان کی ایک نہیں سنتے اور سکندر کو اپنی تمام جائیداد سے عاق کرکے 'ہر رشتہ توڑ کر اسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ زین غصے سے کھڑا دیکھتا رہتا ہے۔
سکندر روم چلا جاتا ہے لیزا کو ہر بات پر یاد کرتا ہے۔
سیم یعنی ام مریم اور لیزا یعنی کلثوم 'محمود خالد کی بیٹیاں ہیں۔ ام مریم بچپن سے ہی بہت ضدی اور بدتمیز تھی۔ اپنے شوہر ہاشم سے بھی اس کا رویہ بہت خراب ہے ہاشم اسے منانے کے ہر وقت جتن کرتا رہتا ہے۔ سکندر کو روم میں ایک لڑکی پر لیزا کا گمان گزرتا ہے مگر وہ لیزا نہیں ہوتی۔ اسے خود پر حیرت ہونے لگتی ہے۔

سکندر روم آنے کے بعد غیر ارادی طور پر لیزا جیسے معمولات اختیار کرنے لگتا ہے۔ فلورنس میں لیزا کی نمائش پر پہنچتا ہے تو لیزا بہت حیران رہ جاتی ہے۔ بہت خوش ہوکر وہ اپنی ایگزیبیشن کا پہلا دن گزارتی ہے۔ شام کو وہ سکندر سے اپنی محبت کا اظہار کردیتی ہے تو سکندر بہت مجبور ہوکر اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتاتا ہے کہ اس کا مردانہ وقار مغلوب ہوچکا ہے۔ وہ ندامت محسوس کرتا ہے اور ہوٹل چلا جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنا ماضی یاد کرتا ہے کہ کس طرح اس کے بھائی کی منگیتر ام مریم نے ایک لڑکی ہوتے ہوئے اسے رجھانے کی کوشش کی اور جب وہ اس کی باتوں میں نہ آیا تو انتہائی گھٹیا الزام لگا کر اسے اپنے گھر والوں کی نظروں میں ذلیل کردیا۔

آٹھویں قسط

شہریار خان کو تلاش کرتا وہ اسٹڈی میں آگیا تھا۔ وہ وہاں موجود تھے مگر تنہا نہیں تھے۔ ان کے تین چار خاص 'ہم رتبہ دوست بیٹھے تھے۔ ان کے دوستوں سے سلام دعا کرکے وہ واپس پلٹ آیا تھا۔ وہ اب ان کے دوستوں کی واپسی کا انتظار کررہا تھا۔

امو جان چونکہ زین اور ام مریم کے ساتھ لونگ روم میں تھیں اس لیے امو جان کے پاس جانے کی تو وہ کوشش ہی نہیں کررہا تھا۔ وہ اس گھٹیا لڑکی کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ پڑھائی کا بہانہ بنا کر وہ اپنے کمرے میں بند پڑا تھا۔

امو جان زین اور مریم کے ساتھ مستقل کیوں تھیں۔ یہ جاننے کی اس نے کوشش نہیں کی تھی۔ جب فیصلے کے تمام اختیار شہریار خان کے پاس تھے تو پھر یہ بات انہیں سے کی جانی چاہیے تھی۔ ان کے دوست سارا دن ان کے ساتھ گزار کر شام میں اس وقت گئے تھے 'جب ان کے اپنے جرمن دوست کے ہاں پارٹی میں جانے کا وقت ہونے لگا تھا۔ وہ ان کے دوستوں کے چلے جانے کا سن کر فوراً" کمرے سے نکلا تھا۔ شہریار خان اپنے کمرے میں جارہے تھے۔ سکندر نے انہیں پیچھے سے آواز دی تھی۔
"بابا!" شہریار خان نے مڑ کر اسے دیکھا تھا۔
"مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔"
"میں واپس آجاؤں پھر رات میں بات کرلینا۔ یہ لوگ اتنی دیر سے اٹھے ہیں۔ میں پارٹی میں جانے کے لیے لیٹ ہوگیا ہوں۔"
کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے اور اس کی مزید کوئی بات سنے بغیر شہریار خان اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔

وہ مایوسی سے اپنے کمرے میں واپس آگیا تھا۔ اتنا تو اسے یقین تھا کہ وہ اس کی بات سنے بغیر سوئیں گے نہیں۔
اسے پتا نہیں تھا کہ یہ چند گھنٹوں کا انتظار کبھی نہ ختم ہونے والے انتظار میں تبدیل ہوجائے گا۔ اس کی بات اب مرتے دم تک نہیں سنی جائے گی۔ وہ آج کی پارٹی میں جانے کے لیے کل شام ہی منع کرچکا تھا۔ کل شام تک ام مریم کا اصلی اور گھناؤنا روپ اس کے سامنے نہیں آیا تھا۔
اس کے علم میں یہی تھا کہ گھر کے تمام افراد پارٹی میں جاچکے ہیں اور وہ گھر پر اکیلا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ بیماری کا ڈھونگ رچا کر وہ بدکردار لڑکی بھی گھر پر رکی ہوئی تھی۔ نئے سال کا جشن منانے کے لیے شہریار خان نے آج شام سے لے کر کل صبح تک کے لیے گھر کے تمام ملازمین کو بھی چھٹی دے رکھی تھی۔ اپنے حساب سے وہ گھر پر تنہا تھا۔ تب ہی جب اسے لونگ روم میں کچھ گرنے کی آواز آئی تو وہ بری طرح چونکا۔ وہ فوراً" اپنے کمرے سے نکل کر نیچے آیا تھا۔
"تم؟" وہ ام مریم کو لونگ روم میں کھڑے دیکھ کر حیران بھی ہوا تھا اور اس کے چہرے پر نفرت بھی ابھر آئی تھی۔ کل رات کی اس کی بے ہودہ حرکت کے بعد اب وہ اس لڑکی کے لیے سوائے حقارت اور نفرت کے کچھ بھی محسوس نہیں کرسکتا تھا۔
ام مریم پرسکون اور مطمئن کھڑی تھی۔ سینٹر ٹیبل کے پاس کرسٹل کا گلدان ٹوٹا ہوا پڑا تھا۔ وہ فوری طور پر یہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ یہ گلدان اسے متوجہ کرنے اور یہاں بلانے کے لیے ہی اٹھا کر زور سے پھینکا اور توڑا گیا تھا۔

وہاں چند اور بھی آرائشی اشیا فرش پر گری اور ٹوٹی پڑی تھیں۔ وہ ذرا سا بھی اس لڑکی کی نیت اور اس کے ارادوں کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ یہ اس کی غلطی تھی۔
وہ وہاں ٹوٹی پڑی ان اشیا پر نہ تو دھیان دے سکا تھا اور نہ ہی ان کے گرائے جانے کی وجوہات سوچ پایا تھا کیونکہ مر مٹنے والی نظروں سے اسے دیکھتی ام مریم اس کے بالکل سامنے آکر کھڑی ہوگئی تھی۔
"ہاں میں۔" وہ مخمور نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے قمیص کا گریبان بڑی سہولت سے کھولا تھا۔ گردن سے بہت نیچے تک۔ پھر جینز کی جیب سے اس نے ایک بلیڈ نکالا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی ادا سے اپنے

ٹاپ پر کئی جگہ سے کٹ لگا رہی تھی 'وہ مسلسل اسے دیکھ رہی تھی خود سپردگی والے انداز میں بہک جانے پر آمادہ کرنے والے انداز میں۔
"کیا مجھے دیکھ کر تمہیں کچھ بھی نہیں ہوتا سکندر!" وہ نشیلے لہجے میں بولتی اس کے بالکل نزدیک آگئی تھی۔
وہ اسے گناہ کی ترغیب دے رہی ہے۔ وہ سوچ سکا تھا تو بس اتنا ہی۔ وہ اس کے ارادوں کی بھنک بھی نہ پاسکا تھا۔

جن نظروں کو وہ مخمور، نشیلی اور دعوتِ گناہ دیتی نظریں سمجھ رہا تھا ان میں چھپی انتقام کی آگ وہ پہچان ہی نہ سکا تھا۔ گھر کلاس روم، لائبریری اور کتابوں سے نکل کر دنیا کو ابھی اس نے ٹھیک سے سمجھا نہیں تھا۔ وہ سادہ معصوم اور بے وقوف و ناداں زیادہ تھا یا وہ ناگن صفت لڑکی چالاک، مکار اور شاطر زیادہ تھی، جو اس کے گھر کے لونگ روم میں اپنی مرضی کا ماحول اور صورت حال پیدا کر رہی تھی۔

"جو تھوڑا بہت لباس تمہارے جسم پر باقی بچا ہے تم اسے بھی اتار کر پھینک دو۔ میں تب بھی تمہارے اوپر تھوکنا تک پسند نہیں کروں گا۔"

وہ نفرت اور حقارت سے اسے جواب دیتا وہاں سے واپس پلٹ جانا چاہتا تھا کہ ام مریم نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھینچ کر روک لیا۔

"اتنا غرور کس بات پر ہے تمہیں سکندر شہریار!"

یوں پوری طاقت سے گریبان کھینچے جانے سے اس کی قمیص کے کئی بٹن ٹوٹ گئے تھے۔ اس کی قمیص کا گریبان پھٹ گیا تھا۔ وہ دھتکار کر اسے پیچھے ہٹانا چاہتا تھا کہ ام مریم نے زور سے اس کے منہ پر ایک تھپڑ مارا۔

وہ نوجوان لڑکا تھا، اس لڑکی کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقت ور۔ غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے اس نے جواب میں بھرپور طاقت کے ساتھ ام مریم کو دو تھپڑ مارے تھے۔ اس کی انگلیوں کے نشان اس کے چہرے پر ثبت ہو گئے تھے۔ وہ فرش پر گری مگر گرتے گرتے بھی اس نے سکندر کی آستین پوری قوت سے پکڑ کر کھینچ لی۔ وہ اس حرکت کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھا، اس لیے بے ڈھب طریقے سے ام مریم کے ساتھ وہ بھی فرش پر گر پڑا۔ اس بے ڈھنگ طریقے سے گرنے سے دونوں کو چوٹیں آئیں۔ مگر وہ عجیب زہریلے انداز میں مسکرانے لگی۔

"کیا ابھی بھی مجھے اپنے پاس دیکھ کر تمہیں کچھ نہیں ہو رہا سکندر!" اس کے کارپٹ سے اٹھنے سے قبل وہ اس کے اوپر تھی۔ سکندر نے اسے بالوں سے پکڑ کر اپنے اوپر سے ہٹانا چاہا تھا۔ وہ اس ناگہانی صورت حال میں گاڑی کی آواز بھی نہیں سن سکا مگر گاڑی سے تحائف جس نے جان بوجھ کر گھر والوں کو واپس بلانے کے لیے نکالے تھے اور جو گھر والوں کی واپسی کی منتظر تھی اسے گاڑی کی آواز کیوں نہ آتی۔

وہ یکدم ہی مسکرائی تھی۔ اس نے مریم کے چہرے پر ایک چمک آتی دیکھی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑے مخمور انداز میں جھکی مگر ایک دم اس نے سکندر کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ اسے اشتعال دلانا چاہتی تھی اور وہ فوراً ہی اشتعال میں آ گیا۔ اس نے بہت غصے سے مریم کو بال پکڑ کر دھکا دے کر ہٹایا تھا۔ ہٹتے ہٹتے بھی مریم نے پیر مار کر کارپٹ پر رکھا بڑا سا گلدان گرا دیا تھا جس کے گرنے سے بہت شور پیدا ہوا تھا۔ مریم نے اپنے ناخن اس کی گردن میں پیوست کر رکھے تھے۔ اپنے ایک ہاتھ سے وہ مریم کے ہاتھ اپنی گردن پر ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے اس کے بال پکڑ کر کھینچے تھے تاکہ وہ اس کی گردن پر سے اپنے ہاتھ ہٹا دے۔ ام مریم زہریلے انداز میں مسکرا رہی تھی۔

اور پھر یکدم ہی اس نے "بچاؤ، بچاؤ" کی آوازیں نکالنی شروع کر دی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے تو حواس باختہ سا ہو کر اسے سمجھ ہی نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔

اور جب تک وہ سمجھ سکا تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ زین، شہریار خان اور امو جان اندر آ چکے تھے۔ اپنے رد کیے جانے، ٹھکرائے جانے کا بدلہ وہ اسے اس کے گھر والوں کی نظروں سے گرا کر لینا چاہتی تھی۔ اس بے غیرت لڑکی کی اپنی تو کوئی عزت تھی ہی نہیں، چنانچہ خود کو اس پستی میں اتار لینا اس کے لیے ذرا بھی دشوار نہ ہوا تھا۔

مریم روتے ہوئے زین کے گلے لگی اور اس پر اپنی عزت پر ہاتھ ڈالنے کا الزام لگا دیا، تب غصے سے پاگل سا

ہوتا وہ اس کی طرف بڑھا تھا۔ وہ ام مریم کو قتل کر دینا چاہتا تھا۔ زین اسے شدید غصے اور نفرت سے دیکھ رہا تھا۔ زین کو غصے میں آتا دیکھ کر ام مریم پر اپنے شدید ترین اشتعال کو کنٹرول کرتے ہوئے اس نے زین کو سچائی بتانے کی کوشش کی۔

زین غصے اور جنون میں مبتلا اسے نجانے کیا کیا بول رہا تھا۔ گالیاں دے رہا تھا۔ غصے میں آپے سے باہر ہوتا وہ اسے جان سے مار ڈالنے کے درپے تھا۔ زین اس کی ایک بھی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ اس کا چھوٹا بھائی اس پر ہاتھ اٹھا رہا تھا۔ وہ جواب میں اسے وضاحتیں دیتا خود کو صرف اس کے حملوں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ زین سے کہیں زیادہ مضبوط جسامت اور طاقت کا مالک تھا۔ چاہتا تو چند منٹوں میں زین کو زیر کر سکتا تھا۔ مگر وہ چھوٹے بھائی کو چوٹ کیسے پہنچا سکتا تھا۔

ام مریم دھاڑیں مار مار کر روتی اس پر اپنی عزت برباد کرنے کا الزام لگا رہی تھی۔ اس کے کردار اور اس کی عزت پر داغ لگا رہی تھی۔

"زین! یہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہے۔ یہ بہت مکار، بہت خطرناک لڑکی ہے۔ طوائفوں کا بھی شاید کوئی کردار ہوتا ہو گا۔ یہ تو ان سے بھی زیادہ بدکردار ہے۔"

وہ زین کے خود پر اٹھتے مکوں اور گھونسوں سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا ہوا مسلسل اسے سچائی بتانا چاہ رہا تھا۔ مگر زین پر ایک جنون سوار تھا۔ وہ اسے اپنے ہی گھر کی عزت پر غلیظ نظریں رکھنے والا بدکردار شخص سمجھ رہا تھا۔ زین کی نفرتوں سے ہار مان کر اب وہ اپنے باپ اور ماں سے مدد کا طالب تھا۔

زین نفرت میں اندھا ہو گیا ہے۔ وہ دونوں تو اسے جانتے ہیں۔ اس کا بچپن، اس کی نوعمری اور اس کی نوجوانی سب ان کے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہے۔ وہ دونوں جانتے ہیں ان کا بیٹا ایسا نہیں۔ اس کے پاپا جتنے بھی سخت مزاج ہیں پر اس پر بہت فخر کرتے ہیں، اس نے ہمیشہ ان کا مان رکھا ہے، ان کی امیدوں پر پورا اترا ہے

اور اس کی امو جان، انہیں تو اس سے کس قدر محبت ہے۔ جان نچھاور کرتی ہیں وہ اس پر۔

اس نے امید سے ماں کی طرف دیکھا۔ زار و قطار روتی ہوئی اس ناگن کو سینے سے لگائے وہ بالکل خاموش تھیں۔ اس کی حمایت میں، زین کو اس پر ہاتھ اٹھانے سے روکنے کے لیے ان کے لبوں سے ایک لفظ نہیں نکلا تھا۔

"میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔ میں مان ہی نہیں سکتی کہ میرا سکندر ایسا کر سکتا ہے۔" وہ منتظر نظروں سے انہیں دیکھتا رہا مگر اس کی امو جان کے لب باہم پیوست رہے۔

"زین! بس کرو۔" اپنے پاپا کے لبوں سے یہ لفظ سنتے ہی وہ خوشی سے سرشار سا ہو گیا تھا۔ اس کے پاپا کو اس پر یقین ہے۔ وہ اس کا اعتبار کر رہے ہیں۔

مگر اس کی یہ خوشی پل بھر میں ہی باپ کے تھپڑ نے مٹا کر رکھ دی تھی۔ ان کے مارے گئے تھپڑ نے اس کے اندر ابلتے جوش، جنون اور غصے کو ایک پل میں سرد کر دیا تھا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے ساکت اور بے جان سا کھڑا باپ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ رشتوں کی دھجیاں بکھیرنے والا تھا، وہ بھائی کی منگیتر پر غلیظ نظریں رکھنے والا تھا، وہ نفس کا غلام تھا، وہ گھر کی عزت تباہ کرنے والا تھا۔ وہ بالکل سُن سا کھڑا تھا۔

ام مریم مسلسل واویلا کر کر کے رو رہی تھی۔ اسے مکاری سے روتا دیکھ کر اس پر پھر جوش، جنون اور اشتعال سوار ہوا تھا۔ اس نے باپ کو بتانے کی کوشش کی تھی۔

"آنٹی! میں آپ کے گھر پر جس دن سے سکندر سے ملی ہوں، یہ اسی دن سے مجھ سے کہہ رہا ہے میں زین سے منگنی توڑ دوں۔ اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ یہ مجھے زین کے تو کیا، کسی کے بھی قابل نہیں چھوڑے گا۔"

طوائفوں کی خصلت رکھتی بظاہر وہ شریف لڑکی بتاتے ہوئے بولی تو وہ غصے سے پاگل سا ہو گیا۔ شدید

ترین اشتعال میں اسے گالی دیتا وہ حقیقتاً" اسے قتل کر ڈالنے کے ارادے سے اس کی طرف بڑھا تھا۔

"اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے اور کتنا نیچے گرو گے سکندر!" اس کے اور ام مریم کے درمیان اس کے پاپا آکر کھڑے ہوگئے تھے۔

"پاپا! میں آپ کا بیٹا ہوں۔ آپ اس مکار لڑکی کا یقین کریں گے اور میرا نہیں؟ آپ کو پتا ہے میں نے آج تک ایسا کوئی کام نہیں کیا ہے' جس سے آپ کا سر جھکے۔ پاپا! یہ لڑکی آج سے نہیں' جس دن سے میں گھر آیا ہوں' میرے پیچھے پڑی ہے۔ یہ کل رات بھی میرے کمرے میں' جس حلیے میں آئی تھی۔ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں آج صبح سے آپ کو ہی بتانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے اسے ٹھکرا دیا تھا اس لیے یہ مجھ سے بدلہ لے رہی ہے۔ یہ مجھے آپ لوگوں کی نظروں سے گرانا چاہتی ہے پاپا!"

اب وہ غصے اور اشتعال میں نہیں' بے بسی اور خوف کے ساتھ اپنی صفائی پیش کرنے والے انداز میں بول رہا تھا۔ اس کا دل اندر ہی اندر ڈوب رہا تھا۔ کوئی اس کی بات سن رہا تھا' نہ یقین کر رہا تھا۔

"اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے اس معصوم لڑکی پر الزام لگا رہے ہو۔ ذرا حالت دیکھو اپنی بھی اور اس کی بھی۔ میرا سر ندامت سے جھکا دیا ہے سکندر تم نے۔"

باپ کی بات سن کر اس نے نفرت سے ام مریم کی طرف دیکھا تھا' جو ہنوز اموجان کے گلے لگی رونے کا ڈراما کر رہی تھی۔ اسے بے شک جیل ہو جائے' پھانسی کی سزا مل جائے مگر وہ اس لڑکی کو قتل کر ڈالے گا۔

"پاپا! اس کی جس حالت کی طرف آپ اشارہ کر رہے ہیں' یہ میں نے نہیں' اس نے خود کی ہے۔ اس لڑکی کے چیچ پن کی حد آپ سوچ بھی نہیں سکتے پاپا!"

باپ کی آنکھوں میں غصہ' ماں کی آنکھوں میں بے اعتباری اور بھائی کی آنکھوں میں نفرت دیکھ کر وہ چلاتے چلاتے ایک دم چپ ہو گیا تھا۔ اس کا گلا رندھنے لگا تھا۔ اسے اپنی بے بسی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔

"مت کہو مجھے پاپا۔ تم آج سے یہ حق ہمیشہ کے لیے کھو چکے ہو۔"

"پاپا آپ جس کی کہیں' میں قسم کھانے کے لیے تیار ہوں کہ میں بے گناہ ہوں۔ یہ لڑکی جھوٹی ہے۔ یہ ہمارے گھر کی خوشیوں کو آگ لگا دینا چاہتی ہے۔"

اس بار وہ رو پڑا تھا۔ مگر اس کے آنسو' اس کی فریاد' اس کی بے بسی' اس کی سچائی۔ نہ اس کے باپ پر اثر کر رہی تھی نہ بھائی پر۔ اس کے پاپا اسے گھر سے نکل جانے کا حکم سنا رہے تھے۔ وہ باپ کا انتہا پر جاتا ظالمانہ حکم سن کر ساکت کھڑا رہ گیا تھا۔ اس کی بات سنے بغیر اسے تختہ دار پر لٹکایا جا رہا تھا۔

اس نے بے اختیار مدد کے لیے ماں کو پکارا تھا۔ اس کی اپنی ماں سے نگاہیں ملیں تو اسے یہ کرب ناک سچائی پتا چلی کہ وہ بھی اسے گناہ گار سمجھ رہی ہیں' مگر ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ بیٹے کی حمایت میں بولی تھیں۔ انہوں نے روتے ہوئے شہریار خان سے سکندر کے لیے رحم کی درخواست کی تھی۔ شہریار خان' اموجان کے اس کی حمایت پر مزید غصے میں آگئے تھے۔

انہوں نے اس کی اموجان کو اپنے بیٹوں اور اس پرائی لڑکی کے سامنے طلاق کی دھمکی دی تھی' انہوں نے اس کے لیے زانی کے الفاظ استعمال کیے۔ وہ اس پر نہیں' مگر ماں کی تذلیل پر رو پڑا تھا۔ اس بے حیا' بے غیرت لڑکی کے سامنے اس کے باپ نے اس کی ماں کو بے عزت کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ بغیر کسی مزاحمت کے شہریار خان کے ساتھ کھنچتا لونگ روم سے باہر جانے لگا۔ ماں کی بند آنکھوں سے گرتے آنسو دیکھتا بھائی کی نفرت دیکھتا۔

شہریار خان اسے پورچ میں گھسیٹ کر گیٹ تک لے آئے تھے۔ وہاں آکر انہوں نے اس کا ہاتھ چھوڑا تھا۔ ان کی آنکھیں غصے اور جنون سے بھری ہوئی

تھیں۔ ان کے چہرے پر سختی اور فیصلہ کر لینے کے بعد والی اٹل کیفیت تھی۔ وہ گیٹ کھول کر کھڑے تھے۔

"تم میرے گھر سے جا سکتے ہو۔ میرے گھر اور میری زندگی میں تم جیسے ریپسٹ اور عیاش شخص کی کوئی جگہ نہیں ہے۔" کیا زین کی طرح پاپا بھی اس سے نفرت کرنے لگے؟ وہ ایک دم ہی رو پڑا تھا۔

"پاپا! میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ پاپا! میرا یقین کریں۔" وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر روتا باپ کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم جا رہے ہو یا میں تمہیں دھکے مار کر باہر نکالوں؟ جوانی کا جنون بہت سر چڑھ کر بول رہا ہے تو جاؤ' نکلو باہر۔ کرو عیاشیاں' مگر اپنے خرچے پر' خود پیسے کما کر۔ میرا پیسہ تم جیسے بدکردار کی عیاشیوں کے لیے نہیں ہے۔ وہ دوسرے باپ ہوتے ہوں گے جو غلط کاموں پر اپنے بیٹوں کی پشت پناہی کرتے ہوں گے۔ میں ان باپوں میں سے نہیں ہوں۔ میں آج کے بعد مرتے دم تک تمہاری شکل نہیں دیکھوں گا۔ رشتوں کی دھجیاں اڑا کر سمجھ رہے ہو' میں تمہیں معاف کر دوں گا؟ دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔ آج کے بعد سمجھوں گا میرا ایک ہی بیٹا ہے۔"

وہ سہمی سہمی نظروں سے باپ کو خود پر گرجتے اور نفرت کا اظہار کرتے دیکھ رہا تھا۔ ہاں وہ کمزور تھا' وہ گھر سے باہر نکالے جانے سے بری طرح ڈر گیا تھا۔ وہ اس بات سے زیادہ خوف زدہ ہو گیا تھا کہ وہ گھر سے نکالا جا رہا تھا۔ دنیا کی بھیڑ میں دھکیلا جا رہا ہے۔ شہریار خان نے اسے ہاتھ پکڑ کر گیٹ سے باہر نکالا۔ فوراً" گیٹ بند کر دیا تھا۔

وہ اسی پھٹی ہوئی قمیص میں تھا بغیر سوئٹر' جیکٹ اور کسی بھی گرم چیز کے باہر سخت ترین سردی میں۔ 31 دسمبر کی شام کی سخت ترین' جسم کو کاٹ ڈالنے والی ٹھنڈ میں باہر کھڑا وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ روتے ہوئے وہ گھر کے پاس بنے ایک پارک میں آکر بیٹھ گیا تھا۔ دنیا سال نو کے جشن میں مصروف تھی اور وہ پارک میں تنہا تھا۔

وہ بری طرح رو رہا تھا۔ باپ کے ظلم پر' ماں کی بے بسی پر' بھائی کی نفرت پر' اپنی ذلت اور رسوائی پر۔ کیا عزت صرف عورت کی ہوتی ہے مرد کی نہیں؟ کیا اگر ایک لڑکا اور لڑکی تنہائی میں اس حال میں پائے جائیں کہ لڑکی بے لباس ہو تو یہ لازم ہے کہ اسے بے لباس لڑکے ہی نے کیا ہو گا؟ کیا لڑکی گناہ گار اور بدکردار نہیں ہو سکتی؟ وہ چار دن کی شناسا لڑکی اتنی قابل اعتبار لگی تھی اس کے والدین اور بھائی کو کہ اس کی زندگی کے صاف اور شفاف بیس سالوں کی ہر اچھائی پل بھر میں بھلا دی؟

کوئی ایک تو ہوتا جو یہ کہتا کہ سکندر نہیں' یہ لڑکی بھی تو جھوٹی ہو سکتی ہے۔

نئے سال کی پہلی صبح طلوع ہوئی تو اسے اندازہ نہیں تھا کہ صرف یہ چمکتی ہوئی صبح ہی نہیں بلکہ آئندہ زندگی کی کوئی بھی صبح کل شام کی سیاہیوں کو نہیں مٹا سکے گی۔

صبح سے دوپہر ہوئی۔ بھوک پیاس کا احساس نہیں تھا مگر ٹھنڈ ناقابل برداشت تھی۔ اسے اپنے پاپا سے بات کرنی چاہیے۔ کل شام وہ بہت غصے میں آگئے تھے' آج وہ اس کی بات ضرور سنیں گے۔

اس کے پاپا بہت ذہین آدمی ہیں۔ جب وہ دلیل کے ساتھ بات کرے گا تو وہ ماننے پر مجبور ہو جائیں گے کہ لونگ روم کا وہ سارا حشر اس بے حیا لڑکی نے کیا تھا۔ اس کا حلیہ' اس لڑکی کا حلیہ' لونگ روم میں ٹوٹی چیزیں اور پاپا کا عین اسی وقت گھر واپس آجانا' جب وہ ساری کڑیاں ملائیں گے تو ان جیسا ذہین شخص فوراً" سمجھ جائے گا کہ قصوروار سکندر نہیں' ام مریم ہے۔

وہ یکدم ہی گھر جانے کے لیے اٹھا اور سیدھا اندر جانا چاہتا تھا مگر اس کی خوش فہمیاں اسی لمحے کمزور پڑنے لگی تھیں جب ان کا ملازم اسے وہیں رکنے کی تاکید کرتا شہریار خان کو بلانے اندر چلا گیا تھا۔ وہ اپنے گھر کے دروازے پر ہی روک دیا گیا تھا۔ اندر داخلے کے

لیے اسے اجازت درکار تھی۔

"کیوں آئے ہو تم یہاں؟ کیا کل میری بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی تھی؟"

وہ بھوکا پیاسا ہے' اسے ٹھنڈ لگ رہی ہے اس کے باپ کو اس پر ذرا سا بھی رحم نہیں آیا تھا' اس کی تمام تر خوش فہمیاں اپنی موت آپ مرگئی تھیں۔ ان کے پیچھے زین بھی لونگ روم کے دروازے کے پاس کھڑا اسے نفرت سے دیکھ رہا تھا۔

"میرے دل اور میرے گھر میں اب تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں تمہیں عاق کرچکا ہوں۔ میرے اصول یہ کہتے ہیں کہ میں ایک ریپسٹ اور رشتوں کی دھجیاں بکھیرنے والے کو اپنے گھر میں جگہ نہ دوں۔ اگر تم واقعی میرا خون ہو' ذرا سی بھی غیرت تم میں باقی بچی ہے تو آج کے بعد مجھے اپنی منحوس شکل کبھی مت دکھانا۔"

اس نے پیچھے کھڑے زین کے چہرے پر پھیلا اطمینان دیکھا پھر حلق کے بل چلاتے اپنے باپ کو۔ وہ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں ہوش و حواس میں کہہ رہے ہیں' کل اکتیس دسمبر کو اسے گھر سے بے دخل کرنے کا ان کا اعلان کوئی جذباتی یا وقتی فیصلہ نہیں تھا۔ وہ ایک اٹل فیصلہ تھا۔ سرد نگاہوں سے اسے دیکھتے وہ اپنے ہر فیصلے پر قائم تھے۔

اسی پل اس کی امو جان باہر آئی تھیں۔ وہ رو رہی تھیں۔ انہوں نے روتے ہوئے اسے گلے لگالیا تھا۔ وہ اس کی حمایت کررہی تھیں' وہ اس کی طرف داری میں اس کے باپ سے لڑ رہی تھیں' وہ اس کی طرف سے اس کے باپ سے معافی مانگ رہی تھیں۔

"اس سے غلطی ہوگئی ہے شہریار! مگر یہ ابھی بچہ ہے۔ آپ اس پر سختی کریں' اسے ماریں پیٹیں' ہر آسائش اور سہولت اس سے واپس لے لیں مگر پلیز اسے یوں گھر سے نہ نکالیں۔"

اور اس کا دل چاہا تھا وہ دھاڑیں مار مار کر روپڑے۔ ماں سمیت ساری کائنات میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو اسے بے گناہ سمجھتا ہو

لیے جملوں نے اس کی عزت' اس کے وقار' اس کے پندار کو مزید ٹھیس پہنچائی تھی۔ ماں اپنے گناہ گار بیٹے کے لیے رحم اور معافی کی درخواست کررہی تھی۔ وہ ٹکر ٹکر ماں کو اپنی حمایت میں باپ سے بولتے اور باپ کو جواباً" آگ بگولہ ہوتے دیکھ رہا تھا۔ امو جان زیادہ زور سے روتے ہوئے چیخ کر بولیں۔

"آپ کسی اور کے گناہوں کی سزا میرے بیٹے کو کیوں دے رہے ہیں؟ اپنے باپ کے گناہوں کی سزا میرے بیٹے کو مت دیں شہریار! جو آپ کے باپ نے کیا۔"

اس کے باپ نے آگے بڑھ گالی دیتے ہوئے اس کی امو جان کو تھپڑ مارا تھا۔ وہ بالکل سن سا رہ گیا تھا۔ کیا اس کے پاپا اس کی ماں پر ہاتھ اٹھا سکتے تھے؟

اس نے دیکھا وہ امو جان کو دوسرا تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھا رہے تھے' وہ اس بار یہ ہرگز ہرگز برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ فوراً" آگے آگیا تھا۔ ماں کی طرف اٹھا وہ طمانچہ اس نے اپنے گال پر کھالیا تھا۔ ماں کی یہ تذلیل اس لیے کی جارہی تھی کہ وہ اس کی حمایت میں بولی تھیں۔ اگر اس کی موجودگی ماں کی ذلت کا باعث بن رہی ہے تو وہ خود کو ابھی اور اسی وقت یہاں سے کہیں دور لے جائے گا۔ اس کی ماں ان دونوں بھائیوں کے سامنے شوہر کے ہاتھوں ہوئی اس تذلیل پر گنگ کھڑی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں کرب اور اذیت سے آنسو آگئے تھے۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"امو جان کو کچھ مت کہیں پاپا! پلیز میری ماں پر ہاتھ مت اٹھائیں۔ میں جارہا ہوں یہاں سے۔"

وہ فوراً" ہی وہاں سے پلٹ گیا تھا۔ اگر اس کا چلے جانا تمام مسائل کا حل ہے تو ٹھیک ہے وہ چلا جاتا ہے۔ اس کا باپ اس کی ماں پر ہاتھ اٹھائے' انہیں گالیاں دے یہ وہ ہرگز نہیں سہہ سکتا۔ وہ زین کی طرح نہیں کہ دبک کر کھڑا چپ چاپ تماشا دیکھتا رہے۔ ماں کو بے عزت ہوتا دیکھتا رہے۔ اگر اس کے چلے جانے سے ہی اس کے باپ کو سکون مل رہا ہے تو نکل جاتا ہے وہ ان لوگوں

وہ وقت دور نہیں جب اس کے پاپا کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوگا۔ انہیں اس کی سچائی کا یقین آئے گا' وہ بہت شرمندہ ہوں گے' وہ اسے گھر واپس لانا چاہیں گے تب وہ گھر واپس نہیں آئے گا۔ وہ سکندر شہریار ہے۔ ہارورڈ میں زیر تعلیم۔ اپنے ڈپارٹمنٹ کے چند بہت ہی قابل طالب علموں میں شامل۔ وہ اپنی زندگی آپ سنوارے گا' وہ اپنی دنیا آپ بنائے گا بغیر شہریار خان کی مدد کے۔ وہ اب اگر اسے بلائیں گے بھی وہ تب بھی پلٹ کر ان کے پاس نہیں جائے گا۔ اس کے اندر جوش مارتا نوجوان خون باغی ہورہا تھا۔ وہ مساچوسٹس واپس چلا جائے گا۔ بوسٹن اور کیمبرج میں اس کے بہت سارے جاننے والے رہتے ہیں۔ فوری طور پر وہ اپنے کسی بھی جاننے والے' اپنے کسی بھی دوست کے ساتھ اس کا فلیٹ شیئر کرلے گا۔ جانے کے ساتھ ہی وہ کیمپس جاکر ڈین کے آفس میں ان سے بھی مل لے گا۔ وہ اپنی آگے کی تعلیم کے لیے اسکالر شپ کے لیے اپلائی کرے گا۔

وہ اپنے اساتذہ کا چہیتا اتنا لائق اسٹوڈنٹ ہے' کیوں نہیں اس کی یونیورسٹی اسے اسکالر شپ دے گی؟ وہ خیالوں ہی خیالوں میں خود کو ہارورڈ سے اپنی انڈر گریجویٹ ڈگری پوری کرتے دیکھ چکا تھا' ہارورڈ لاء اسکول سے خود کو ڈگری پاتا دیکھ چکا تھا' باپ کو خود کو منا کر گھر واپس بلاتا دیکھ چکا تھا' جب بھوک اور پیاس کے شدید احساس سے وہ سڑک کے کنارے چکر کھا کر گر گیا۔ چند لمحے اس کی آنکھوں کے آگے بالکل اندھیرا سا چھایا رہا تھا۔ اسے بغیر کچھ کھائے پیے دو دن ہوگئے تھے۔ وہ بھوک اور پیاس سے بالکل نڈھال تھا۔ اپنے ان پھٹے کپڑوں میں اسے سخت سردی لگ رہی تھی۔ اسے محسوس ہورہا تھا کہ اسے ٹھنڈ سے بخار چڑھ گیا ہے۔ اپنی زندگی کے بیس سال اس نے باپ کے گھر پر اتنے محفوظ گزارے تھے کہ اب سڑک پر لاکر پھینکا گیا تو اسے بھوک' پیاس اور ٹھنڈ سب کچھ برداشت کرنا اپنی ہمت اور برداشت سے بہت زیادہ لگا۔

وہ بوسٹن واپس جانے کی بات سوچ رہا تھا۔ اس کے پاس ایک وقت کا کھانا کھانے تک کے پیسے نہیں' حتیٰ کہ بوسٹن میں اپنے کسی دوست کو فون کرسکے' اتنے پیسے بھی نہیں ہیں۔ وہ وہاں کیسے جائے گا؟ اور ان پھٹے کپڑوں میں بھکاریوں کی طرح؟ جان پہچان کے لوگوں کے پاس جانے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ وہ صرف اس کے نہیں' وہ شہریار خان' امو جان اور زین سب کے' ان کی ساری فیملی کے جاننے والے تھے۔ اصل بات کیا ہے یہ تو وہ اپنے قریبی دوستوں تک کو نہیں بتائے گا۔ اگر مجبوراً" بوسٹن جاکر کچھ بتانا ہی پڑا تو اتنا کہہ دے گا کہ وہ اپنے باپ کا گھر چھوڑ آیا ہے۔ اس کا ان کے ساتھ کچھ اختلاف ہوگیا ہے۔

واشنگٹن میں کسی بھی جان پہچان والے کے پاس جاکر نہ وہ خود شرمندہ ہونا چاہتا تھا نہ اپنے پاپا کو کروانا چاہتا تھا۔

تمام دن چلتے چلتے وہ اس وقت شہر کے اس علاقے میں آگیا تھا جہاں کم آمدنی والے اور زیادہ تر سیاہ فام لوگ رہا کرتے تھے۔ کیسے لطف کی بات تھی' دنیا بھر میں طاقت کا مرکز سمجھے جانے والے اس شہر میں ایسی جگہیں بھی تھیں' جہاں غریب بھی تھے' بے روزگار بھی تھے' بے گھر بھی تھے۔ وہ سڑک کے کنارے جہاں بیٹھا تھا وہاں سامنے ہی ایک چرچ تھا۔ وہ وہاں ہر عمر کے افراد جاتا دیکھ رہا تھا جو اپنے حلیوں سے ضرورت مند لگ رہے تھے۔ عورتیں اپنے بچوں کو ساتھ لیے' بوڑھے مرد' عورتیں' جوان' نوجوان۔ اسے سمجھ آگیا تھا یہاں کیا ہورہا ہے۔ وہ چرچ کی بلڈنگ اور اندر جاتے لوگوں کو مکمل طور پر نظر انداز کردینا چاہتا تھا۔ مگر اسے پتا نہیں تھا بھوک ایسی ظالم چیز ہوتی ہے' انسان سے وہ سب کچھ بھی کروا جاتی ہے جو وہ عام حالات میں کرنے کا تصور تک نہیں کرسکتا۔ کیا حرج ہے اگر وہ بھی۔ اگر وہ بھی اندر چلا جائے۔ اب اس سے اور بھوکا نہیں رہا جارہا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے خود کو اٹھنے اور چرچ میں جانے پر مجبور پایا۔

وہ خود سے بھی نظریں چراتا چرچ کے اس ڈائننگ

ہال میں آگیا تھا' جہاں ہر اتوار باقاعدگی سے بھوک اور افلاس کے شکار لوگوں کو دوپہر اور رات کا کھانا کھلایا جاتا تھا۔ خدمت خلق کے طور پر ' انسانی ہمدردی کی بنیادوں پر۔ وہاں میزیں لگی ہوئی تھیں' ان کے اطراف کرسیاں موجود تھیں۔ بہت سے لوگ ان کرسیوں پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ وہ بھوک سے نڈھال تھا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ وہاں بہت سے رضاکار کام کر رہے تھے' چرچ کے ساتھ اس کار خیر میں بطور رضاکار شریک ایک شخص اس کے پاس آیا اور مسکرا کر اس کا کھانا اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ سوپ' سینڈوچ اور کافی۔

خیرات کا کھانا دیکھ کر اسے رونا آگیا تھا۔ بہت ذلت اور بے عزتی محسوس کرتا وہ کھانے کے نوالے لے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اسے اپنا گھر' اپنے ماں' باپ' اپنی زندگی سب کچھ یاد آرہا تھا۔ ہارورڈ کا گریجویٹ بنتے بنتے وہ یہ کہاں آگیا تھا؟ نہیں۔ اسے خود کو مضبوط کرنا ہوگا۔ وہ ہمت نہیں ہارے گا۔ اسے فوری طور پر بوسٹن جانے کے لیے پیسے جمع کرنے ہی ہوں گے۔ ایک بار بوسٹن چلا گیا پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ وہاں اس کے بہت دوست ہیں اور پاپا سے ان لوگوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ اپنے دوستوں سے مدد لے گا۔

وہ ہارورڈ سے اپنی ڈگری پوری کرے گا۔ پھر وہ اس ناگن سے اپنا انتقام لے گا۔ وہ اسے چھوڑے گا نہیں۔ وہ اپنے کردار پر کالک ملنے والی' اسے اس کے والدین کی نظروں سے گرانے والی اس لڑکی کو جان سے مار ڈالے گا اور ایک نہ ایک دن آئے گا جب اس کے پاپا اس کی بے گناہی تسلیم کرلیں گے۔ وہ اسے منانے اس کے پاس بوسٹن آئیں گے۔ تب وہ ان کے ساتھ نہیں آئے گا۔ وہ انہیں بتا دے گا کہ وہ ان کے سہارے کے بغیر بھی خود کو سنبھال سکتا ہے۔

وہ جہاں بیٹھا تھا وہاں سے کچن نظر آرہا تھا۔ انسانی ہمدردی سے سرشار بہت رضاکار مرد اور عورتیں وہاں کام کرتے نظر آرہے تھے۔ اسے ایک رضاکار کی دوسرے رضاکار کے ساتھ ہونے والی باتیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کی میز کچن کی کھڑکی سے بہت نزدیک تھی۔ پیٹ میں غذا گئی تھی تو اب سب کچھ دکھائی بھی دے رہا تھا اور سنائی بھی۔ وہ دونوں رضاکار پیپر پلیٹس میں سینڈوچز تیار کرکے اپنے سامنے موجود میز پر رکھتے جارہے تھے۔ ان میں سے ایک سائٹ انجینئر تھا۔ کوئی بلڈنگ بن رہی تھی' وہ اس کے بارے میں بات کررہا تھا۔ قدرے فکر مند لہجے میں یہ بتا رہا تھا کہ کل تلخ کلامی اور لڑائی ہوجانے پر اس کا کوئی اہم ورکر کام چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ایک ہفتے بعد آرکیٹکٹ اور کلائنٹ نے آکر سائٹ وزٹ کرنی تھی اور وہ فکر مند تھا کہ اس اہم ورکر کے چلے جانے سے کام کی رفتار پر فرق پڑے گا۔ اسے ایک محنتی اور جان لگا کر کام کرنے والے ورکر کی فوری ضرورت تھی۔ سکندر فوراً" اٹھ کر اس رضاکار کے پاس گیا۔ اس نے اس سے کام مانگا اور یقین دلایا تھا کہ وہ محنت کرے گا' سائٹ انجینئر سے اس کا پڑھا لکھا ہونا اور اچھے خاندان سے تعلق چھپا نہ رہ سکا تھا۔ اس نے اس سے یہی بات پوچھی بھی تھی۔

جھوٹ کی آمیزش کے ساتھ اس نے اسے یہ بتادیا تھا کہ وہ بوسٹن میں اپنی انڈر گریجویٹ اسٹڈیز کررہا ہے۔ کسی پریشانی کا شکار ہوجانے کے بعد اب اس کے پاس واپس بوسٹن جانے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ اسے پیسے درکار ہیں۔ سائٹ انجینئر اپنے اس ورکر کی جگہ اسے کام دینے پر راضی ہوگیا تھا۔ اس شرط پر کہ وہ اس پورے ہفتہ اس کے ساتھ کام کرے۔ جتنا معاوضہ طے پایا تھا اس میں وہ واپس جانے کے کرائے کے ساتھ ساتھ اپنے لیے ایک آدھ سستی سی پینٹ شرٹ بھی خرید سکتا تھا۔ کوشش کرکے کچھ پیسے بچا بھی سکتا تھا۔ اسے پیر سے لے کر ہفتے کی شام تک کنسٹرکشن سائٹ پر کام کرنا تھا۔ ہفتے کی شام اسے اس کا معاوضہ دے دیا جائے گا۔ یہ اس سے سائٹ انجینئر نے وعدہ کیا تھا۔

وہ رات بھی اس نے سڑکوں پر اور ایک پارک میں سوتے جاگتے گزاری تھی۔ اگلی صبح وہ شہر کے مضافات میں واقع اس کنسٹرکشن سائٹ پر آگیا تھا۔ وہاں ابھی آبادی کم تھی۔ یہ کم آبادی والا شہر کا مضافاتی علاقہ تھا۔ جو ہلٹی مور سے بہت قریب تھا۔ پڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے وہ سائٹ انجینئر کے کئی طرح سے کام آرہا تھا۔ کون سا کنسٹرکشن میٹریل کب آیا' کتنی مقدار میں آیا' کتنے کا خریدا گیا' وہ سائٹ انجینئر کو کمپیوٹر پر یہ سارا حساب کتاب' سارا کام بھی کرکے دے رہا تھا اور محنت مزدوری بھی کررہا تھا۔ جہاں کہیں کسی ورکر کی کمی ہوتی اسے بلا لیا جاتا۔ بے تحاشا وزن اٹھانے اور سخت مشقت کا کام کرنے سے اس کے ہاتھوں پر چھالے پڑ گئے تھے۔ مگر ایک دھن اور ایک جستجو سوار تھی اس کے اوپر۔ ابھی اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ وہ دن بھر میں صرف لنچ کرتا جو کہ تمام مزدوروں کو سائٹ پر مفت فراہم کیا جاتا تھا۔ اس کی پلاننگ یہ تھی کہ جانے کے کرائے کے علاوہ بھی اس کے پاس کچھ پیسے بچ جائیں۔

اس نے سائٹ انجینئر سے درخواست کی کہ اسے سائٹ پر ہی سونے کی اجازت دے دی جائے۔ سائٹ انجینئر اسے اجازت دینے میں متامل تھا۔ وہاں ورکرز کو اس بات کی اجازت نہیں تھی۔ مگر اس نے جب اپنی مجبوری بتا کر بہت زیادہ اصرار کیا تو وہ مان گیا تھا۔ ویسے بھی وہ کون سا وہاں مستقل ورکر تھا۔ صرف ایک ہفتہ ہی کی تو بات تھی۔

سائٹ انجینئر یوں بھی اس سے خوش تھا۔ وہ ایک اکیلا لڑکا کئی ورکرز کے حصے کا کام اسے کرکے دے رہا تھا۔ وہ صبح سے شام گئے تک کنسٹرکشن سائٹ پر جو جو کام اس کے سپرد کیے جاتے نپٹاتا جاتا تھا۔ کام شروع کرنے والا سب سے پہلا ورکر وہ ہوتا تھا اور کام ختم کرنے والا سب سے آخری ورکر بھی وہی ہوتا تھا۔ وہ دن گن گن کر ہفتے کے دن انتظار کررہا تھا جب اسے اس کی محنت کی کمائی ملنی تھی۔ سب کے چلے جانے کے بعد وہ رات میں بلڈنگ سائٹ میں ہی ایک طرف اونچی نیچی زمین پر لیٹ کر سو جاتا تھا۔

کنسٹرکشن سائٹ غیر آباد علاقہ میں تھی۔ وہاں دن میں بھی لوگوں کی زیادہ آمدورفت نہیں رہا کرتی تھی۔ ارد گرد کا علاقہ قدرے ویران ہی تھا۔ رات میں تو بالکل ہی سناٹا ہو جاتا تھا۔ اندھیرا' خاموشی اور ویرانی۔ مگر اس پر دن بھر کی بے تحاشا محنت مشقت کی تھکن ایسی طاری ہوتی تھی کہ نہ اسے سناٹے اور اندھیرے سے خوف آتا تھا اور نہ ہی اونچی نیچی زمین پر لیٹ کر تکلیف اور بے آرامی کا احساس ہوتا تھا۔

وہ ہفتے کا دن تھا جب سائٹ انجینئر شام ڈھلے کام ختم کرکے جانے سے قبل وعدے کے مطابق اسے اس کا طے کردہ معاوضہ دے کر گیا تھا۔ اس کے اضافی کام کرنے سے خوش ہو کر اس نے اسے کچھ پیسے الگ سے بھی دیے تھے۔ اپنی محنت کے پیسے اپنے ہاتھوں میں لیے' وہ کتنے دنوں بعد خوش ہوا تھا' مسکرایا تھا۔ اس وقت رات ہو چلی تھی۔ وہ کل صبح سب سے پہلے اپنے لیے نئی پینٹ شرٹ خریدے گا اور پھر بوسٹن جانے کے لیے ٹکٹ۔

وہ اپنے شہر واپس چلا جائے گا۔ کنسٹرکشن سائٹ کی اونچی نیچی زمین پر لیٹا وہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا۔ بس آج کی رات اور ہے۔ کل وہ اپنے دوستوں اور جاننے پہچاننے والوں کے بیچ اپنے شہر میں ہوگا۔ ویسے تو اسے پورا یقین تھا اسے اسکالرشپ مل جائے گی لیکن اگر اس سب میں کچھ وقت لگا یا تھوڑی مشکل ہوئی تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ یہ سمسٹر چھوڑ دے گا۔ اور اس دوران وہ چھوٹی چھوٹی جاب کرکے پیسے جمع کرلے گا۔

وہ لیٹا سوچ رہا تھا' اپنے ہاتھوں کے زخم دیکھ رہا تھا۔ اسے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ مگر وہ بھوک سے دھیان ہٹا رہا تھا۔ ایک ہفتے سے وہ ناشتے اور رات کے کھانے کو چھوڑ کر صرف دوپہر کا کھا رہا تھا۔ پر اب تو اس کے پاس پیسے ہیں۔ مین روڈ پر جو اسٹور ہے' وہ چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے۔ وہ وہاں سے جاکر اپنے لیے ایک سینڈوچ یا چند کوکیز تو خرید سکتا ہے۔ پیسے آگئے تھے اس لیے بھوک کا زیادہ احساس تھا۔ اسے لگا کہ خالی پیٹ نیند نہیں آئے گی تب وہ وہاں سے اٹھا۔ وہ سائٹ سے باہر نکلا ہی تھا جب اسے سڑک پر سامنے

سے چار سیاہ فام امریکی آتے نظر آئے۔ شراب کی بوتلیں ہاتھ میں لیے۔ نشے میں دھت۔ زور زور سے گاتے اور ایک دوسرے سے بے ہنگم ہنسی مذاق کرتے۔ ان میں سے ایک نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اور ہنس کر اپنے باقی ساتھیوں کو بھی متوجہ کیا۔ وہ انہیں نظر انداز کرکے وہاں سے گزر جانا چاہتا تھا مگر وہ چاروں اس کے سامنے کھڑے ہوگئے تھے' لمبے چوڑے' مضبوط جسامت والے۔

اپنی کمائی رقم کا ایک نوٹ اس کے ہاتھ میں تھا' باقی سارے پینٹ کی جیب میں۔ اس نے ان کی نظریں اپنے ہاتھ میں پکڑے نوٹ پر دیکھ لی تھیں۔ وہ اپنی اتنی محنت کی کمائی انہیں لوٹنے نہیں دے گا۔ اس نے وہاں سے اندھا دھند بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ چار تھے اور وہ اکیلا۔ وہ مضبوط جسامت والے سیاہ فام مرد تھے اور وہ بیس سال کا کمزور سا لڑکا جس کی دنیا گھر اور کیمپس تک محدود رہی تھی۔

ان چاروں نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔

وہ رو رو کر ان سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ بری طرح اسے مارتے ہوئے انہوں نے اس سے اس کے سارے پیسے چھین لیے تھے۔ وہ رو رو کر فریاد کر رہا تھا کہ یہ پیسے اس نے بڑی محنت' کڑی مشقت کے بعد کمائے ہیں۔ اسے ان پیسوں کی بہت ضرورت ہے۔ وہ اپنے پیسے چھن جانے پر زارو قطار رو رہا تھا۔ مگر ان سیاہ فاموں کا مقصد صرف اس کی رقم لوٹ لینے پر پورا نہیں ہوا تھا۔ ان میں سے ایک اس کی طرف بڑھا تھا۔ اس کے باقی ساتھی قہقہے لگا کر ہنس رہے تھے' شراب پی رہے تھے۔ وہ ان سے اتنی مار کھا چکا تھا کہ اب وہاں سے ایک قدم چلنے کی بھی اس میں سکت نہ تھی مگر ان کی آنکھوں میں شیطانی چمک دیکھ کر اس نے خوف سے چیخ مارتے ہوئے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔

اس کی طرف بڑھتے ایک سیاہ فام نے ایک زوردار مکا اس کے منہ پر مارا تھا۔ وہ اوندھے منہ سڑک پر گرا پھر اس نے اس کے بال مٹھی میں دبوچ کر اس کا سر زمین پر زور سے مارا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ اس کے سر سے خون بہنے لگا تھا۔

"پاپا! مجھے بچالیں۔ پاپا! مجھے بچالیں۔"

وہ چلا چلا کر باپ کو پکار رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر اپنا ہاتھ مضبوطی سے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے ہاتھوں کو قابو میں کرلیا تھا۔ اب اس کی چیخیں' اس کی فریادیں اس کے اندر ہی دم توڑ رہی تھیں۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ مر رہا تھا۔ اسے بچانے کے لیے اس کا بہت طاقت ور' بہت بااثر باپ نہیں آیا تھا۔ اس کی مدد کے لیے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ صبح ہونے پر اسے نیم مردہ حالت میں چھوڑ کر وہ چاروں وہاں سے فرار ہوگئے تھے۔ وہ جس بری طرح مارا پیٹا اور زخمی کیا گیا تھا' جتنی مقدار میں اس کا خون بہہ گیا تھا۔ اگر وہ کچھ دیر اور اس سڑک پر پڑا رہتا تو شاید وہیں اس سڑک پر ہی مر گیا ہوتا۔ پتا نہیں کون تھا' جو اسے اسپتال لے آیا تھا' جس نے اس کی جان بچالی تھی۔

اپنی جان بچانے والے اس شخص سے اسے شدید نفرت محسوس ہوتی تھی۔ ذلت بھری یہ زندگی گزارنے کے لیے آخر اسے زندہ کیوں رہنے دیا گیا تھا؟ ہوش آنے پر اس نے خود کو پٹیوں میں جکڑا اسپتال میں پایا تھا۔ اس کا علاج کرنے والے ڈاکٹر نے اسے ہمدردی سے دیکھا تھا۔ اس نے اس سے اس کے گھر اور گھر والوں کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس نے ڈاکٹر سے فون مانگا تھا۔ وہ اپنے گھر پر فون کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے باپ کے سینے پر سر رکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونا چاہتا تھا۔ وہ کس طرح پامال کیا گیا ہے' وہ یہ صرف اپنے باپ ہی سے کہہ سکتا تھا۔ اس کا جسم نہیں' اس کی روح روند ڈالی گئی تھی۔ اس نے اپنے گھر پر فون کیا تھا۔ فون شہریار خان نے اٹھایا تھا۔ وہ ان کی آواز سن کر اسی طرح رو پڑا تھا۔ جیسے میلے میں کھو جانے والا بچہ واپس ماں' باپ کو پاکر رو پڑتا ہے۔

"ہیلو پاپا!" اس نے روتے ہوئے انہیں پکارا تھا۔

"کیوں فون کیا ہے تم نے یہاں؟" ان کا سخت

لب و لہجہ ویسا ہی تھا۔ بے لچک' غیر جذباتی اور سرد سا تاثر لیے۔

"پاپا! کل رات۔ پاپا کل رات میرے ساتھ۔"

روتے ہوئے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ وہ اپنے مضبوط باپ کی پناہوں میں چلا جانا چاہتا تھا۔ نہیں ہے وہ کمزور لڑکا اتنا مضبوط کہ دنیا کی ٹھوکروں کا مقابلہ کرسکے۔

"پاپا! مجھے گھر آنا ہے۔ پلیز پاپا مجھے آکر لے جائیں۔ میں مر جاؤں گا پاپا۔ پلیز۔ مجھے بچالیں۔ پاپا! مجھے گھر آنا ہے' مجھے آپ کے پاس آنا ہے۔ پلیز میرے پاس آجائیں پاپا!" اس نے زارو قطار روتے ہوئے ان سے التجا کی تھی۔

"میرے گھر میں تم جیسے بدکردار اور بدفطرت کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ آئندہ یہاں فون مت کرنا۔ تم میرے لیے مرچکے ہو۔ میں تمہیں رو چکا ہوں۔"

اس کے باپ نے سخت لب و لہجے میں یہ بات کہہ کر کھٹاک سے فون بند کردیا تھا۔ فون بند ہونے کی تیز آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ یک لخت ہی اس کی آنکھوں سے آنسو رک گئے تھے۔

وہ واقعی مرچکا تھا اور مردے رویا نہیں کرتے۔

وہ کئی دن اسپتال میں رہنے کے بعد پھر سڑک پر آگیا تھا۔ بوسٹن' میساچوسٹس' ہارورڈ' بیچلرز' لاء' دوست' گھر' زندگی۔ اس کے لیے ہر چیز بے معنی ہوچکی تھی۔ وہ جسمانی طور پر نہیں' روحانی طور پر مرچکا تھا۔ اب نہ اسے ام مریم کا خیال آتا تھا' نہ اس سے انتقام لینے کے منصوبے اس کے ذہن میں آتے تھے۔

اس رات کی وہ بے بسی' وہ خوف' وہ ذلت اسے راتوں کو سونے نہیں دیتی تھی۔ سوجاتا تھا تو ڈراؤنے خوابوں کی صورت وہ اسے اٹھا کر بٹھادیا کرتی تھی۔ اسے سوتے میں ہر بار ایسا لگتا اس کے منہ پر کسی نے ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ اس کا دم گھونٹا جا رہا تھا۔ اسے سانس لینا دشوار لگنے لگتا۔

"میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟"

"میں ہی کیوں اس کا شکار بنا؟" وہ راتوں کو چلا چلا کر رو رو کر اللہ سے پوچھتا۔ اس نے خود کو دنیا کی بھیڑ میں گم کرلیا تھا۔ وہ ہیلتھی مور آگیا تھا۔

کئی بار اس نے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس کے پاپا یقیناً" ٹھیک کہتے تھے' وہ واقعی بے غیرت تھا۔ اس ذلت بھری زندگی کو جینے کے لیے تیار تھا وہ موت سے ڈرتا تھا۔ خود کو نہ گولی مار پایا' نہ اپنے پیٹ میں خنجر اتار پایا اور نہ کسی اونچائی سے چھلانگ لگا کر خود کو ختم کرپایا تھا۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ اس ذلت بھری زندگی میں اسے جو بھی کام ملتا وہ کرلیتا تھا۔ کبھی وہ کسی بار یا نائٹ کلب میں کام کرنے لگتا' کبھی کہیں کسی کنسٹرکشن سائٹ پر جاکر محنت مزدوری کرلیتا' کبھی بھوک لگی ہوتی' تو کسی امیر شخص کے کتوں کو نہلانے دھلانے کی نوکری تک کرلیا کرتا تھا۔ وہ کسی بنجارے' کسی جپسی کی طرح زندگی گزار رہا تھا۔ دنیا کی ٹھوکروں نے اسے بہت مضبوط بنادیا تھا۔ اب وہ گھر کی آرام دہ فضاؤں میں رہنے اور ہارورڈ میں پڑھنے والا سکندر شہریار نہیں تھا۔ اب وہ ایک اسٹریٹ اسمارٹ بنجارہ اور جپسی تھا۔ وہ جسمانی لحاظ سے بھی بہت مضبوط ہوچکا تھا۔

اس رات کے بعد کبھی کسی کی مجال نہ ہوئی تھی اس کے نزدیک بھی پھٹک سکتا۔ ایک بار وہ نائٹ کلب سے اپنی ڈیوٹی ختم ہونے پر علی الصبح واپس جا رہا تھا' جب سڑک پر دو کالے امریکیوں نے اسے لوٹنے کی کوشش کی۔ تب اس پر ایسا جنون سوار ہوا تھا' ایسی غیر معمولی طاقت اچانک اس کے اندر آگئی تھی کہ اس نے انہیں مار مار کر لہولہان کردیا تھا۔ وہ دونوں اس سے رحم کی بھیک مانگنے لگے مگر وہ انہیں جان سے مار ڈالنے کے درپے تھا مگر پھر انہیں زخموں سے چور چور کرکے چھوڑ دیا۔

وہ رات اس کی زندگی سے کبھی نہیں نکل سکتی تھی۔ اس رات کے بعد اگلی صبح وہ خود سے بھی اور دنیا سے بھی پہلے سے بھی زیادہ نفرت میں مبتلا ہو کر دنیا کی بھیڑ میں شامل ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ ان دنوں ایک بار میں نوکری کر رہا تھا۔ وہ لوگوں کو شراب پیش کیا کرتا تھا۔ اپنا کام ایمان داری سے کرتا۔ کام سے ہٹ کر کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی سختی اور کرختی دیکھ کر کسی کی جرأت بھی نہ ہوتی تھی اس سے فالتو بات کرنے کی۔ بار کا پچپن سالہ امریکن مالک بل اسے اس کی ایمان داری کی وجہ سے پسند کیا کرتا تھا۔ مہینے کے آخر میں جب بل سب کی تنخواہوں کا حساب کتاب کر رہا ہوتا تب سکندر سے اس کام میں مدد لے لیا کرتا تھا۔ کچھ ہی عرصے میں وہ جہاں دیدہ شخص یہ سمجھ چکا تھا کہ وہ پڑھا لکھا اور کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ وہاں کام کرتے باقی ویٹرز اور بار ٹینڈرز کی طرح معمولی پڑھا لکھا اور معمولی خاندانوں سے تعلق نہیں رکھتا ہے۔

وہ حساب کتاب میں بل کی مدد کر دیا کرتا تھا، کمپیوٹر پر اس کا کام کر کے دے دیا کرتا تھا۔ اس نے خود کہہ کر اپنی ڈیوٹی دوپہر تین سے رات تین تک رکھوائی ہوئی تھی۔ راتوں کو سونا وہ ویسے ہی نہیں چاہتا تھا، سو بار بند ہونے کے ٹائم تک جو کہ صبح کے تین بجے تک کا تھا، وہ اپنی ڈیوٹی انجام دیا کرتا تھا۔ اکثر وہاں سے بار بند کر کے نکلتے صبح کے چار بج جایا کرتے تھے۔

ایک رات بار بند ہو جانے کے بعد بل باہر نکل کر اپنی گاڑی کے پاس جا رہا تھا تب اسلحے سے لیس ایک شخص اسے لوٹنے آ گیا تھا۔ سکندر چند منٹ قبل ہی بار سے نکلا تھا۔ وہ سڑک پر ابھی کچھ ہی آگے گیا تھا۔ صبح کے چار بجے شور اور بل کے چیخنے کی آوازیں اسے صاف سنائی دے گئی تھیں۔ وہ فوراً" واپس پلٹا۔

اسے بل سے نہ کوئی محبت تھی نہ انسیت اور نہ ہی ہمدردی مگر خود پر گزری اس سیاہ اور بد ترین رات کے بعد اس کے اندر یہ جنون اور وحشیانہ پن آ گیا تھا کہ اب وہ اپنی آنکھوں کے سامنے کہیں پر بھی اور کسی پر بھی کوئی ظلم اور زیادتی ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اس کے پاس گن بھی اور سکندر تنہا۔ سکندر کی ٹانگ اور بازو پر گولیاں لگی تھیں، مگر اس نے اس زخمی حالت میں بھی اس کا ریوالور چھین کر اس کا بٹ اس شخص کے سر پر اس قوت سے مارا تھا کہ وہ چیختا ہوا زمین پر گر پڑا تھا۔

وحشت اور جنون بھرے انداز میں اس نے اسے لاتیں اور گھونسے مارے۔ اس کے بازو اور ٹانگ پر سے خون بہہ رہا تھا مگر وہ اس سے بے نیاز تھا۔ اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر بل کی جان بچائی تھی اور اسے لٹنے سے بھی بچا لیا تھا۔

بل اس واقعہ سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ اس نے سکندر کی تنخواہ کئی گنا بڑھا کر اسے یہ اضافی ذمہ داری بھی سونپ دی تھی کہ اب اگر کوئی بار میں زیادہ شراب پی لینے کے بعد غل غپاڑہ کرنے کی کوشش کرے یا کوئی شراب پی لینے کے بعد بل ادا نہ کر رہا ہو تو وہ ایسے غنڈے بدمعاشوں سے نمٹے۔ خود کشی کرنے سے بے شک وہ ڈرتا تھا مگر جان کی تو اسے اپنی کوئی پروا تھی ہی نہیں، سو وہ غنڈوں اور بدمعاشوں سے نمٹنے کا کام بخوبی کر رہا تھا۔ کوئی زیادہ شراب پی کر نشے میں مدہوش ہو کر کسی ویٹرس سے بدتمیزی کرنے کی کوشش کرتا تو سکندر کو بلایا جاتا، وہ اسے اٹھا کر بار سے باہر پھینک دیتا۔

کسی کی زیادہ پی لینے کے بعد اپنے ہی ساتھیوں سے بار میں بیٹھے بیٹھے گالم گلوچ اور ہاتھا پائی شروع ہو جاتی تو وہ ان سب کو دھکے مار کر بار سے باہر نکال دیتا۔ وہ ہر طرح کے شرابیوں، اچکوں، غنڈوں، بدمعاشوں سے با آسانی اور بخوبی نمٹ لیتا تھا۔

بل جس کی بیوی مر چکی تھی اور بیٹا اسے چھوڑ کر کہیں اور رہتا تھا، وقت گزرنے کے ساتھ وہ سکندر کی پروا کرنے لگا تھا مگر اسے اب کسی کے بھی پیار اور محبت کی ضرورت نہیں تھی۔ رشتے، پیار، محبت، چاہت بھرے لفظ اب اس کے لیے کھوکھلے اور بے معنی تھے۔ یہ تمام لفظ بس لفظ ہی تھے، اس کی نگاہوں میں ان کی کوئی وقعت نہ تھی۔ مگر پھر بھی وہ جانتا تھا کہ بل آہستہ آہستہ اس سے پیار کرنے لگا تھا۔

وہ اپنی جان بچاتے اور اپنا بار سنبھالتے اس بہادر اور نڈر لڑکے میں اپنا بیٹا دیکھنے لگا تھا۔ اس احساس کے

پیش نظر ایک روز بل نے اس سے کہا کہ وہ اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرے۔ اس نے حیران ہو کر بل کو دیکھا تھا۔

"تم نہ بھی بتاؤ، تب بھی میں جانتا ہوں تم کسی اچھی فیملی سے تعلق رکھتے ہو اور پڑھے لکھے بھی ہو۔ تعلیم کسی وجہ سے پوری نہیں کر سکے ہو۔"

بل اسے پیار سے دیکھ کر بولا تھا۔ فیملی کے لفظ پر وہ چونکا، پھر ہنس پڑا تھا۔ وہ کیا بتائے اس شخص کو کہ وہ کس کا بیٹا ہے، کتنے بڑے آدمی کا۔ آج اپنی وہ پچھلی زندگی، وہ بڑا باپ، وہ اونچا خاندان، وہ اعلا اسٹیٹس اسے خود ایک مذاق لگ رہا تھا۔ شہریار خان کا بیٹا جسے وہ ہارورڈ میں پڑھا رہے تھے، جسے اپنا شاندار کیریئر شروع کرنا تھا، آج میمفس کے ایک چھوٹے سے بار میں لوگوں کو شراب پیش کرتا ہے ——— شراب پی کر پیسے نہ دینے والوں سے اپنے بار کے مالک کو پیسے وصول کر کے دیتا ہے۔ شراب کے نشے میں دھت ہنگامہ کرنے والوں کو مار پیٹ کر دھکے مار کر بار سے نکالا کرتا ہے۔

زندگی کے کڑوے سچ اسے رلا نہیں رہے تھے بلکہ ہنسا رہے تھے۔ ہارورڈ کا لاء گریجویٹ بنتے بنتے وہ ایک بار ٹینڈر بن گیا تھا۔ اسے خود پر ہنسی آئی تھی۔ بل اسے قائل کر رہا تھا۔ اس کا بہت مخلص خیر خواہ بن کر اسے سمجھا رہا تھا کہ اسے اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنی چاہیے۔

"مجھے تم اپنے بیٹے کی طرح پیارے ہو گئے ہو۔ میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا سکندر! کہ تم ساری زندگی بھرے بار پر کام کرتے گزار دو۔"

وہ بل کو یہ سمجھا نہیں سکتا تھا کہ وہ تو زندہ ہی نہیں ہے۔ وہ تو اس اندھیری رات واشنگٹن کے مضافات میں بلڈنگ سائٹ کے پاس، اس سڑک پر کب کا مر چکا ہے۔ اسے مرے ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں۔

اس کی اس مردوں کی سی زندگی پر وہ راتیں اپنی پوری ہولناکی اور پوری سیاہی کے ساتھ چھائی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک رات وہ تھی، جب واشنگٹن کے ایک بڑے سے گھر سے اسے ریپسٹ قرار دے کر اور دھکے مار کر نکالا گیا تھا اور دوسری وہ رات تھی، جب اس کی عزت نفس، اس کا وقار، اس کی شخصیت کی آن بان اس سے چھین لی گئی تھی، اسے زندہ درگور کر دیا گیا تھا۔

بل کو وہ دیکھنے میں بڑا مضبوط نظر آتا ہے؟ کیا بل کو پتا ہے کہ وہ آج بھی راتوں کو ان دو راتوں کے خوف اور دہشت کا شکار ہو کر ڈراؤنے خواب دیکھ کر چیخیں مار کر اٹھ بیٹھتا ہے؟

"میں کچھ بھی نہیں کرنا چاہتا بل! میری زندگی جیسے گزر رہی ہے، میں اسے ایسے ہی گزار دینا چاہتا ہوں۔"

وہ قطعیت سے بولا تھا مگر بل اسے اس کی زندگی برباد کرتے نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ وہ اسے پیار سے سمجھاتا رہتا تھا۔

بل اسے زندگی کی طرف واپس لانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ وہ خواہش کے باوجود، کوشش کے باوجود بھی اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تک نہیں دیکھ پاتا تھا۔ وہ سکندر کو اپنا بیٹا کہتا تھا مگر اسے لگتا تھا سکندر کو اس کے بیٹا کہنے یا نہ کہنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔

مگر مسلسل کوشش کرتے رہنے سے بل اسے اس بات پر راضی کر لینے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ وہ اپنی ادھوری تعلیم مکمل کر لے۔

"خود کو اس قابل تو بنا لو سکندر! کہ جن لوگوں نے تمہاری زندگی تباہ کی ہے، تمہیں اس حال تک پہنچایا ہے، کبھی دوبارہ ان سے سامنا ہو تو وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ جائیں کہ تم ان کے لاکھ چاہنے پر بھی تباہ نہیں ہوئے، تمہاری زندگی برباد نہیں ہوئی۔"

اسے نہ کسی بچھڑے سے ملنے کا کوئی شوق تھا، نہ کسی بچھڑے پر کچھ ثابت کرنے کا۔ مگر جب وہ زندہ بھی تھا، زندہ لوگوں کی طرح نوکری بھی کرتا تھا، کھاتا پیتا بھی تھا تو واقعی یہ کوئی ضروری نہ تھا کہ وہ ساری زندگی کسی بار یا نائٹ کلب میں کام کر کے گزارے گا۔ اس نے میمفس کے ہی ایک کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہ دن میں پڑھتا تھا۔ پھر کالج سے سیدھا دن میں ہی وہ بار

آجاتا تھا اور پھر رات گئے بار بند ہونے کے وقت تک وہاں کام کیا کرتا تھا۔ ہارورڈ کے بعد یہ کالج یوں لگتا تھا' جیسے وہ آسمان سے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا گیا تھا۔ مگر وہ اس جگہ کا ہارورڈ کے ساتھ مقابلہ و موازنہ نہیں کرتا تھا۔

بار میں آج بھی اس کی وہی جاب تھی' بل اب اس پر زیادہ انحصار کرتا تھا۔ بار کے تقریباً" تمام معاملات اب وہی دیکھا کرتا تھا۔ وہ اپنی تعلیمی زندگی میں تین سال پیچھے ہو گیا تھا۔ اگر پڑھائی میں یہ وقفہ نہ آیا ہوتا تو وہ آج لاء کے بھی دوسرے سال میں ہوتا۔

بل اب بیمار رہنے لگا تھا۔ بار کو اب سکندر ہی سنبھال رہا تھا۔ ادھر اس کا بیچلرز مکمل ہوا' ادھر بل کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کا بیچلرز پورا ہوتے بل نے دیکھ لیا تھا اور وہ اس کی اس کامیابی پر بہت خوش ہوا تھا۔ بل کا بیٹا جو اسے چھوڑ کر کہیں اور رہتا تھا۔ اس کے انتقال کے فوراً" بعد ہی آگیا تھا۔ بار کا مالک اب وہ تھا' سارا انتظام اس نے سنبھال لیا تھا۔ وہ سکندر کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اسے ہر لمحہ یہ شک رہتا تھا کہ سکندر بار پر قابض ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس نے خاموشی سے بار چھوڑ دیا تھا۔ مگر بل کے ساتھ اتنے سال رہنے سے یہ ہوا تھا کہ اب وہ اپنی زندگی پہلے کی طرح برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی گریجویٹ ڈگری پوری کر چکا تھا اور اب کہیں بہتر ملازمت کے لیے کوشش کر سکتا تھا۔ تھوڑی کوشش کے بعد ہی اسے ایک لاء فرم میں جاب مل گئی تھی۔ اسے فرم کے ایک سینئر وکیل کے سیکریٹری کی جاب مل گئی تھی۔

اب وہ تعلیم یافتہ اور بہت ذہین اور قابل لوگوں کے درمیان رہتا تھا اور ان ذہین اور قابل لوگوں کے درمیان اس کی غیر معمولی قابلیت اور ذہانت بہت عرصہ چھپی نہ رہ سکی تھی۔ اپنے باس کے لیگل ڈاکومنٹس ٹائپ کرتے' کلائنٹس کے ساتھ اس کی میٹنگز کا شیڈول بناتے وہ مختلف کیسوں کی لیگل ریسرچ میں اپنی فرم کے اس سینئر قانون دان کو جس کو عنقریب فرم کا ایک پارٹنر بن جانا تھا' مدد دینے لگا تھا۔ بلکہ ان سے کہیں زیادہ بہتر ریسرچ کر کے اسے لیگل ڈاکومنٹس ڈرافٹ کر کے دینے لگا تھا۔ جاب کرنے کے ساتھ اس نے میمفس کی ایک یونیورسٹی میں داخلہ لے کر لاء پڑھنا بھی شروع کر دیا۔

اس کی ذہانت' قابلیت اور فرم کے لیے اس کی اہمیت کے سبب اسے دوران ملازمت تعلیم حاصل کرنے کی اجازت بھی مل گئی تھی اور فرم کی طرف سے اس کی فیس کی ادائیگی میں بھی اسے تعاون فراہم کیا گیا تھا۔ وہ صبح سے دوپہر تک کیمپس میں ہوتا تھا اور پھر دوپہر سے رات گئے تک فرم میں موجود رہا کرتا تھا۔

اس نے اپنی لاء کی ڈگری کا پہلا سال مکمل کیا تو اسے ترقی دے کر لیگل سیکریٹری سے پیرالیگل بنا دیا گیا تھا مگر ابھی وہ کسی بھی کورٹ میں اور جج کے سامنے اپنی فرم کی طرف سے بطور وکیل پیش نہیں ہو سکتا تھا۔ چار سال قبل جب وہ لاء پڑھ رہا تھا اور بطور پیرالیگل اسی فرم میں کام کر رہا تھا' تب شہریار خان نے اسے اس کی ماں کی بیماری کے سبب ڈھونڈ کر فون کیا تھا۔

اس کی جدائی کے دکھ نے اس کی ماں کے وجود کو کھوکھلا کر ڈالا تھا۔ انہوں نے آٹھ سال سے اپنے بیٹے کو نہیں دیکھا تھا۔ چپ چاپ یہ درد سہتے سہتے آخر وہ ایک روز ہمت ہار گئی تھیں۔ انہیں کینسر ہو گیا تھا۔ بیماری ابتدائی اسٹیج پر ہی پتا چل گئی تھی۔ علاج بھی ممکن تھا اور ڈاکٹر ان کے صحت یاب ہو جانے کے بارے میں بھی پرامید تھے۔ ان کا فوری طور پر آپریشن کر دیا گیا تھا جو کامیاب بھی ہو گیا تھا مگر پھر بھی ان کی حالت سنبھل نہیں رہی تھی۔ تب یقیناً" آمنہ کے سرجن کے مشورے پر ہی شہریار خان نے اس سے رابطہ کیا تھا۔

انہوں نے اسے کیسے ڈھونڈا' وہ نہیں جانتا تھا۔ اس کے پاس ایک دن اچانک اس کے دفتر میں ان کی کال آئی تھی۔

"تمہاری ماں بہت بیمار ہے۔ تمہیں یاد کر رہی ہے۔"

بس یہ جملہ انہوں نے اس سے کہا تھا۔ وہ آ رہا ہے یا نہیں' یہ بھی کنفرم نہیں کیا تھا۔ وہ ماں کی بیماری کی اطلاع پاتے ہی ان کے پاس جانا چاہتا تھا۔ چار سال قبل وہ اپنی زندگی میں آج کی طرح سیٹل نہیں تھا۔ ایمرجنسی میں پاکستان جانے کے لیے اسے نکولس سے ادھار مانگنا پڑا تھا۔ تب نکولس اس کی فرم میں وکیل تھا اور وہ وہاں ایک پیرالیگل' مگر نکولس اسے برابری کے درجے پر رکھتا تھا۔ باپ کے فون سے ہی اسے پتا چلا تھا کہ اب اس کی فیملی پاکستان میں رہتی ہے۔

وہ کراچی پہنچتے ہی سیدھا ہسپتال اپنی ماں سے ملنے آیا تھا۔ اس کی شکل نہ دیکھنی پڑے یہ سوچ کر اس کا بھائی جتنی دیر وہ ہسپتال میں رہا ہسپتال نہیں آیا تھا اور باپ ہسپتال ہی میں کہیں موجود ضرور تھا' پر اس کی شکل دیکھنا اس نے بھی گوارا نہ کیا تھا۔ اگر وہ دونوں اس سے مل لیتے۔ اسے تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ اس کی ماں جن کی حالت بہت نازک تھی' جو کسی کے بھی پکارنے پر پندرہ دنوں سے آنکھیں نہیں کھول رہی تھیں' اس کی آواز سنتے ہی انہوں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ اسے دیکھ کر روتی رہی تھیں۔

وہ ان کے سرہانے بیٹھا تھا۔ وہ اٹھ نہیں سکتی تھیں اس لیے وہ ان کے پاس جھکا ہوا تھا۔ کبھی وہ اس کا چہرہ چومتیں' کبھی اس کے ہاتھوں پر پیار کرتیں۔ وہ زارو قطار روتے ہوئے اسے والہانہ چومے جا رہی تھیں۔

وہ ماں سے بہت پیار' بہت عزت' بہت احترام سے ملا تھا۔ انہوں نے اسے جنم دیا تھا' پالا پوسا تھا۔ مگر آج وہ خود کو ان کے قریب محسوس نہیں کر پا رہا تھا۔

آمنہ روتے ہوئے کبھی اسے حسرت سے دیکھتیں' کبھی پیار سے' کبھی دکھ سے' کبھی ندامت سے۔ اس نے ماں سے کوئی گلہ' کوئی شکوہ' کوئی شکایت نہیں کی تھی۔ جیسے اس کی زندگی کے پچھلے آٹھ سالوں میں کچھ برا ہوا ہی نہیں تھا۔

"امو جان! آپ ٹھیک ہو جائیں پلیز۔" اس نے ان سے پیار سے کہا تھا۔

"میں تمہیں دیکھتے ہی ٹھیک ہو گئی ہوں بیٹا! پتا ہے میں نے اللہ سے دعا مانگی تھی' جب تک میں اپنے سکندر سے مل نہ لوں۔ مجھے موت نہ دینا پروردگار۔ سکندر! میرے بچے' مجھ سے اب دور مت جانا۔"

وہ تڑپ تڑپ کر روتے ہوئے بولی تھیں اور اس رات اس نے اپنی بیمار ماں سے وعدہ کیا تھا کہ اب وہ ان سے نہیں کھوئے گا۔ غالباً" وفا شعار اور مہر بہ لب اطاعت گزار بیوی کو موت کے دہانے سے واپس پلٹتے دیکھ کر شہریار خان کا دل بھی تھوڑا نرم ہو گیا تھا' تب ہی ہسپتال سے واپس آجانے کے بعد جب آمنہ نے اس کے ساتھ ٹیلی فون پر رابطہ قائم کیے رکھا تو شہریار خاں نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا تھا۔

اس ایک رات وہ ہسپتال میں ماں کے پاس رہا تھا اور وہ پھر سے جی اٹھی تھیں۔

اگلے روز وہ ہسپتال ہی سے واپس چلا گیا تھا۔ اس ایک رات کے بعد پھر وہ دوبارہ کبھی پاکستان نہیں گیا تھا۔ مگر اس کے بعد اس کا اپنی ماں سے فون پر رابطہ رہنے لگا تھا۔ مختصر سی گفتگو۔ ایک دوسرے سے بہت کچھ کہنے کی خواہش رکھنے کے باوجود نہ کہہ پانے والی گفتگو۔ آمنہ نے کئی بار اس کے ماضی کے سالوں کے متعلق پوچھا تھا۔ مگر وہ اس موضوع پر کچھ بھی بولنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اب ماں سے بھی اپنے اندر کی کوئی بات نہیں کہتا تھا۔ گلے' شکوے' شکایتیں' ناراضیاں' روٹھنا' منانا' خفا ہونا۔ اس کے لیے یہ سب کچھ اپنے معنی و مطلب کھو چکا تھا۔

اس دوران میمفس میں اسی فرم میں پیرالیگل کی جاب کرتے اگلے پونے دو سالوں میں وہ اپنی لاء کی تعلیم مکمل کر چکا تھا۔ ہارورڈ سے نہیں' ایک عام سی یونیورسٹی سے' کسی اعزاز اور میڈل کے ساتھ نہیں' عام سے انداز میں۔ اس کی زندگی کا آزمائشوں اور سختیوں سے بھرا وقت آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا تھا۔ بار اور نائٹ کلب میں لوگوں کو شراب پیش کرنے والا وہ دوبارہ معاشرے میں باعزت بن گیا تھا۔

دو سال قبل اسے دبئی میں اس ملٹی نیشنل کمپنی میں لیگل ایڈوائزر کی اپنی موجودہ اور کافی اچھی جاب مل

گئی تھی۔ اس کی زندگی میں عزت اور رتبہ واپس آگیا تھا۔ وہ 'وہ' نہ بن سکا تھا' جو اس کے لیے کبھی کسی نے خواب دیکھے تھے' جو وہ خود بننا چاہتا تھا اور جو کچھ بننے کی اس میں اہلیت اور قابلیت تھی۔ کبھی اسے بتایا گیا تھا کہ وہ اگر چاہے تو آفاق چھو سکتا ہے' اس میں اتنی بے مثال ذہانت اور ایسی غیر معمولی صلاحیتیں ہیں کہ وہ نئے جہان اور نئی دنیا میں دریافت کر سکتا ہے۔

مگر وہ آج بھی زندہ لاش ہی کی طرح اپنے وجود کو گھسیٹتا تھا۔ اس کے لیے زندگی اپنی کشش کھو چکی تھی وہ نوکری بھی کرتا تھا' لوگوں سے ملتا بھی تھا۔ وہ زندہ لوگوں جیسے تمام کام کرتا تھا مگر بغیر زندگی کی امنگ کے۔ اس کے سامنے نہ کوئی مقصد تھا نہ منزل۔

کبھی کوئی پوچھتا کہ اگلے دس سالوں بعد وہ زندگی میں خود کو کہاں دیکھتا ہے تو وہ دل میں سوچا کرتا کہ وہ اگلے دس سالوں بعد زندہ ہی نہیں ہونا چاہتا تو کچھ اور کیا سوچے۔ وہ مستقبل کی کسی پلاننگ' آنے والے کل کی کسی امید کے بغیر جیسے زندگی کو گھسیٹ رہا تھا۔ اب بھی اس کا خودکشی کرنے کو جی چاہتا تھا مگر بارہ سال بعد بھی وہ اتنا ہی بزدل تھا۔

ہارورڈ میں پڑھتا' اپنی قابلیت اور صلاحیتوں سے دنیا کو فتح کر لینے کے خواب دیکھتا وہ سکندر کہیں کھو چکا تھا۔ بارہ سال بعد بھی وہ دو راتیں اسے آج بھی ڈراؤنے خوابوں کی صورت سوتے سے جگا دیا کرتی تھیں' اسے اعصابی درد اور بے خوابی میں مبتلا کیے رکھتی تھیں۔ اسے خود سے' زندگی سے اور دنیا سے نفرت میں مبتلا کیے رکھتی تھیں۔ وہ ان خوابوں سے بارہ سال بعد بھی اتنا ہی ڈرتا تھا جتنا روز اول ڈرا تھا۔ اسے یقین تھا اس کی زندگی اسی طرح گزرتی رہے گی اور پھر ایک دن یونہی تنہا تمام درد سہتے سہتے ختم بھی ہو جائے گی۔

مگر اسے پتا نہیں تھا اس زندگی میں اسے لیزا محمود بھی ملے گی۔ اس زندگی میں ابھی اسے زندگی بھی ملے گی۔ جب نہ اسے ہنسی کی کوئی ضرورت رہی تھی' نہ خوشی کی' نہ محبت کی اور نہ ہی زندگی کی تب اس کی زندگی میں ہنسی' خوشی' محبت اور زندگی بن کر وہ چلی آئی تھی۔

بارہ سال بعد ایسا لگا تھا جیسے وہ زندہ ہے۔ بارہ سال بعد اس کا خواب دیکھنے کو دل چاہا تھا۔ خوش ہونے کو دل چاہا تھا۔ بارہ سال بعد اس لڑکی نے اسے اس کے ان خوف ناک خوابوں کے حصار سے باہر نکالا تھا۔ وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے دل کی سنتا' اس کے پیچھے پیچھے فلورنس چلا آیا تھا۔ اس نے لیزا کو اپنے بارے میں وہ بتا دیا تھا' جو وہ مرتے دم تک کبھی کسی کو بتانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ساری رات دہشت کے عالم میں جاگتا رہا تھا۔ صبح ہونے کا انتظار کرتا رہا تھا۔ صبح ہوگی تو وہ لیزا سے ملے بغیر ہی یہاں سے چلا جائے گا اور پھر وہ اس سے زندگی بھر نہیں ملے گا۔ کل رات اپنی جو بھیانک سچائی اس نے لیزا کو بتائی ہے' اس کے بعد اب وہ اس کا سامنا کیسے کر سکتا ہے؟

صبح سویرے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ہوٹل کے عملے کا ایک فرد وہاں کھڑا تھا۔

"یہ آپ کے لیے بھجوایا گیا ہے۔"

اس نے سرخ گلابوں کا ایک گلدستہ اور ایک سلیقے سے پیک ہوا گفٹ اس کی طرف بڑھایا۔ حیران ہوتے اس نے وہ چیزیں اس سے لے لیں۔ پھولوں کے ساتھ کوئی کارڈ منسلک نہ تھا۔ اس نے گفٹ پر چڑھا پیپر کھولا اس میں سے نکلنے والی چیز کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا۔ وہ جاپانی سیمورائی کا ایک منی ایچر مجسمہ تھا۔ جنگی لباس میں' چہرے پر طاقت کا تاثر اور ہاتھوں میں مضبوطی سے تلوار تھامے سیمورائی۔

گفٹ باکس میں سیمورائی کے مجسمہ کے ساتھ ایک کارڈ بھی رکھا تھا جو ہاتھ سے بنایا ہوا تھا' کسی ماہر آرٹسٹ کے ہاتھوں کا بنایا ہوا۔ کارڈ پر سیمورائی کی تلوار کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ پینٹ کیا گیا تھا۔

ساتھ ہی اوپر خوب صورت انداز میں نمایاں حروف میں لکھا تھا۔

"You are stronger than a samurai-"

(تم سیمورائی سے زیادہ طاقت ور ہو۔)

اس نے کارڈ کھولا۔ اندر اسے مخاطب کرکے لکھا گیا تھا۔

"سینور سکندر!

سیمورائی وہ بہادر مرد تھے۔ جو نہ موت سے ڈرتے تھے نہ زندگی کے دوسرے امتحانات سے۔ وہ آن 'بان اور عزت پر جان دے دینے والے تھے اور آج بھی طاقت 'ہمت 'بہادری اور دلیری کا سمبل سمجھے جاتے ہیں' مگر میرے لیے سیمورائی سے بھی زیادہ بہادر اور باہمت تم ہو سکندر!

کل رات کے بعد سے میرے دل میں تمہاری عزت اور تمہاری محبت اور بڑھ گئی ہے۔ جو زندگی کے اتنے کٹھن حالات سے گزرنے کے بعد بھی خود کو سنبھال لے 'تمام بدترین حالات کا تنہا جواں مردی سے سامنا کرلے' اس سے بڑھ کر بہادر اور کون ہوسکتا ہے؟

تم ایک بہادر مرد ہو سکندر! اور مجھے بہادر مرد بہت اچھے لگتے ہیں۔ میں تمہارے ساتھ اپنی ساری زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ میں نیچے تمہارے ہوٹل کے ڈائننگ ایریا میں تمہارا انتظار کررہی ہوں۔

لیزا۔"

وہ فوراً" بیڈ سے کھڑا ہوا تھا۔ کارڈ اور مجسمہ وہیں رکھا۔ اس نے لباس تبدیل کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی البتہ اپنی رات بھر کی جاگی ہوئی آنکھوں پر پانی کے چھینٹے ضرور مارے اور انتہائی تیز رفتاری سے نیچے آیا۔

لیزا اسے سامنے ہی ایک میز پر بیٹھی نظر آگئی تھی۔ لیزا کے سامنے میز پر ناشتے کے تمام لوازمات سجے تھے۔ گویا وہ ناشتا منگوا کر اس کا انتظار کررہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ جواب میں بالکل بے اختیاری کیفیت میں وہ بھی مسکرایا تھا۔ اسے سامنے دیکھ کر رات کا کوئی درد 'کوئی تکلیف 'کوئی خواب 'کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ وہ اس لڑکی کو کیا کہے 'جو ہر بار اس کے چہرے پر ہنسی اور دل میں خوشی لانے کا باعث بنتی ہے۔

"یہ سیمورائی کا لقب تم نے مجھے کب دیا؟"

"نائیو ولی میں۔ جب تم نے فلمی ہیروز کی طرح ان جبشیوں سے دھواں دھار لڑائی کی تھی۔ دل تو میں تم پر بہت پہلے ہی ہار چکی تھی مگر سچ کہوں تو اس روز میرے دل نے کہا تھا مجھے اسی بہادر مرد کے ساتھ اپنی تمام عمر گزارنی ہے۔"

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بڑے اطمینان اور سکون سے بولی تھی۔ وہ قصداً" لیزا کے جملے کا آخری حصہ نظرانداز کرکے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ میں اس ہوٹل میں ٹھہرا ہوں؟"

"گوگل پر سرچ کیا تھا۔" وہ ہنس کر اسے چھیڑنے والے انداز میں بولی۔ اس کی کل کی بات کا حوالہ دے رہی تھی۔

"میں تمہاری طرح مشہور شخصیت تو نہیں جو گوگل پر سرچ کرنے سے مل جاؤں۔"

وہ جواباً" ہنسا۔ لیزا لبوں پر مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک پل کے لیے چپ ہوا۔ اس نے لیزا پر سے نظریں ہٹائیں اور پل بھر کے توقف کے بعد اس نے اسے مخاطب کیا۔

"لیزا میں ___" وہ جو کہنا چاہ رہا تھا' شاید وہ سمجھ گئی تھی تب ہی اس نے اس کے ہاتھوں پر فوراً" اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اسے مزید کچھ کہنے سے روکنے کے لیے۔

"جو باتیں تمہارے دل کو اتنی تکلیف دیتی ہیں تم انہیں مجھ سے بھی مت دہراؤ سکندر! تم نے کل جو کچھ مجھے بتایا۔ وہ نہ بھی بتاتے تب بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جان لینے کے بعد بھی کہیں کوئی تبدیلی نہیں آئی' سوائے اس کے کہ میرے دل میں تمہاری عزت اور بڑھ گئی ہے۔ بہت اوپری اور مصنوعی بات لگے گی اگر میں کہوں کہ تمہاری زندگی کے دکھوں پر میرا دل رو رہا ہے۔ میں کل رات بہت روئی ہوں سکندر!"

اس نے نظریں اٹھا کر لیزا کو دیکھا۔ اسے لیزا کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیرتی نظر آئی۔ وہ لڑکی اس کے دکھوں پر رو رہی تھی۔ وہ ایک پل کے لیے رکی پھر اس نے سنجیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"سکندر! وہ جو بہت بھیانک تھا' وہ ماضی تھا اور وہ گزر چکا ہے۔ ماضی کو کہیں دفن کرکے تم آج کی بات کرو۔ آج کی 'میری اور اپنی 'ہمارے آج کی 'ہمارے آنے والے کل کی۔" وہ بہت سنجیدہ تھی۔

اب یہ کہنا بے کار تھا کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتا۔ اس کا لیزا کے پیچھے فلورنس چلے آنا ہی یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ وہ اس لڑکی سے کتنی شدید محبت کرتا ہے۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں لیزا! مگر جو تم چاہتی ہو' وہ ممکن نہیں۔" وہ اسے دکھ سے دیکھ کر آہستگی سے بولا۔

"کیوں؟ کیوں ممکن نہیں ہے سکندر!"

"میری زندگی ایک نارمل شخص کی زندگی نہیں ہے لیزا! میں اس ابنارمل زندگی اور تنہائی کا عادی ہوچکا ہوں۔ میں اب اپنی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں چاہتا۔ میں میرڈ لائف یا فیملی لائف کو انجوائے کرنے والا آدمی نہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے چاہے جتنی بھی محبت کرتے ہوں' مگر میرا ساتھ تمہیں دکھوں کے سوا کچھ بھی نہیں دے گا۔"

"میں بھی پانچ سالوں سے اکیلی اپنی فیملی کے بغیر رہ رہی ہوں سکندر! اپنے پاپا سے میرے بہت اختلافات ہیں۔ وہ چاہتے ہیں میں ان کے ساتھ پاکستان میں رہوں۔ میں اپنے پاپا کو ناراض کرکے لندن میں رہتی ہوں۔ وہ پاکستان میں اپنی دوسری وائف کے ساتھ رہتے ہیں۔ میری ممی 'میرے پاپا سے طلاق کے بعد تین شادیاں مزید کرچکی ہیں۔ الکحل کی زیادتی نے انہیں کئی بیماریوں میں مبتلا کردیا ہے۔ وہ آئے دن ہسپتال میں داخل ہوجاتی ہیں۔ نارمل فیملی لائف تو کبھی میں نے بھی نہیں گزاری۔ پھر بھی میں تمہاری طرح یہ تو نہیں کہہ رہی کہ میں کبھی کوشش بھی نہیں کروں گی۔ ہم دونوں اپنی اپنی زندگی کی کمزوریوں 'خامیوں 'کمیوں اور غیر معمولی پن کے ساتھ بھی تو زندگی گزار سکتے ہیں سکندر!" وہ مضبوط لہجے میں بولی جیسے اسے قائل کرلینا چاہتی تھی۔

"اچھا ہم اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔ ابھی ناشتا کرلیں 'ٹھنڈا ہورہا ہے۔" وہ جیسے اپنا دامن بچا کر بولا۔ وہ خوف زدہ تھا۔ وہ رشتوں کا ایسا ڈسا ہوا تھا کہ اب ایک نیا رشتہ بنانا اسے مشکل لگ رہا تھا۔

وہ اس جذباتی کیفیت میں ایسی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا جو کل کو لیزا کی پرسکون زندگی میں دکھ ہی دکھ لے آئے۔ وہ خود کو نہیں لیزا کو دکھوں سے بچانا چاہتا تھا۔ وہ زندگی میں اتنی چوٹیں اور اتنے زخم کھا چکا تھا کہ اب کوئی نیا زخم 'کوئی نئی چوٹ اسے زیادہ تکلیف نہیں پہنچا سکتی تھی۔ مگر بچی ہنسی ہنسنے والی اس لڑکی کو' جس سے وہ بے تحاشا محبت کرتا تھا' دکھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اس کی آنکھ میں ایک آنسو تک گوارا نہیں کرسکتا تھا جبکہ اس کے ساتھ نے اس لڑکی کو آنسوؤں کے سوا کچھ دینا نہیں تھا۔ وہ اپنے ٹوٹے گھر اور بکھری فیملی کی بات کررہی تھی۔ اسے سکندر سے مماثل قرار دے رہی تھی وہ اسے کیسے بتائے کہ اس کی زندگی اور سکندر شہریار کی ذلت 'رسوائی اور شکست سے بھری زندگی میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔ خدا نہ کرے کہ کوئی مماثلت کبھی ہو بھی۔ وہ ہیرا تھی' وہ کوئلہ تھا۔ کیمیکل کمپوزیشن ایک سی' مگر پھر بھی بہت فرق تھا۔ ہیرا جس تن پر سج جائے اس کی قدر بڑھادے اور کوئلہ جس ہاتھ میں جائے' اسے بھی سیاہ اور داغ دار بنادے۔ وہ اس اجلی 'شفاف اور پیاری لڑکی کی زندگی پر اپنی زندگی کی نحوستوں کا کبھی ملبہ بھی نہیں پڑنے دے گا۔

لیزا شکوہ بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی نگاہوں کو قصداً" نظرانداز کرکے ناشتے کے لوازمات پر نگاہیں دوڑانے لگا۔

"واؤ! میرا فیورٹ مشرومز والا آملیٹ اور اٹالین کیک۔" اس نے اپنی پلیٹ میں آملیٹ ڈالا۔ "تم بھی

شروع کرو ناں۔"

وہ چھری اور کانٹے کی مدد سے آملیٹ کھانے لگا تھا۔ ساتھ ساتھ اٹالین رول بھی کھا رہا تھا۔ اس نے لیزا کی پلیٹ میں بھی آملیٹ ڈالا تھا۔

"بیلا! اس طرح اداس بیٹھی تم مجھے بالکل اچھی نہیں لگ رہی ہو۔ پلیز ناشتا کرو۔ میں ابھی کہیں نہیں گیا ہوں۔ تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ ہم اس ٹاپک پر ناشتے کے بعد بھی بات کر سکتے ہیں۔"

لیزا نے جیسے محض اس کا ساتھ دینے کے لیے آملیٹ کھانا شروع کیا تھا' اداسی اور خاموشی کے ساتھ۔ سکندر۔۔۔ بھرپور انداز میں ناشتا کر رہا تھا۔ اپنے اندر اس وقت ہوتی ٹوٹ پھوٹ' شکست و ریخت' وہ لیزا پر ہرگز ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا' وہ اس لڑکی کو بھینچ کر اپنے سینے سے لگا لے' اس لڑکی کو ابھی اسی وقت اپنا لے۔ اسے خود سے کبھی ایک پل کے لیے بھی دور نہ ہونے دے۔ مگر وہ خود غرض نہیں تھا۔ وہ دوسرے لوگوں اور رشتوں کے ساتھ کبھی خود غرض نہ رہا تھا تو اس لڑکی سے محبت کے رشتے میں کیونکر خود غرض ہو سکتا تھا؟

وہ دونوں ناشتا کر چکے تھے۔ وہ بھرپور انداز میں جبکہ لیزا اداسی کے ساتھ' اس سے شکوہ اور ناراضی لیے۔

"میری فلائٹ کا ٹائم ہونے والا ہے۔ کیا تم مجھے ایرپورٹ چھوڑنے چلو گی؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں گڈ بائی کہنے؟" بے بسی اور غصہ بھرا تھا اس کے سوال میں۔

"گڈ بائی کیوں؟ اب ہم ایک دوسرے سے رابطے میں رہا کریں گے۔ تمہارے ساتھ ساری زندگی دوستی کا تعلق تو میں چاہتا ہوں لیزا! میں چاہتا ہوں' دل کھول کر ہنسنے اور بہت بولنے والی لیزا محمود زندگی بھر میری دوست رہے۔"

"کیا ہم زندگی کے ساتھی نہیں بن سکتے؟"

"نہیں تب ہم دوست نہیں رہ سکیں گے۔ میرا ساتھ تمہیں اتنے دکھ دے گا کہ تم میری شکل' میرے نام تک سے نفرت کرنے لگو گی۔" وہ یک دم ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

"تم صاف کیوں نہیں کہتے سکندر شہریار! کہ تم رشتے بناتے ہوئے ڈرتے ہو۔ کہیں تمہیں پھر کوئی نئی چوٹ نہ لگ جائے' اس خوف سے تم نئے رشتے جوڑنا ہی نہیں چاہتے۔" وہ یک لخت ہی غصے سے بولی۔

"ہاں! ڈرتا ہوں۔ بہت ڈرتا ہوں رشتے جوڑنے سے۔ رشتے نبھانے کی اہلیت گنوا چکا ہوں۔ مگر مجھے یہ خوف اپنے لیے نہیں' تمہارے لیے ہے لیزا! میں خود کو نہیں' تمہیں دکھوں سے بچانا چاہتا ہوں۔ تمہیں میری بات سچ لگے یا جھوٹ' بزدلی لگے یا کم ہمتی مگر میں تم سے اتنا پیار کرتا ہوں کہ تمہیں کبھی دکھی نہیں دیکھ سکتا اس سے پہلے تو میں مر جانا پسند کروں گا۔"

اس نے بات لیزا ہی کے انداز میں غصے سے شروع کی تھی مگر آخر میں آ کر اس کی آواز جذبات کی شدت سے مدھم ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر دکھ اور بے بسی جھلکنے لگی تھی۔ لیزا چپ چاپ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکا' اس نے جیسے خود کو کمپوز کیا پھر سنجیدگی سے بولا۔

"مجھے ایرپورٹ جانے کے لیے تیار ہونا ہے۔ میری فلائٹ میں کم وقت رہ گیا ہے۔"

وہ اسے اسی طرح بیٹھا چھوڑ کر لفٹ کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے لیزا سے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ یہاں بیٹھے گی یا چلی جائے گی۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں ایرپورٹ پر تھے۔ وہ ہوٹل کے ڈائننگ ایریا میں اس کا انتظار کرتی رہی تھی۔ سارا راستہ وہ دونوں خاموش رہے تھے۔ ان کے درمیان ایک لفظ تک کا تبادلہ نہیں ہوا تھا۔

وہ اسے خفا کر کے جاتے ہوئے بہت اداس تھا' اسے لیزا کی آنکھوں میں خفگی' اداسی اور آنسو دکھائی دے رہے تھے۔ فلائٹ کا ٹائم ہو رہا تھا۔ اس نے لیزا کو دیکھا تھا۔ وہ کچھ کہنے کے لیے لب کھول ہی رہا تھا کہ

لیزا بھرائی ہوئی آواز میں آہستگی سے بولی۔

"مجھے گڈ بائی مت کہنا سکندر! پچھلی بار میں مضبوط رہی تھی مگر آج رو پڑوں گی۔ تم مجھے ٹھکرا کر جا رہے ہو تو خاموشی سے چلے جاؤ۔ مجھے تمہارے پر تکلف الوداعی جملوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

اس نے بے اختیار لیزا کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اور نرمی سے بولا۔

"مجھ سے خفا مت ہو لیزا! تم نہیں جانتیں مگر میں جانتا ہوں اپنے اندر اتری تنہائیاں اور ویرانیاں۔ تم میرے ساتھ کبھی خوش نہیں رہو گی۔"

"میں تمہارے بغیر بھی تو خوش نہیں رہوں گی۔" وہ بولتے ہوئے رو پڑی تھی۔

وہ اس لڑکی کو دکھ دینے اور رلانے کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اپنی وجہ سے روتا دیکھ کر اس کا دل تڑپ رہا تھا۔

"میں تمہارے بغیر کبھی خوش نہیں رہ سکوں گی سکندر! تمہارے ساتھ اگر میں دکھی بھی رہی ناں تب بھی تمہیں الزام نہیں دوں گی۔ پلیز مجھے اس طرح چھوڑ کر مت جاؤ۔"

"کیوں خود کو کانٹوں پر گھسیٹ رہی ہو؟ اپنی اچھی بھلی پر سکون زندگی کو کیوں ایک کڑے امتحان میں ڈالنا چاہتی ہو؟ تمہیں میرے ساتھ میں کانٹوں بھرے راستے کے سوا کچھ بھی نہیں ملے گا۔"

وہ اس کے سامنے کھڑی زار و قطار رو رہی تھی۔ وہ اس لڑکی کے آنسوؤں سے ہارنے لگا تھا۔ نہیں دیکھ سکتا' وہ اسے روتا ہوا۔ اب اس کے انکار میں شدت نہیں رہی تھی۔ ایک ہار مان لینے والی کیفیت آ گئی تھی وہ جیسے اس لڑکی کے آگے ہتھیار ڈالنے لگا تھا۔

"چار دن نہیں گزریں گے تمہیں میرے ساتھ زندگی شروع کیے اور تم اپنے فیصلے پر پچھتانے لگو گی۔"

"یہ میری زندگی ہے ناں سکندر! میں اس کے ساتھ جو بھی کروں میری مرضی۔ میں پچھتاؤں گی یا دکھی ہوں گی' تمہیں اس سے کیا پرابلم ہے؟ اگر تمہیں لگتا ہے میں تمہارا ساتھ مانگ کر اپنی زندگی اجاڑ رہی ہوں تو اجاڑ لینے دو مجھے میری زندگی۔ ایسی آباد زندگی جس میں سکندر شہریار میرے ساتھ نہ ہو' میرے لیے سب سے اجاڑ اور سب سے ویران ہو گی۔ پلیز سکندر! مجھے اپنا ساتھ دے دو۔"

وہ روتے ہوئے بولی تھی۔ اس کے لفظوں میں ضد بھی تھی اور محبت کی شدت بھی۔ اور وہ ہار گیا تھا۔ وہ اس لڑکی کی محبت کی شدت کے سامنے پسپا ہو چکا تھا۔

"ٹھیک ہے لیزا! تمہاری ضد اور تمہاری خوشی کے آگے میں سرینڈر کرتا ہوں۔ میں ہار مان رہا ہوں لیزا محمود! بولو کب شادی کرنی ہے؟"

لیزا نے روتے روتے ناراضی سے اسے گھورا تھا۔

"ایسے پروپوز کرتے ہیں کسی خوب صورت لڑکی کو؟ جس سے محبت بھی ہو؟ اتنے فضول اور غیر رومانٹک انداز میں۔ گویا مجھ پر احسان کیا جا رہا ہو۔"

دھوپ چھاؤں کا بڑا دلکش منظر تھا۔ وہ بولتے ہوئے مسکرا رہی تھی اور اس کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔

"دیکھا میں نے کہا تھا ناں تم میرے ساتھ پچھتاؤ گی۔ دیکھ لو' میں کتنا ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مجھ سے اس نئے رشتے کے پہلے لمحے ہی میں تمہیں مجھ سے شکایت ہو گئی۔ ابھی بھی وقت ہے' سوچ لو۔"

وہ لیزا کو شریر نگاہوں سے دیکھتا ہوا چھیڑ رہا تھا۔ وہ بے اختیار جھینپ گئی۔ رخساروں سے رگڑ رگڑ کر فوراً" اپنے آنسو صاف کر ڈالے۔

"اچھا اچھا اب زیادہ فضول بولنے کی نہیں ہو رہی۔ یہ بتاؤ! ہم شادی کب کر رہے ہیں؟" وہ اپنی خفت مٹانے کو رعب سے بولی۔

"میں تمہارے آگے ہتھیار ڈال چکا ہوں۔ جب تم کہو' جہاں تم کہو' ہم وہاں شادی کر لیں گے۔" وہ مسکرا کر بولا تھا۔

ایک لمحے میں ایسا کیا ہوا تھا کہ وہ اسے استحقاق بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔ اس نے بے اختیار بہت مضبوطی سے اس کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

"میں پہلے سیم، نینی اور پاپا کو اپنے شادی کے فیصلے کا بتا دوں، پھر ہم شادی کی جگہ طے کرلیں گے۔ میری زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت سیم کی ہے۔ اسے میری شادی میں لازمی شریک ہونا چاہیے۔ میں ذرا اس سے یہ معلوم کرلوں کہ وہ کب آسکتی ہے، پھر تاریخ اور جگہ طے کرلیں گے۔ میری طرف سے دو مہمان ہوں گے سیم اور نینی۔ پاپا اگر آنا چاہیں گے تو آجائیں، مجھے ان کے آنے یا نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"اور یہ شادی ہوگی کہاں؟ لندن میں، روما میں یا دوہا میں؟"

"لندن، دوہا، روما کوئی بھی جگہ ہو، میرے لیے تو ہر جگہ ہی ٹھیک ہے۔" وہ اپنی خوشی چھپائے بنا فوراً" بولی تھی۔

"پھر میرا خیال ہے، روما ٹھیک رہے گا۔ رومن لڑکی سے شادی اس کے روما میں ہی کی جائے تو زیادہ مناسب رہے گا۔" وہ اس کے چہرے کو ایک ٹک دیکھتا ہوا مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

"صرف مناسب نہیں، بلکہ بڑا رومانٹک بھی رہے گا۔ ہم اپنا ہنی مون بھی روما میں ہی منائیں گے۔" وہ جیسے کھڑے کھڑے سارے پلان بنا رہی تھی۔

"ہنی مون؟ سینوریٹا لیزا! ان فضولیات کی تم مجھ سے امید مت رکھنا، تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں میں ذرا بھی رومانٹک نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے تم سے نکاح کے فوراً" بعد میں تمہیں گھر پر چھوڑ کر اپنے آفس چلا جاؤں یا آفس کا کچھ کام نکال کر بیٹھ جاؤں۔"

وہ جیسے اسے ڈرا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شرارتی مسکان بکھری تھی۔ جیسے ابھی بھی اسے اس کے فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ابھی بھی وقت ہے، تم سوچ لو۔"

"میں نے سوچ لیا ہے سینور سکندر! میں تم ہی سے شادی کروں گی۔ وقت کے ساتھ ہر کسی میں تبدیلی آجاتی ہے اور پھر محبت میں بہت طاقت ہے، یہ سب کچھ بدل کر رکھ سکتی ہے۔" وہ سکندر کی چھیڑ چھاڑ کے جواب میں بے حد سنجیدگی سے بولی۔

"یعنی تم میرے لیے خود کو بدل لو گی؟ اپنی رومانٹک سوچوں اور خواہشات کی میری خاطر قربانی دے دو گی؟"

"نہیں، تم میرے لیے خود کو بدل لو گے سکندر شہریار! ہماری شادی شدہ زندگی میں اگر کوئی تبدیل ہوگا تو وہ تم ہوگے۔"

وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ اس کی فلائٹ کی اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔ اسے ہنستا دیکھ کر لیزا بھی مسکرائی تھی۔

"مائی برائڈ ٹو بی! آپ بہت رومانٹک ہیں اور خواب بہت دیکھتی ہیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اسے لیزا کی آنکھوں میں اپنا ہی عکس نظر آرہا تھا۔

"میں تمہیں بھی خواب دیکھنا سکھا دوں گی مائی گروم ٹو بی!" وہ اس کی سی ٹون میں بولی تھی۔

"چلوں میں؟" وہ اس کے چہرے کو پیار سے دیکھتا ہوا بولا۔ لیزا نے جواباً" سرہلایا۔

"سنڈے کو میری ایگزیبیشن کا آخری دن ہے۔ میں بھی پیر کو لندن واپس چلی جاؤں گی۔ تم میرے پاس لندن آؤ گے؟"

"تم جہاں کہو گی میں وہاں آؤں گا۔"

"اب کی بار ملو گے تو میرے لیے رنگ لے کر آنا۔ ایسے کوئی پروپوز کرتا ہے بغیر رنگ کے؟"

"میں لے کر آؤں گا پرامس۔" وہ مسکرا کر بولا تھا اور اسے پتا تھا۔ دوہا جاتے ہی وہ سب سے پہلا کام اس کے لیے انگوٹھی خریدنے ہی کا کرے گا۔

☆ ☆ ☆

اس بار اس کے دور جانے پر وہ بالکل بھی اداس نہ تھی۔ اس بار یہ زمینی فاصلہ جو ان کے بیچ حائل ہوا تھا، وقتی تھا۔ سکندر کو ایئرپورٹ چھوڑنے کے بعد اگلا کام اس نے سیم کو فون کرنے کا کیا تھا۔

"سیم، سیم، سیم! میں بہت خوش ہوں سیم!" اس کے فون اٹھاتے ہی اس نے کہا تھا۔

"اور میں تمہاری خوشی سے بھرپور آواز سن کر بہت خوش ہوں لز۔"

"وجہ گیس کرو میری خوشی کی؟"

"تمہارا شو تمہاری امیدوں سے زیادہ کامیاب ہو گیا ہے، ہے نا؟" اس نے سیم کی مسکراتی آواز سنی۔

"جی نہیں اس سے بھی بڑی بات ہے۔ بہت بڑی بات ہے سیم!" اس نے پل بھر کا ڈرامائی سا وقفہ دیا پھر خوشی سے کھنکتی آواز میں بولی۔

"میں شادی کر رہی ہوں سیم!"

"واقعی لز؟ کس سے؟ کون ہے وہ؟"

"وہی جو مجھے روما میں ملا تھا، پھر بچھڑ گیا تھا۔ وہ مجھے پھر مل گیا ہے سیم! اب کی بار کبھی بھی نہ بچھڑنے کے لیے۔ جس طرح میں اس سے محبت کرنے لگی تھی، وہ بھی کرنے لگا تھا۔ وہ مجھے تلاش کرتا یہاں فلورنس تک آگیا تھا۔ کتنی رومانٹک بات ہے نا یہ سیم!"

وہ خوشی سے کھلکھلا رہی تھی۔ اسے جواب میں دوسری طرف مکمل خاموشی سنائی دی تھی۔

"سیم! کیا ہوا؟ تم چپ کیوں ہو گئیں؟"

"لز! میں کیا بولوں؟ تم ایک پاکستانی مرد سے شادی کر لینے کا فیصلہ کر کے اس قدر خوش ہو رہی ہو۔ میں کیا بولوں؟"

سیم کی بہت سنجیدہ آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ اپنی بے تحاشا خوشی میں سیم کی اس درجہ سنجیدگی نے اسے بھی پل بھر میں ہی بالکل سنجیدہ کر دیا تھا۔

"وہ جو ہے جیسا ہے، جس ملک سے ہے، میں اس سے محبت کرتی ہوں سیم! میں اس کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتی۔"

"جب تم فیصلہ کر ہی چکی ہو تو اب میں کیا کہوں؟" سیم کا لہجہ بہت سنجیدہ اور بہت دکھ بھرا تھا۔ جیسے وہ اپنی زندگی تباہ و برباد کرنے کا فیصلہ کر بیٹھی تھی اور سیم چاہتے ہوئے بھی اسے اس فیصلے سے روک نہیں پا رہی تھی۔

"تم نے پاپا کو بتایا اس بارے میں؟" چند سیکنڈز کی خاموشی کے بعد سیم نے اس سے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

سیم اتنی سنجیدہ تھی جیسے اس نے اسے اپنی موت کی اطلاع دے دی ہو۔

"ابھی نہیں بتایا۔ میں یہ خوشی سب سے پہلے تمہارے ساتھ شیئر کرنا چاہتی تھی سیم!"

وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی تھی۔ اس کے لہجے میں ایک شکوہ بھی چھپا تھا، بہن کے لیے کہ وہ اس کی زندگی کی اس اتنی بڑی خوشی کے موقع پر پاکستانی مردوں سے متعلق وہ قصہ کیوں شروع کر بیٹھی تھی۔

"لز! میں تمہیں ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ تم ان پاکستانی مردوں کو نہیں جانتی ہو۔ محبت سب کچھ نہیں ہوتی لز پلیز سمجھو۔" سیم اس کی اداسی اور خفگی محسوس کر کے بہت پیار سے بولی تھی۔

"سیم! میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میرے لیے یہ محبت ہی سب کچھ ہے۔"

وہ رندھے لہجے میں بولی تھی۔ سیم کی سنجیدگی نے اسے اداس کر دیا تھا۔ سیم سے اسے جتنا پیار تھا اس کی خواہش تھی کہ سیم اس کی زندگی کی اس خوشی میں پورے دل سے خوش ہو۔ وہ سیم کو خفا کر کے اگر شادی کر لیتی تو بہت اداس رہتی۔ وہ سیم کو خفا کرنے کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔

"پلیز سیم! کیا تم میری خاطر اس رشتے پر خوش نہیں ہو سکتیں؟ اگر تم خوش نہیں ہو، میں، تم میری شادی پر نہ ہوئیں تو میں پورے دل سے خوش نہیں ہو پاؤں گی۔" اس کی آنکھوں میں نمی چھلک آئی تھی۔

"کس نے کہا، میں نہیں آؤں گی۔ میں صرف تمہیں سمجھا رہی تھی لز! لیکن اگر تم اس رشتے پر خوش ہو، یہیں شادی کرنا چاہتی ہو تو میں بھی خوش ہوں۔ میری گڑیا سی بہن دلہن بنے گی تو کیا میں اس کے پاس نہیں ہوں گی؟ یہ بتاؤ کب کر رہے ہو تم دونوں شادی؟"

اس کی اداسی اور آنسو محسوس کر کے سیم فوراً" ہی

محبت بھرے لہجے میں بولی تھی۔

"میں تمہیں ایک 'دو دن میں فون کر کے بتاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے اور یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا لڑکی کہ میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔"

"میں بھی تم سے بہت پیار کرتی ہوں سیم!"

سیم کی محبت کے جواب میں وہ بھی بہت والہانہ پن سے بولی تھی۔ وہ فون رکھ کر چپ چاپ بیٹھی تھی۔ سیم جب سکندر سے ملے گی تو اسے اندازہ ہوگا کہ تمام پاکستانی مولوی نہیں ہوتے۔ اگر ان کے پاپا اور ہاشم بھی ثابت ہوئے ہیں تو یہ کوئی فارمولا تو نہیں کہ تمام پاکستانی مولوی ہی ہوں گے۔ وہ سیم کی اس سوچ کو ڈیل کرنا چاہتی تھی۔ اسے پورا یقین تھا' سیم کو سکندر بہت پسند آئے گا۔ وہ تھا ہی اتنا اچھا۔ وہ کسی کو بھی ناپسند ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

دوسری کال وہ نینی کو کر رہی تھی۔ وہ نینی کے گلے لگ کر سکندر کو کھو دینے پر اتنا روئی تھی' آج انہیں بتانا چاہتی تھی کہ جسے اس نے کھو دیا تھا۔ وہ اسے پھر مل گیا ہے۔

"نینی! میں اور سکندر شادی کر رہے ہیں۔" سلام کے بعد اس نے اگلی بات انہیں یہی بتائی تھی۔ نینی خوش بھی ہو رہی تھیں اور بہت حیران بھی۔ اسے آرٹ گیلری اپنے شو میں پہنچنا تھا' اس لیے مختصر لفظوں میں اس نے جلدی جلدی نینی کو ساری بات بتائی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات وہ اپنے فلیٹ میں تھا۔ وہی فلیٹ' وہی الجھی بکھری زندگی' وہی فلیٹ میں تنہائی اور خاموشی مگر پھر بھی اسے ہر طرف رونق ہی رونق محسوس ہو رہی تھی۔ کل رات اس کا جی چاہا تھا وہ روتا ہوا' اپنے بال نوچتا جنگلوں سے نکل جائے اور آج وہ بے وجہ مسکرائے جا رہا تھا۔ اسے زندگی اچھی لگ رہی تھی' اسے اپنا آپ اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اپنے سامنے وہی منی ایچر مجسمہ رکھے ہوئے بیٹھا تھا' جو آج صبح لیزا نے اسے دیا تھا۔ اس کا بنایا کارڈ بھی اس نے اپنے سامنے کھول کر رکھا ہوا تھا۔

وہ ان چیزوں کو دیکھتا لیزا کو یاد کر کے مسکرا رہا تھا۔ پاس رکھا موبائل بجا تھا۔ لیزا کال کر رہی تھی۔ اس نے لپک کر فوراً" فون اٹھایا تھا۔

"لیزا۔" اتنے حق کے ساتھ اس کا نام لینا کتنا اچھا لگ رہا تھا' کس قدر دل نشیں۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"کیا کر رہے تھے؟"

"سونے جا رہا تھا۔" وہ اسے چڑانے کو بولا تھا۔

"تم مجھ سے بات کیے بغیر سو جاتے۔ وہاں پہنچنے کے بعد اتنی توفیق تو تمہیں ہوئی نہیں کہ ایک فون کال ہی اپنی خیریت بتانے کی کر دیتے اور ابھی بھی مجھ سے بات کیے بغیر سونے جا رہے تھے۔" وہ لڑنے والے انداز میں بولی تھی۔

"شکایت نمبر دو' چودہ گھنٹوں میں اب تک تمہیں مجھ سے دو شکایتیں ہو چکی ہیں سینوریتا!" وہ ہنس کر بولا۔

"مجھے ایک دن میں ایک ہزار شکایتیں ہوں گی مگر میں تمہارا پیچھا تب بھی نہیں چھوڑوں گی۔ ان فیکٹ مجھ سے چھٹکارا اب تمہیں زندگی بھر نہیں ملے گا۔" وہ دھونس جمانے والے انداز میں بولی۔

"ٹھیک ہے' مت چھوڑنا میرا پیچھا مگر ابھی تو مجھے سونے دو۔ چھٹیاں تمہاری ہیں۔ یہاں رات خاصی ہو چکی ہے اور میں نے صبح آفس جانا ہے۔" وہ اس سے بات کرتا ہوا صوفے پر لیٹ گیا تھا۔ اس کے لبوں پر پیہم مسکراہٹ تھی۔ سچی مسکراہٹ۔۔۔ اس پل اسے دنیا کی کوئی چیز بری نہیں لگ رہی تھی۔ اسے زندگی بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اس کا زندہ رہنے کو دل چاہ رہا تھا۔ اس کا خدا سے اپنی لمبی عمر کی دعا مانگنے کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ ابھی ملی تھی' ابھی ابھی۔ وہ اس کے ساتھ ایک بہت طویل عمر گزارنا چاہتا تھا۔

"بڑے بدتمیز اور بے مروت ہو تم سکندر شہریار!" وہ اس کی سونے والی بات کے جواب میں مصنوعی خفگی سے بولی تھی۔

"شکایت نمبر تین۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ وہ جواباً" چڑچڑے انداز میں فوراً" بولی تھی۔

"سو جاؤ نان رومانٹک انسان!" وہ مسلسل ہنس رہا تھا۔ اس بار اسے لیزا کی بھی ہنسی سنائی دی تھی۔

"کچھ اچھی بات ہی بول دو۔ جسے سوچ کر میں ساری رات خوش ہوتی رہوں۔"

"بیلا! میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ گو تمہارے معیار کے مطابق رومانٹک نہیں ہوں۔ جیسا تم توقع رکھتی ہو' اس طرح کا اظہار محبت شاید میں کبھی بھی نہ کر پاؤں مگر میرے دل میں ہر طرف تم ہی تم ہو۔ پلیز جلدی سے آجاؤ میری زندگی میں۔ میں تمہارے ساتھ ہنسنا چاہتا ہوں' میں تمہارے ساتھ خوش ہونا چاہتا ہوں' میں تمہارے ساتھ زندگی کو محسوس کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ آنکھیں بند کر کے اس سے بول رہا تھا۔ اپنے دل کی تمام تر سچائیوں اور گہرائیوں کے ساتھ۔

"تم صبح مجھے فون کرو گی؟" اس نے آنکھیں بند کیے کیے آہستگی سے پوچھا تھا۔ وہ اپنی صبح بھی اسی کی آواز سن کر کرنا چاہ رہا تھا۔

"ہر بار میں فون کیوں کروں۔ تم فون کرنا۔"

"نہیں پلیز' تم کرنا لیزا! میں چاہتا ہوں صبح میری آنکھ تمہاری آواز سن کر کھلے۔" وہ بہت آہستہ آواز میں بولا تھا۔ اس بار جیسے اس کے چہرے پر موجود اور دل میں چھپے تمام جذبات اس تک پہنچ گئے تھے۔ وہ بھی آہستہ آواز میں نرمی سے بولی تھی۔

"میں صبح تمہیں فون کروں گی سکندر!"

"میرا دل چاہ رہا ہے' تم اس وقت میرے پاس ہوتیں۔ میں تم سے کہتا' مجھے اپنے پاس چھپا لو۔ مجھے اپنے پاس لٹا کر بہت گہری نیند سلا دو۔ میں برسوں سے سویا نہیں ہوں۔"

وہ اس کی اتنی اپنی تھی کہ اپنا آپ اس پر عیاں کرتے ہوئے اسے کوئی شرمندگی نہیں ہو رہی تھی۔

"میں تمہارے سارے دکھ سمیٹ لوں گی سکندر!"

وہ آنکھیں بند کیے اس کی نرم آواز سن رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ لیزا کے شانے پر سر رکھ کر اپنے اندر کے برسوں سے جمے سب آنسو بہا ڈالے۔ اپنا ہر غم اس سے کہہ دے۔ اسے بتائے کہ دنیا نے' لوگوں نے' رشتوں نے اسے کتنے دکھ دیے ہیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

صباحت یاسمین

سراب

"تم مہوش کو انکار نہیں کر سکتے علی عباس؟"
ملک عباس اطہر نے بند آنکھوں کے ساتھ علی عباس سے پوچھا۔ وہ ان ہی کے بلاوے پر ان کے کمرے میں آیا تھا۔

ملک عباس اطہر باغ میں کھلنے والی کھڑکی کے پاس رکھی آرام کرسی پر آنکھیں بند کیے جھول رہے تھے۔ آنکھیں بند ہونے کے باوجود انہیں یقین تھا کہ علی عباس تعظیماً" کمر پہ ہاتھ باندھے کھڑا ہو گا۔

وہ ان کے نفیس مجسمے کو بنا پلک جھپکے دیکھ رہا تھا۔ اس سے اوپر اس کی نظریں جا ہی نہیں سکتی تھیں۔ انہوں نے سوال ضرور کیا تھا مگر انہیں جواب درکار نہیں تھا' کیونکہ وہ سائل نہیں تھے۔ یہ سوال تو محض ایک طریقہ تھا' جس کے ذریعے انہوں نے اپنا مدعا علی عباس تک پہنچایا تھا۔

مکمل ناول
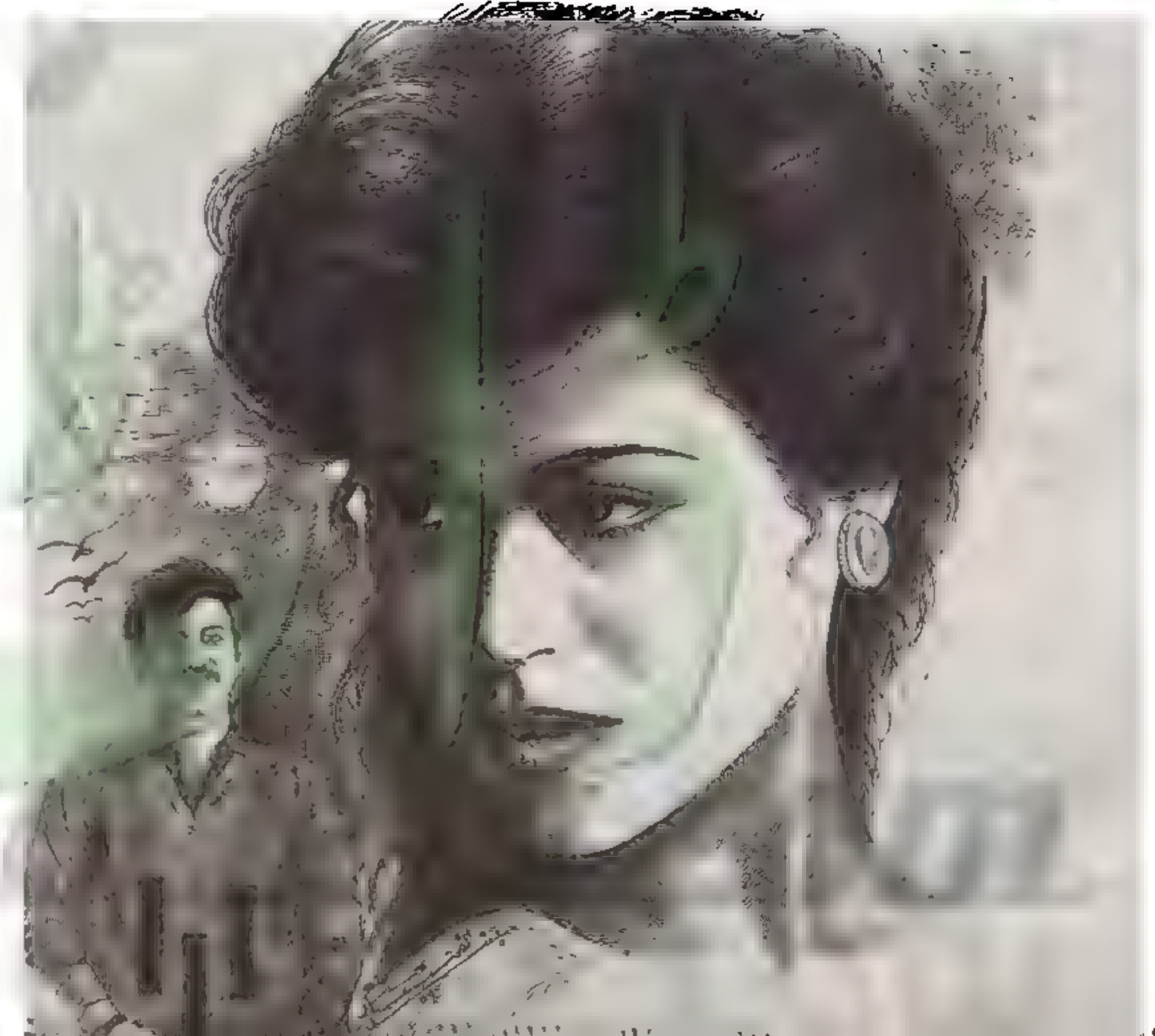
باغ سے چڑیوں کے چہچہانے کی آواز آرہی تھی۔ وہ آغاز صبح کی اپنی عادت حمد و ثناء نبھا رہی تھیں۔ علی عباس بھی اپنی عادت نبھا رہا تھا۔ یہ اس نے خود ہی اپنی عادات میں شامل کرلیا تھا۔ ان کی بات مکمل ہونے کے بعد بھی کچھ دیر تک ان کے پاس ٹھہرے رہنا' مبادا کوئی بات تاخیر سے یاد آنے کی بنا پہ انہیں دوبارہ پکارنا نہ پڑجائے۔

وہ اس کے محسن تھے۔ علی عباس ان کا مقروض تھا اور وہ ایسے قرض خواہ کہ کبھی اپنا قرض یاد بھی نہ دلایا تھا' مگر آج انہیں مہوش ملک واپس چاہیے تھی۔ وہ مہوش' جو علی عباس کی زندگی کا آغاز بھی تھی اور اختتام بھی۔ اس کی زندگی نقطہ اختتام تک لے لینا چاہتے تھے۔

علی عباس کی آنکھیں جلنے لگیں۔ سعادت مندی کے شفاف پانی نے جلن کم کرنے کی غرض سے فوراً خود کو پیش کردیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"علی عباس!" ناشتے کی میز پر اسے غیر حاضر پاکر ملک عباس اطہر نے سوالیہ نظروں سے اللہ بخش کی طرف دیکھا۔ مہوش بھی چونک گئی۔ وہ تو یہی سمجھ رہی تھی وہ ملک صاحب کے کسی کام سے گیا ہوگا مگر ملک صاحب کی لاعلمی نے اسے متفکر کردیا۔

"ناسازی طبع کا بتا رہے تھے۔" اللہ بخش نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

"کیا ہوا؟ ڈاکٹر کو بلایا؟ کچھ کھایا اس نے؟"

مہوش کے چہرے پر یکدم پریشانی طاری ہوگئی۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا توس جو اس نے ذرا سا ہی کترا تھا' اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پلیٹ میں گر پڑا۔

ملک عباس نے کن اکھیوں سے مہوش کی جانب دیکھا۔ اللہ بخش جوان کا اداشناس تھا' سمجھ گیا کہ اسے خاموش رہنا ہے۔

"سر میں درد تھا اس کے۔ میرا خیال ہے بعد میں ناشتا کرے گا۔" انہوں نے سرسری سے انداز میں کہا۔

"وومٹنگ تو نہیں ہوئی نا اسے؟" مہوش نے اللہ بخش سے پوچھا۔ اس کے روم روم سے پریشانی ہویدا تھی۔

"لالا! اس کا سر درد بہت شدید قسم کا ہوتا ہے۔ اکثر قے ہوجاتی ہے اور چکر بھی بہت آتے ہیں۔" وہ ملک عباس کو بتا رہی تھی۔

"ہوں!" انہوں نے محض اس لیے اتنی سی آواز نکالی کہ باور کرواسکیں کہ وہ اس کی بات سن چکے ہیں اور ایک دفعہ پھر کن اکھیوں سے مہوش ملک کی طرف دیکھا۔ اس کی حرکات و سکنات سے واضح ہو رہا تھا کہ ان کے اٹھتے ہی وہ علی عباس کے کمرے کی طرف دوڑ لگادے گی۔

انہوں نے بے بس نگاہوں سے اللہ بخش کی طرف دیکھا گویا کہہ رہے ہوں۔ "دیکھ رہے ہو نا اللہ بخش!" اور اللہ بخش بس ایک نظر مہوش بی بی کو دیکھ کر رہ گیا' جو کبھی گلاس میں پانی ڈالتی' کبھی اخبار ہاتھ میں لے لیتی' کبھی توس کا پیس لے کر ذرا سا کتر لیتی اور ساتھ ہی ساتھ وہ اضطراری انداز میں بار بار علی عباس کے کمرے کے بند دروازے کو بے چینی سے دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

جوں ہی ملک عباس اطہر نے لاؤنج کا دروازہ عبور کیا وہ بھاگتی ہوئی دوسری منزل پر جاتی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

علی عباس قالین پہ سر زانوں میں دیے بیٹھا تھا۔

جانے پہچانے قدموں کی چاپ اس کی دھڑکنوں کو منتشر کرنے لگی۔ وہ سانس روکے بند دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔

اس کا کمرہ سیڑھیوں کے بالکل سامنے تھا۔ مہوش دروازے کے پاس آکر رک گئی۔ اس نے نرمی سے دروازے کو دھکیلا' مگر وہ ہلا نہیں۔ گویا اس نے چٹخنی چڑھا رکھی تھی۔ مہوش نے ہاتھ بڑھا کر دستک دینا چاہی' مگر پھر رک گئی۔

"شاید وہ سو رہا ہو۔" اس کے دل میں خیال آیا۔

"میری نیند کو تمہارے خوابوں کی عادت ہے۔ تم نہیں ہوگی تو کیسے سوؤں گا؟"

علی عباس نے اس کے دل میں ابھرنے والے خیال کا بے آواز جواب دیا اور دو آنسو ٹوٹ کر اس کے گالوں پہ لڑھک آئے۔

مہوش ملک واپس پلٹ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

شام ڈھل چکی تھی۔ پرندے اپنے گھونسلوں کو لوٹ رہے تھے۔ وہ سست روی سے لان میں ٹہل رہی تھی۔ لاؤنج کی لان میں کھلنے والی کھڑکی وہ کھلی چھوڑ کر آئی تھی۔ اس کھلی کھڑکی سے اوپری منزل پہ موجود علی عباس کے کمرے کا بند دروازہ نظر آرہا تھا۔ یہ دروازہ صبح سے نہیں کھلا تھا۔ اس کا موبائل بھی بند تھا۔ اتنا تو وہ جان چکی تھی کہ وہ بیمار نہیں ہے۔

علی عباس کے پاس موجود ترازو کے ایک جانب مہوش ملک تھی اور دوسری جانب چاہے پوری کائنات ہوتی' مہوش ملک والا پلڑا اوپر اٹھنا ہی نہ تھا۔ اوپر اٹھ بھی جاتا تو اپنا ہی وزن نہ سہار پاتا اور ٹوٹ کر زمین پہ آ رہتا۔

فضا میں خنکی کا احساس بڑھ گیا تھا۔ مہوش نے ایک افسردہ سی نظر گرد و نواح پہ دوڑائی۔ وسیع و عریض لان میں سناٹا تھا۔ مین گیٹ کے پاس یقیناً" چوکیدار موجود ہوگا۔ پچھلی جانب موجود کمروں سے ملحقہ باغ میں چھوماں بی اپنے ماتحتوں کی فوج کے ساتھ دھلی ہوئی گندم کے ڈھیر کو ٹھکانے لگا رہی ہوں گی۔ سارے میں پھیلی پکوان کی اشتہا انگیز خوشبو اس بات کی شاہد تھی کہ کچن کی رونقیں بھی عروج پہ تھیں مگر اس کے اندر خاموشی نے بسیرا کر رکھا تھا۔ اس نے ایک نظر لاؤنج کی کھلی کھڑکی سے دکھائی دیتے بند دروازے پر ڈالی اور تھکے تھکے قدموں سے چلتے ہوئے بید کی کرسیوں کے قریب آگئی۔ علی عباس کو یہ کرسیاں پسند تھیں۔ مہوش نے اسی لیے یہاں رکھوائی تھیں۔ وہ کرسی کی پشت اور بازو پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے زمین پہ بیٹھ گئی۔ سبز گھاس کی ہموار سی تہہ اس کے وجود کے ساتھ ٹکرائی تو اس کا ہاتھ غیر شعوری طور پہ نرم نرم سی گھاس کے سبز قالین پہ آرکا۔ یہ گھاس علی عباس نے اس کی پسند پر لگوائی تھی۔

"علی عباس!" اس کے منہ سے اس کا نام ایک سسکی کی صورت برآمد ہوا اور اس کی نظریں پھر سے بند دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ علی عباس کے کمرے کی کلر اسکیم اس کی پسند کی تھی۔ کمرے کی سیٹنگ بھی اس نے اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔ وہ ہاتھ بڑھا کر اپنی پشت پہ موجود چوٹی کو آگے کی طرف لے آئی۔ کتنے ہی جتن کیے تھے اس نے بالوں کو اتنا بڑھانے کے لیے۔ علی عباس سرتاپا "مہوش ملک" تھا اور مہوش ملک کو اپنے بالوں کی لمبائی سے لے کر لباس کے رنگوں تک خود میں "علی عباس" دکھتا تھا۔ جذبے تو اتنے شفاف تھے کہ ان کی صداقت پہ رشک آتا' پھر کیوں مستقبل کے نقوش اتنے بگڑے ہوئے نظر آرہے تھے؟ پھر کیوں حال اتنے کڑے تیوروں کے ساتھ ان کا ضبط آزمانے پہ کمربستہ ہوگیا تھا؟

اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے مگر کوئی تمنا کوئی آرزو لفظ بن کر لبوں تک نہ آئی۔ کچھ دیر وہ خالی خالی نظروں سے اپنی ہتھیلیوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے سر اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا مگر اوپر نیلے امبر کا مہربان سایہ نہ تھا بلکہ سیمنٹ پتھر سے بنی چھت تھی جو نہ اس کی بے بسی کو محسوس کر سکتی تھی نہ اسے کوئی شفقت بھرا احساس فراہم کر سکتی تھی۔ اس نے ایک دفعہ پھر اپنی ہتھیلیوں کی طرف دیکھا اور لب چباتے ہوئے ہاتھوں کو منہ پر پھیر دیا۔

اس نے جائے نماز تہہ کرتے ہوئے دیوار پہ لگی گھڑی کی طرف دیکھا۔ بے جان بے حس سوئیاں سات سے کچھ ہی آگے کا وقت دکھا رہی تھیں۔ گویا سر پہ ایک طویل ترین رات باقی تھی۔ اس کی جان کنی سی تکلیف کی شاہد بننے کو۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا سوئچ بورڈ کی طرف آیا اور اس نے زیرو پاور کا وہ بلب آف کر دیا جو عشاء کی نماز ادا کرنے کے لیے جلایا تھا۔ سائیڈ ٹیبل کے قریب جھک کر اس نے دراز سے اپنا موبائل نکالا اور اسے ہاتھ میں لے کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ موبائل کا پچھلا حصہ کھول کر اس نے سم نکال کر باہر رکھی اور پھر موبائل آن کر لیا۔ وال پیپر پہ لگی مہوش کی تصویر نے ہمیشہ کی طرح اس کی آنکھوں کو باندھ لیا تھا۔ وہ یک ٹک بے تحاشا ہنستی ہوئی مہوش کے کلوز اپ کو تکے جا رہا تھا۔ یکدم ہی اس کی آنکھوں کے سامنے ایک منظر اسکرین کی طرح آن موجود ہوا تھا۔ وہ لان میں پودوں کے مردہ پتوں کی کانٹ چھانٹ کرتے ہوئے نہ جانے کس بات پہ بے تحاشا ہنس رہی تھی۔

"اتنا مت ہنسا کرو مہوش!" شاید وہ اس کی کسی بات کو مذاق بنا کر انجوائے کر رہی تھی جو علی عباس کے لیے خفگی کا باعث بن گیا تھا۔

"کیوں نہ ہنسوں؟" اس نے نچلا لب دانتوں تلے دبا کر بمشکل اپنی ہنسی روک کر پوچھا۔

"کیونکہ زیادہ ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔" علی عباس نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا۔

"بہت پیاری ہے تمہیں اپنے گھر کی زندگی؟" وہ مسکرائی۔

"ہاں اور میرے گھر کو ہمیشہ زندہ دل دکھنا ہو گا۔" علی عباس کے لہجے میں خود بخود مٹھاس در آئی۔

علی عباس نے آنکھیں موند لیں اور بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگالی۔

"کاش! اس روز میں ٹرین کے نیچے آگیا ہوتا۔ کاش! میں جان کنی کے عذاب سے بہت پہلے گزر چکا ہوتا۔ کاش ... کاش!" ایک حسرت نے بے آواز اپنے ناتمام رہ جانے پہ اظہار تاسف کیا تھا اور ایک منظر اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ علی عباس کی بند آنکھوں کے سامنے روشن ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

چودہ پندرہ سال کا وہ نو عمر لڑکا مسلسل بھاگتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چڑچڑا پن تھا۔ ہونٹ خشک تھے اور ناک پہ بے تحاشا غصہ دھرا تھا۔ ناہموار سی چال چلتا' الٹے سیدھے قدم اٹھاتا وہ راستے میں کئی بار گرا تھا۔ اس کے گالوں' بازوؤں اور ہاتھوں پہ کئی خراشیں تھیں۔ سرمئی رنگ کا اس کا ٹراؤزر دائیں گھٹنے کے پاس سے پھٹ چکا تھا اور اس میں سے چھلا ہوا گھٹنا جھانک رہا تھا۔ پیاس سے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ بھاگتے بھاگتے جب وہ ہانپنے لگتا تو اپنی رفتار کم کر لیتا اور جب بہت بے بس ہو جاتا تو گھڑی دو گھڑی دم لینے کو رک بھی جاتا' مگر پھر جلد ہی دوبارہ بھاگنا شروع ہو جاتا۔ اس کا ایک جوتا قریب قریب بالکل ٹوٹ چکا تھا۔ نقاہت کے شدید ترین احساس کے ساتھ اسے چکر آیا۔ اس نے ہوا میں ہاتھ ادھر ادھر چلاتے ہوئے کسی چیز کا سہارا لینا چاہا' مگر اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا اور وہ زمین پہ آرہا۔ چند لمحے بے حس و حرکت پڑے رہنے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو خود کو ایک پتھریلی زمین پہ پایا اور شاید اس کے نیچے لوہے کی کوئی سلاخ پڑی تھی۔

ذرا حواس بحال ہونے پر اس نے گرد و نواح میں نظر دوڑائی تو اسے احساس ہوا کہ وہ ریل کی پٹری پہ

چت لیٹا تھا۔ پٹری کے دونوں جانب سرسبز لہلہاتے کھیت تھے۔ اس نے ایک بھرپور نگاہ ارد گرد دوڑائی۔ گویا وہ خاطر خواہ فاصلہ طے کر چکا تھا۔ اچانک ہی ایک نامانوس اور بے ہنگم سا شور ابھرنا شروع ہوا اور مسلسل بڑھنے لگا۔ ٹرین آرہی تھی۔ دور سے وہ کسی کھلونا ٹرین سے بھی چھوٹی لگ رہی تھی مگر جوں جوں وہ آگے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ شور بھی بڑھتا جا رہا تھا اور اس کی جسامت بھی۔ اسے کسی کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا سفید لٹھے کا کرتا پہنے سر پہ شملہ سجائے تیس بتیس سال کا ایک بارعب سا شخص تمکنت سے چلتا ہوا آرہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے دو عمر رسیدہ سے افراد خاصے مودب انداز میں چل رہے تھے۔ اس نے حرکت کی اور پٹری کے عین درمیان آکھڑا ہوا۔ خوف کی شدت سے اس کی ٹانگیں لرزنا شروع ہو گئیں۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ٹرین کا شور لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اچانک اسے اپنی کلائی پر کسی کی گرفت محسوس ہوئی' شاید ملک الموت! اسے جھرجھری سی آئی اور یوں محسوس ہوا اس کا جسم ہوا میں اچھلا ہو۔ وہ کوشش کے باوجود آنکھیں نہ کھول سکا۔ ماتھے پر کسی چیز کے چبھنے کا احساس ہوا اور اس کا ذہن مکمل طور پر تاریکی میں ڈوب گیا۔

"شکر ہے۔" سانس روک کر کھڑے اللہ بخش اور ملک عباس اطہر نے بیک وقت کہا۔ وہ ان کے قدموں کے قریب آکر گرا تھا۔ ڈرائیور مقبول کی بھی جان میں جان آئی۔ وہ بڑی مشکل سے اپنا توازن برقرار رکھ پایا تھا۔ ورنہ اس نوجوان کو بچانے کی کوشش میں وہ خود پٹری پہ گر جاتا۔

"ملک صاحب! بچہ بے ہوش ہو گیا ہے۔" اس پہ جھکے ہوئے اللہ بخش نے ملک عباس اطہر کو اطلاع دی۔

"اللہ رحم کرے' مقبول! تم اسے گاڑی میں ڈالو۔ اللہ بخش! ڈاکٹر کو حویلی ہی بلوالو۔" ملک عباس انہیں ہدایات دیتے ہوئے جیپ کی طرف بڑھ گئے۔

☆ ☆ ☆

اس نے ذرا سی آنکھیں کھولیں مگر کافی عرصہ تاریکی میں رہنے کے بعد اس کی آنکھوں نے اتنی ساری روشنی دیکھی تو چندھیا سی گئیں' لیکن کسی غیر معمولی احساس نے اسے فوراً" ہی دوبارہ آنکھیں کھولنے پہ مجبور کر دیا۔ پہلی نظر اس کی جس چیز پہ پڑی' وہ کریم کلر کے پینٹ والی دیوار پہ لگی دیدہ زیب وال کلاک تھی۔ اس نے فوراً" سے پیشتر گردن موڑ کر دائیں جانب دیکھا۔ اس دیوار پہ غروب آفتاب کا منظر ایک سینری کی صورت موجود تھا۔

بائیں جانب کی دیوار میں الماری نما بک شیلف بنی تھی جس میں بہت قرینے سے کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ اس بک شیلف سے چند قدم آگے ایک دروازہ موجود تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر بیڈ سے نیچے اترا۔ پائنتی کے پاس اس کے پاؤں کے سائز کی چپل دھری تھی۔ اس نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر پاؤں میں گھسیٹ کر دروازے کی جانب آگیا۔ ذرا سا دھکیلنے سے ہی دروازہ کھل گیا تھا۔ دروازہ شاید کسی اور مگر نسبتاً" بڑے کمرے میں کھلا تھا۔ کیونکہ سامنے ہی بڑا سا ٹی وی سجا تھا جس کی سائیڈوں پہ صوفے رکھے تھے۔ یہ وسیع و عریض کمرہ بڑے اعلیٰ ذوق آرائش کا نمونہ لگ رہا تھا۔ اس میں تین چار کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔ اوپر کی طرف جاتی سیڑھیاں بھی موجود تھیں۔ وہ بیرونی دروازے کی جانب بڑھا۔ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ سنگ مرمر کا فرش اس دروازے کی سیدھ سے لے کر تقریباً" دس گز کے فاصلے پہ موجود ایک اور دروازے کی سیدھ تک تھا۔ اطراف میں سبز گھاس موجود تھی وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے لان میں آگیا۔ ذرا فاصلے پر موجود کین کی کرسیوں میں سے ایک پہ کوئی بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا اخبار پڑھتے شخص نے فوراً" اس کی طرف دیکھا اور اخبار میز پہ رکھ کر اس کی طرف آنے لگا۔

"کیسے ہو بیٹا؟" ملک عباس نے اپنائیت سے

پوچھا۔وہ اجنبی نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

"آؤ بیٹھو!" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کرسی کے قریب لے آئے۔

"درد تو نہیں ہو رہا اب؟" انہوں نے شفیق سے انداز میں پوچھا۔

"درد؟" اس نے زیرِلب دہرایا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔وہ کرسی پہ بیٹھ چکا تھا۔

"نام کیا ہے تمہارا؟"

"علی!" اس نے اپنی خراش زدہ انگلیوں کو دیکھتے ہوئے مدھم سی آواز میں جواب دیا۔

"اماں ابا سے لڑائی ہوگئی تھی؟"

ملک عباس کے سوال پہ علی نے بے تاثر نظروں سے ان کی جانب دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

"ابو نے ڈانٹا تھا بیٹا؟" وہ ایک بار پھر نرمی سے کرید رہے تھے۔اب کی بار اس نے ذرا غصیلی نگاہ سے ان کی جانب دیکھا اور کچھ کہنے کے لیے منہ بھی کھولا مگر پھر لب بھینچ لیے۔

کسی سے لڑائی ہوئی ہے یا کوئی پولیس کا معاملہ ہے تو بھی بتاؤ! بس حل ہو جائے گا مگر تم ہم سے کہو تو سہی۔"

ان کا میٹھا لہجہ علی کی چوٹیں سہلا رہا تھا مگر اس نے اب کی بار بھی کوئی جواب نہ دیا۔

"بیٹا! مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھ کر اپنے باپ کی جگہ

"......

ان کو اپنی بات ادھوری چھوڑنا پڑی کیونکہ اس نے آنکھیں میچ لی تھیں۔اس کے نتھنے پھول گئے تھے گویا اسے ان کی بات ناگوار گزر رہی ہو۔ملک عباس اطہر کے چہرے پر ایک تاریک سا سایہ لہرا گیا۔وہ بے اولاد تھے اور انہوں نے ازراہِ شفقت باپ کا حوالہ دیا تھا مگر علی کا سخت رد عمل انہیں فوراً جتلا گیا کہ اسے ان کی بات سخت بری لگی ہے۔انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرکے اس کی طرف دیکھا۔اس کے چہرے پہ شدید ناراضی کے سوا کچھ نہ تھا۔وہ بھی کھڑے ہوگئے۔

"میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو منگواتا ہوں۔" اب وہ ہلکے پھلکے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"اللہ بخش! کچھ کھانے کو بھجواؤ۔" انہوں نے باآوازِ بلند کسی کو پکارا۔علی اس وقت صرف یہ سوچ رہا تھا کہ ان کی آواز کتنی گرجدار اور کس قدر بارعب ہے۔

✡ ✡ ✡

"کچھ بتایا اس بچے نے اپنے متعلق؟" عباس اطہر کمر پہ ہاتھ باندھے اپنے مخصوص شاہانہ انداز میں چلتے ہوئے باغ کا جائزہ لے رہے تھے۔اللہ بخش بھی ان کے ہمراہ تھا۔باغ میں قطار در قطار مالٹے اور امرود کے ان گنت درخت لگے تھے۔ملک صاحب گاہے بگاہے اطراف میں لگے درختوں کے پکے پھل کی طرف ایک تنقیدی نگاہ ضرور ڈال لیتے۔ایک امرود کے درخت کے پاس رک کر اس کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے اللہ بخش سے سوال کیا۔

"نہیں صاحب! بڑا مزاج دار بچہ ہے۔"

"ہوں!" انہوں نے پرسوچ انداز میں کہا اور بولے۔"بچے کو کوئی مسئلہ ضرور ہے۔اپنی ذات کے متعلق کوئی بات نہیں کرتا نہ کرنے دیتا ہے۔"

"ملک صاحب! ایک چیز میں نے نوٹ کی ہے۔"

"ہاں ہاں! کہو۔" انہوں نے اللہ بخش کو گویا اجازت دی۔

"اگر صرف اس کی ذات تک بات کی جائے یعنی اس کی پسند ناپسند مزاج یا عادات کے متعلق تب تک وہ ٹھیک رہتا ہے لیکن اگر اس کے خاندان یا رشتوں ناطوں کے متعلق بازپرس کی جائے تو وہ چڑ جاتا ہے بلکہ شاید دکھی ہو جاتا ہے۔"

اللہ بخش کی بات نے ملک عباس کو سوچ میں ڈال دیا۔اس کی جہاں دیدہ نگاہوں نے اگر ایسی کوئی بات محسوس کی تھی تو اس کا حقیقت سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور رہو گا۔

"لیکن اس کے بارے میں جاننا بھی تو ضروری

ہے۔" وہ امرود کے درخت کو چھوڑ کر آگے کی طرف بڑھ گئے۔اللہ بخش نے ان کی بات پہ تائیدی انداز میں اثبات میں سر ہلایا مگر بولا کچھ نہیں۔

"مجھ سے تو خاصے فاصلے پہ رکھا ہے اس نے خود کو۔شاید اس کے ذہن نے میرے اور اپنے بیچ مالک اور نوکر کا رشتہ کھڑا لیا ہے۔تم ایسا کرو! اسے اعتماد میں لو یقیناً" تھوڑی سی کوشش سے ہمیں حقیقت کا علم ہو جائے گا۔" انہوں نے اللہ بخش کو ہدایت دی تو اس نے "جی بہتر" کہہ کر ان کو مطمئن کر دیا۔

✡ ✡ ✡

"بی بی! میں ترکاری بنا دوں؟" علی کو ملک صاحب کے ہاں قیام کے دوسرے روز ہی علم ہو گیا تھا کہ باورچن کو سب بی بی کہہ کر بلاتے ہیں۔سب کی دیکھا دیکھی اس نے بھی انہیں بی بی کہنا شروع کر دیا اور اب وہ کچن کے دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا ان سے مخاطب تھا۔

بی بی سلیب پہ ننھا سا میٹ بچھائے آٹے کی پرات اس پہ رکھے آٹا گوندھ رہی تھیں۔علی کی آواز پہ انہوں نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور بولیں۔

"نہ میرا بچہ! بی بی اتنی بوڑھی نہیں ہوئی ابھی کہ اپنے بچوں کو دھوپ کا کر نہ دے سکے۔" انہوں نے آٹا گوندھتے گوندھتے ہی جواب دیا۔وہ چالیس سے پچاس کے درمیان کی ایک تنومند مگر نہایت چاق و چوبند خاتون تھیں۔انگلش طرز کا یہ وسیع و عریض چم چم کرتا کچن اور اس میں چکراتی دل موہ لینے والی خوشبو میں ان کی پھرتی اور مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔

"بی بی! میں خالی رہ رہ کر بیزار ہو گیا ہوں۔" وہ دھیرے سے کہتا ہوا سلیب پہ آکر بیٹھ گیا۔

"تو بچے! باغ میں جایا کر۔پھلوں کو سنبھالنے میں سب کی مدد کر۔"

"مجھ سے نہیں ہوتا وہ کام۔" اس نے نروٹھے پن سے کہا۔

"اپنا گھر سمجھ کر رہ پھر ہو جائیں گے سب کام۔" وہ

اب گندھا ہوا آٹا ایک باؤل میں منتقل کر رہی تھیں۔

"میرا گھر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ نہ کوئی رشتہ نہ تعلق واسطہ خوامخواہ ہی اپنا گھر سمجھوں۔"

"پتر! کہنے کو تو میرا بھی کوئی رشتہ نہیں اس گھر سے۔چھوماں بی اللہ بخش اور مقبول کا بھی نہیں مگر ہم بہن بھائیوں کی طرح رہتے ہیں اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر۔"

"چھوماں بی؟" ایک نامانوس سا نام سوال بن کر اس کے لبوں پہ اٹک گیا۔

"سب کام کاج کی دیکھ ریکھ وہی کرتی ہیں۔یوں سمجھو! منتظم ہیں گھر کی۔ہم سب کی بڑی ہیں۔ملک صاحب ماں کا درجہ دیتے ہیں انہیں۔" بی بی کا آخری فقرہ اسے یہ سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ چھوماں بی بھی ملازمین میں سے ہی تھیں۔

"مگر وہ ہیں کہاں؟"

"وہ مہوش بی بی کو لے کر مری گئی ہیں۔"

"مہوش؟" اس نے وضاحت طلب نظروں سے انہیں دیکھا۔

"مالک اس گھر کی۔اکیلی وارث سب جاگیر جائیداد کی۔"

"تو کیا ملک صاحب مالک نہیں ہیں؟"

"ارے بیٹا! مالک تو وہی ہیں مہوش بی بی تو ان کی جانشین ہے۔"

"اچھا! تو ان کی بیٹی ہے وہ۔" اس نے اچھا کو خاصا لمبا کھینچا تھا۔

"ارے نہیں! ان کے چچا کی بیٹی ہے۔مالک کی بہن بھی ہے بیٹی بھی اور بیٹا بھی۔بہت پیار ہے مالک کو اس سے۔ایک لمحہ کو بھی اپنی نظروں سے اوجھل نہیں کرتے اسے۔وہ تو اس کی ضد تھی کہ سہیلیوں کے ساتھ سیر و تفریح کرنے ضرور جانا ہے۔صاحب سے انکار نہیں ہوا تو چھوماں بی کو دیکھ بھال کے لیے ساتھ بھیج دیا۔"

"اس کے اپنے اماں ابا کہاں ہیں؟"

"اس کے باپ تو اس کی پیدائش سے پہلے ہی چل بسے۔بڑے ہی نیک دل انسان تھے بڑے ملک

صاحب۔ جوانی میں ہی چلے گئے حق ہاہ!"

بی بی کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ علی دلچسپی سے انہیں دیکھتا رہا۔ وہ کتنی محبت سے ذکر کر رہی تھیں گھر کے افراد کا گویا خون کا رشتہ ہو ان سب سے۔ علی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کو کس طرح چپ کرائے تو ان کا دھیان بٹانے کی غرض سے اس نے پوچھا۔

"اور مہوش بی بی کی ماں؟ وہ کدھر ہیں؟"

"اس نے کہاں جانا تھا بچے؟ بس غم ہی کھا گیا۔ بھری جوانی میں بیوگی کی چادر اس کا مقدر بن گئی۔ اس نے اس روگ کو یوں پالا کہ یہ اس کی زندگی ہی کھا گیا اور چند دنوں کی مہوش کو چھوڑ کر وہ بھی چلی گئی۔" بی بی اب دوپٹے کے پلو سے نم آنکھوں کو خشک کر رہی تھیں۔

علی بھی افسردگی سے لب کاٹتا انہیں دیکھتا رہا۔ اسے تاسف ہو رہا تھا کہ اس نے بی بی کو افسردہ کر دیا۔

"پھر صاحب نے پالا ان کو؟" اس نے ان کی توجہ منتشر کرنے کی خاطر سوال کیا۔

"ارے! صاحب کہاں پالتے۔ وہ تو خود تمہاری عمر کے تھے تب۔ پالا تو چھوٹی بی بی نے ہی ہے، لیکن صاحب کو بہت عزیز ہے مہوش اور ہم سب کی بھی آنکھ کا تارا ہے۔"

بی بی بڑی محبت سے اس کا ذکر کر رہی تھیں۔ ان کے دل میں اس کے لیے موجود پیار کی مقدار بڑی وافر تھی، جب ہی اس پیار نے لو اسی پہ حاوی ہو کر ان کی افسردگی کو کہیں دور بھگا دیا اور انہیں ہلکا پھلکا کر دیا۔

علی نہ چاہتے ہوئے بھی اس لڑکی کے متعلق سوچنے لگا جس کے ذکر پہ بی بی کے چہرے کے ہر نقش سے محبت نور کی مانند پھوٹنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"شوں شوں۔" علی آنسو پینے اور سسکیوں کا گلا گھونٹنے کی کوشش میں تھا جس کی وجہ سے بار بار شوں شوں کی آواز آ رہی تھی۔ اللہ بخش اس کے سامنے بیٹھا ترحم آمیز نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے ایسا کیا روگ پال رکھا تھا اس نے ننھی سی عمر میں۔ ضبط گریہ کی کوشش میں اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ہونٹوں کے گوشے کپکپا رہے تھے۔ وہ بار بار پلکیں جھپک کر آنسوؤں کو آنکھوں کی دہلیز پار کرنے سے روک رہا تھا۔ اس کا پورا وجود ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

"علی بیٹا!" اللہ بخش نے شفقت بھرا ہاتھ اس کے بالوں میں پھیرتے ہوئے اسے پکارا۔

"کیوں پوچھتے ہیں آپ مجھ سے بار بار؟" اس نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا۔

"کیا بتاؤں میں آپ کو؟ کسی یتیم خانے سے نہیں بھاگا ہوں۔ کاش! کہ بھاگا ہوتا۔ نہ پوچھیں مجھ سے۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔" اس نے ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"نہیں بتا سکتا میں کہ میرا کوئی وجود نہیں ہے۔ کوئی پہچان نہیں ہے۔ بابا... بابا! مجھ سے نہ پوچھو۔ میں نہیں اون کر سکتا اس بات کو کہ میرا حوالہ کسی کے ناچتے تھرکتے قدم ہیں۔ میں کیسے بتاؤں بابا! میں ٹوٹا ہوا گھنگھرو ہوں۔"

وہ گھٹنوں میں سر دے کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

"وہاں چار عورتیں رہتی تھیں۔ نہ تو کسی کی شکل میں مجھے اپنی شباہت ملی۔ نہ ہی کسی کے رویے میں اتنی نرمی دیکھی کہ میں اسے ماں کی شفقت ٹھہراتا۔"

وہ اللہ بخش کے سینے سے سر ٹکائے گلوگیر لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اللہ بخش اس کی پشت سہلا رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر وہ سسکتا رہا اور اب بے دم سا ہو اس کے ساتھ لگا تھا۔

"جب بھی میں ان پہ چیختا چلاتا، انہیں تنگ کرتا، ان میں سے کوئی ایک مجھے نکال باہر کرنے کو کہتی، مگر ہر بار ان ہی میں سے کوئی ایک یہ کہہ کر روک لیتی کہ جو بھی ہے، آخر کو میں ہوں تو ان ہی کا خون۔" اس نے آنسو پونچھے۔

"بابا! وہاں طبلے کی تھاپ کے بعد جو چیز میں نے زیادہ سے زیادہ سنی، وہ یہ ہی بات تھی کہ میں ان کا خون ہوں۔ کاش! وہ میرے سامنے اس بات کو اتنی تکرار سے نہ دہرایا کرتیں۔ کاش! ان میں سے کوئی تو جان لیتی کہ وہ مجھے کس اذیت سے دوچار کرتی ہیں یہ کہہ کر۔ میرے دماغ کی رگیں پھٹنے لگتیں۔ میں توڑ پھوڑ کرتا، واویلا مچاتا، مگر کوئی چیز کوئی بات اس حقیقت کو نہ بدل سکتی تھی۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ اللہ بخش بھی خاموش ہی رہا، کیونکہ اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ اپنے گھر میں موجود اس عمر کے بچوں کے سامنے کبھی وہ اور اس کی بیوی ایک چارپائی پہ نہ بیٹھتے تھے مبادا بچوں کا بڑھتا ذہن محسوس نہ کرے۔ اس نے عموماً اس عمر کے بچوں کو شرمیلا اور کم گو پایا تھا۔ یہی خوبیاں علی میں بھی تھیں مگر ایک اور چیز تھی جو اس میں نہیں تھی... بچپنا!

وہ جس ماحول میں پلا بڑھا تھا، اس کی وجہ سے اس کی ذہنی عمر اپنے ہم عمروں سے زیادہ تھی۔ اللہ بخش کو خواہ مخواہ ہی جھجک محسوس ہو رہی تھی اس کمسن سے لڑکے سے ایسی گفتگو سن کر بے شک کہ وہ بچہ ہر بچے کی طرح معصوم تھا، بھولا بھالا تھا مگر کچھ تھا جس نے اسے بچہ نہیں رہنے دیا، بوڑھا کر دیا تھا۔ آج اللہ بخش کو احساس ہوا کہ کیوں وہ ان سب کے سوالوں سے بدکتا تھا، کیوں خار کھاتا تھا اپنے متعلق بات کرنے سے۔ آج اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ علی کو کتنی اذیت ہو رہی ہو گی اپنے سے بڑی عمر کے کسی فرد کے سامنے یوں اپنا آپ کھول کر۔ کاش کہ کوئی اس کا ہم جولی ہوتا جو آج اس کا ہمراز بن کر اس کے دکھ بانٹ لیتا! مگر کیسے؟ اس کے ہمجولی تو شاید بس گھنگھرو چھنکانا جانتے ہوں۔

"میں پڑھنا چاہتا تھا، مجھے بڑا آدمی بننے کا بے حد شوق ہے۔ اسکول بھی جاتا تھا مگر۔" علی اتنا کہہ کر بے بسی سے لب کاٹنے لگا۔

"بتاؤ نا بیٹا بولو۔" اللہ بخش نے اسے پچکارا، جو بھی تھا آج اسے علی کی ساری کہانی جاننا تھی۔

"تھرڈ کلاس سا پرائیویٹ سکول تھا جس میں داخلہ کے لیے کسی برتھ سرٹیفکیٹ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی، لیکن جب نہم کے داخلہ جات کا مرحلہ شروع ہوا تو میرے پاس نہ والد کے شناختی کارڈ کی کاپی تھی اور نہ ___"

علی پھر سے بات مکمل نہیں کر پایا تھا، اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اللہ بخش کی قمیص بھگو رہے تھے۔

"میں نے گھر آ کر خوب ہنگامہ کیا اور تب مجھے بتایا گیا کہ مجھے اسکول بھیجنا تو محض ایک بہلاوا تھا اور نہ میرا فیوچر تو طے شدہ تھا ___ وہی جو وہاں سب مرد کرتے۔ مجھے جتا دیا گیا کہ میں کچھ بھی کر لیتا، میرا تاریک بیک گراؤنڈ کبھی مجھے باعزت مقام، کبھی باوقار زندگی تک رسائی نہ حاصل کرنے دیتا!

اس رات میں نے شاید پہلی بار دانستہ طور پر کسی منفی سرگرمی کو اپنے نامہ اعمال میں لکھوایا۔ میں نے کچھ رقم چرائی اور وہاں سے نکل آیا، نہ جانے کس طرح اسٹیشن پہنچا، رات گزر گئی سفر میں مگر میرا ڈر کم نہ ہوا، جب پیسے ختم ہو گئے تو میں نے پیدل چلنا شروع کر دیا، میں ہوش و حواس میں نہیں تھا، میں صرف یہ چاہتا تھا کہ میں ان کا مارکیٹنگ منیجر بھی نہ بنوں، میں ایسی زندگی نہیں جینا چاہتا تھا، میں نے تو مرنے کی ٹھانی تھی مگر قدرت نے مجھے یہاں پہنچا دیا۔"

☼ ☼ ☼

"ہوں!" ملک عباس اطہر نے پرسوچ انداز میں کہا۔ اللہ بخش مودب سے انداز میں ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ وہ باغ میں کھلنے والی کھڑکی کے سامنے موجود راکنگ چیئر پر جھول رہے تھے۔

"کافی ذہین بچہ ہے۔"

"جی ہاں! پڑھنے پڑھانے سے بہت لگاؤ ہے اس کو۔ بتا رہا تھا مجھے اور ادب آداب والا بھی بہت ہے۔"

"باتیں بہت بڑی بڑی کرتا ہے۔" ملک عباس نے

متبسم لہجے میں تبصرہ کیا۔

"جی ہاں' اپنی عمر سے بڑی باتیں کرتا ہے۔ اللہ نے بہت صلاحیتیں دے رکھی ہیں اسے' جتنی شستہ اردو بولتا ہے اتنی ہی روانی سے انگریزی بھی۔"

"ہاں قابل تو وہ واقعی بہت ہے۔" عباس اطہر نے تائیدی انداز میں سوچا۔

"اللہ بخش!"

"جی صاحب!"

"میں کچھ سوچ رہا ہوں۔"

"حکم صاحب۔" اللہ بخش نے سعادت مندی سے کہا۔

"کیوں نہ میں اسے اپنا نام' اپنا حوالہ دے دوں؟"

"جی صاحب؟" اللہ بخش نے اچنبھے سے یوں کہا جیسے ان کی بات سمجھ نہ پایا ہو اور وضاحت چاہتا ہو۔

"اللہ بخش گیارہ سال ہونے کو ہیں یہ حقیقت مجھ پہ آشکار ہوئے کہ اولاد میرے نصیب میں نہیں۔"

"اللہ رحم کرے گا صاحب۔"

"ہوں۔۔۔ دم درود' علاج معالجہ اور دعائیں۔۔۔ کچھ بھی تو کارگر نہیں ہو پا رہا۔ مہوش تو بڑا یا دھن ہے۔ آج سے کل کو اپنے گھر کی ہو جائے گی۔ کوئی میرا دست و بازو بننے کے لیے بھی تو ہونا چاہیے نا؟"

"مگر صاحب! وہ۔"

"اللہ بخش' ہم بچہ گود لینے کا ارادہ تو چھوماں بی سے مشاورت کر کے کر ہی چکے ہیں اگر علی کو علی عباس بنا لوں تو یہ تو چند ہی سالوں میں میرے کندھے سے کندھا ملا کر آ کھڑا ہو گا۔"

عباس اطہر ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوچ سوچ کر کہہ رہے تھے گویا وہ اس معاملے کے متعلق اچھی طرح سوچ سمجھ چکے تھے۔ اللہ بخش کا کام صرف یہ تھا کہ اسے ایک تجزیاتی نگاہ تمام صورت حال پر ڈال کر اپنی مخلص رائے دینا تھی۔ اسے کوئی بات کھٹکتی ہوئی محسوس نہ ہوئی' علی عباس بہت سچا کھرا اور غیر معمولی ذہین بچہ تھا اگر اس کو گود لے کر ملک صاحب اپنی محرومی کے سامنے باقاعدہ طور پر ہتھیار ڈالنے کو تیار تھے تو یہ بہرحال ان کی دانش مندی کی فتح تھی۔ اپنے جانثار و وفادار اللہ بخش سے جواب مانگنے کے بعد انہوں نے اسے جواب طلب نظروں سے دیکھا' اللہ بخش نے اثبات میں سر ہلا کر گویا ان کے فیصلے پر سر تسلیم خم کیا۔

"وکیل کو فون کرو۔ ہم اسے قانونی طور پر گود لیں گے۔ تمام حقائق حرف حرف حقیقت کی صورت بیان کرنا۔"

"جی بہتر۔" اللہ بخش نے مؤدب انداز میں کہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جمی تھیں' آنکھوں کی پتلیاں ساکت تھیں اور چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھا ٹی وی اسکرین کو گھورے جا رہا تھا۔ ملک عباس اطہر نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر ٹی وی اسکرین کی طرف۔ کوئی مارننگ شو آ رہا تھا جس کا میزبان اپنے مہمان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ مہمان شخصیت کے طور پہ ایک طالب علم مرکزی نشست پہ براجمان تھا جس نے میٹرک کا امتحان 99 فیصد نمبر حاصل کر کے شان دار طریقے سے پاس کیا تھا۔ ملک صاحب نے چاہا کہ سامنے پڑا ریموٹ اٹھا کر چینل بدل دیں مگر علی کی بے پناہ محویت انہیں ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔ انہوں نے اطراف میں نظریں دوڑا کر اپنے لیے علی یا ٹی وی کے علاوہ کوئی دلچسپی تلاش کرنی چاہی مگر دیواروں پہ موجود آرائشی شلف' کونوں میں رکھے مصنوعی پھول' مرکزی دیوار پہ آویزاں کیلی گرافی کا شاہکار' ٹیبل پہ پڑا اخبار' قالین کے نقش و نگار' ان کے پہلو میں دھرا کھاتہ جات کا رجسٹر۔۔۔ کوئی ایک بھی چیز ان کی توجہ اپنی جانب کھینچنے میں کامیاب نہیں ہوئی' ان کی نظریں باری باری ہر ایک چیز سے ہوتی ہوئی علی کے چہرے پر آ ٹھہری تھیں۔

"علی!۔۔۔"

"جی!" اس کے صرف لب ہلے' کوئی آواز بر آمد نہیں ہو سکی تھی۔

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers

If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com

or

send message at

0336-5557121

"ایسا بنو گے؟" انہوں نے غالباً" اس ہونہار اسٹوڈنٹ کا حوالہ دیا تھا۔

"ہونہہ...... میں اور اس کی طرح؟" اس کے لہجے میں طنز ہی طنز بھرا تھا۔

"تمہارے جیسا ہی تو ہے یہ۔ تمہیں کیوں لگتا ہے کہ تم اس جیسے نہیں بن سکتے؟ کیوں منہ بنائے اداس ہوئے بیٹھے ہو؟"

ملک عباس اطہر نرمی سے کہہ رہے تھے" ازراہ شفقت انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے گھٹنے پر رکھ دیا۔

"میرے جیسا نہیں ہے وہ۔" علی نے ناراضی سے روٹھے پن سے کہا۔

"کیوں بیٹا! ایسا کیوں سوچتے ہو؟ بیٹا! ابھی تم بچے ہو اپنا بچپن انجوائے کرو' اتنی بڑی بڑی سوچوں میں الجھنے کے بجائے معاملات میں خود کو مت الجھایا کرو۔"

"کاش کہ میں بچہ ہوتا' کسی بات کو سمجھ نہ پاتا مگر بچپن تو میری زندگی میں کبھی آیا ہی نہیں۔ میں تو یونہی بوڑھا سا پیدا ہوا ہوں۔"

"اچھا چھوڑو یہ سب۔ چلو تمہارا ایڈمیشن کروا آئیں۔ میں نے بہت سے اچھے اسکولز کے متعلق معلومات اکٹھی کرلی ہیں۔"

"جی شوق سے چلیے مگر سال کے آخر پر جب داخلہ جانے کے لیے سرپرست کا شناختی کارڈ چاہیے ہوگا تو پھر سر پکڑ کر رو دیے گا کہ سال بھر خوامخواہ پیسے ضائع کیے۔"

علی کے کاٹ دار لہجے نے عباس اطہر کو خاموش کروا دیا۔ وہ کافی دیر چپ چاپ بیٹھے اس کے پھولے نتھنوں اور لال انگارہ ہوتی آنکھوں کو دیکھتے رہے۔

"علی!" انہوں نے اسے اتنی نرمی سے مخاطب کیا کہ اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

"جی!" اس نے ان کی طرف دیکھنے سے گریز ہی کیا۔

"علی عباس بنو گے؟"

اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا' ان کے سنجیدہ چہرے پر مذاق کا شائبہ تک نہ تھا اور بھلا ان کا اور اس کا مذاق کہاں تھا۔ وہ وضاحت طلب نظروں سے ان کی سمت دیکھنے لگا۔ اسے لگا کہ شاید اس کی سماعتوں نے دھوکا کھایا ہے۔ وہ ان کی بات کے مفہوم کو سمجھ چکا تھا مگر اس کا دماغ اس مفہوم کو قبول نہیں کرپایا۔

"ملک علی عباس اطہر بنو گے؟" ملک صاحب نے اسے یقین دہانی کرانے کی خاطر اب کی بار احوال قصہ بمعہ سیاق و سباق اس کے سامنے رکھا تھا وہ نکر نکر ان کی صورت دیکھنے لگا۔

✡ ✡ ✡

علی نے کمرے کے دروازے سے جھانک کر ٹی وی لاؤنج میں دیکھا' نامانوس سا منظر تھا۔ جھریوں زدہ چہرے والی ایک معمر خاتون صوفے پر ہی پاؤں پسارے عجیب سے انداز میں بیٹھی تھیں۔ ٹیبل کے قریب دو مختلف سائز کے اٹیچی رکھے تھے۔ علی نے ذرا جھجکتے ہوئے ایک قدم آگے بڑھایا۔ اس کی ہچکچاہٹ کی وجہ ایک کھنکتی ہوئی مگر قدرے نامانوس آواز تھی۔ وہ ہلکا سا شور جس نے علی کو نیند سے جگایا' اس میں سب سے نمایاں آواز وہی تھی۔

"ارے علی! آؤ۔" وہ فوراً" ملک صاحب کی نظروں کی زد میں آیا تھا۔ ملک صاحب کی اس بات پہ مہوش بھی اس کی جانب متوجہ ہوگئی۔ ڈارک براؤن کلر کے فراک میں ملبوس اس نوعمری لڑکی نے اسے نظر بھر کر دیکھا تو وہ کنفیوژ ہوکر وہیں کلو ہیں جما رہ گیا۔

"لالہ! یہ کون ہے؟" آنکھوں میں اشتیاق لیے لبوں پہ سوال لیے وہ ملک عباس اطہر کی جانب متوجہ ہوئی۔ اس کی آواز اور سرخ ہوتی ناک بتا رہی تھی کہ اسے شدید فلو ہے۔ اس کا دوپٹا اس کے شانے پہ اس لاپروائی سے دھرا تھا کہ اس کا آدھے سے زیادہ حصہ فرش پہ موجود تھا۔ نیلے پیلے رنگ کی پونیوں میں بند کی اس کی دونوں چٹیاؤں میں سے بائیں طرف والی آگے کی طرف موجود تھی اور دائیں طرف والی پیچھے کی جانب۔ علی نے لمحے بھر میں ہی کن اکھیوں سے اس کا جائزہ لے ڈالا۔

"یہ ہیں ملک علی عباس اطہر۔" ملک صاحب چند قدم آگے بڑھ کر علی کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے خوش گوار لہجے میں بولے۔

"علی عباس؟" مہوش نے اس کے تعارف میں کہے گئے الفاظ میں سے سب سے اہم دو الفاظ کو زیر لب دہرایا۔ اس کے چہرے پر خوشگوار حیرت کے تاثرات نظر آرہے تھے۔

"لالہ! یہ کہاں سے آیا؟" اس کے بچکانہ سے سوال نے ملک صاحب کو مسکرا دینے پہ مجبور کردیا۔

"جب آپ سیونتھ میں تھیں تو آپ کی بھابھی آپ کو چھوڑ کر چلی گئی تھیں نا؟"

"بڑی بھابھی؟ جو یہاں رہ رہ کر اپنی ماما کے لیے بہت اداس ہوگئی تھیں؟"

"جی ہاں! وہ علی کی ماما ہیں۔ اسے اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ اب انہوں نے ورلڈ ٹور پر جانا ہے تو اسے انہوں نے اس کے پاپا کے پاس بھیج دیا۔"

"پاپا؟" وہ سمجھ گئی تھی کہ پاپا سے مراد کون ہے مگر تصدیق کرنے کی خاطر یہ لفظ سوال بن کر اس کے لبوں پہ آٹھہرا۔

"آپ کے لالہ جان۔"

"جب بھابھی یہاں تھیں تب یہ کہاں رہتا تھا؟" مہوش کی گول گول چمکتی آنکھوں میں علی عباس کے لیے تجسس ہی تجسس تھا۔

"بورڈنگ میں' جیسے آپ بورڈنگ اسکول میں تھیں۔"

"میرے مری جانے سے پہلے جب بھابھی اپنی چیزیں لینے کے لیے آئی تھیں تو وہ ایسا کیوں کہہ رہی تھیں کہ آپ کو کوئی پاپا کہنے والا نہیں ہوگا۔"

"اس کی بات پہ لحظہ بھر کو ملک عباس کے چہرے پر ایک تاریک سایہ لہرایا مگر وہ فوراً" ہی سنبھل گئے اور بولے۔

"اس لیے کہ علی مجھے کبھی بھی پاپا نہیں کہتا ہمیشہ پاپا جانی کہتا ہے' کیوں علی؟" انہوں نے یکدم علی کو بھی شریک گفتگو کرلیا۔ وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔

"ج...... ج...... جی۔" وہ بمشکل ہی اتنا کہہ سکا تھا۔

✡ ✡ ✡

قرآن پاک جزدان میں لپیٹتے ہوئے اس نے کس کر لیے گئے دوپٹے کو ذرا سا ڈھیلا کیا اور علی عباس کے شروع کردہ آنکھ مچولی کے کھیل کو ختم کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس کے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ دستک کے لیے اٹھا ہوا اس کا ہاتھ ذرا دیر کو ہوا میں معلق ہوا پھر وہ مڑ کر پیچھے دیکھنے لگی۔ کچھ سوچتے ہوئے سوئچ بورڈ کے پاس آکر اس نے ٹیوب لائٹ کا بٹن اوپر کی طرف دبا دیا۔ کمرے کے سامنے والا حصہ یکدم بالکل تاریک لگنے لگا مگر کچھ لمحے گزرنے کے بعد جب اس کی آنکھیں بنا روشنی والے اس منظر سے شناسا ہوئیں تو اس نیم اندھیرے میں بھی اسے اردگرد موجود چیزوں کے ہیولے نظر آنے لگے اس نے سوئچ بورڈ سے ہاتھ ہٹالیا اور ایک بار پھر دروازے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کی انگلی کے دروازے سے ٹکرانے پر ایک نفیس سی دستک کی آواز آئی اور اس نے دیکھا کہ دروازے کے نیچے سے باہر کو جھانکتی روشنی کی لکیر ایک جھپاکے سے کہیں غائب ہوگئی۔ یعنی علی عباس بھی گریزاں تھا۔ شاید اس کے سامنے آنے سے یا شاید اسے اپنے سامنے دیکھنے سے۔

دروازہ بنا کوئی آواز پیدا کیے کھل گیا' وہ اندھیرے میں بھی محسوس کرسکتی تھی کہ اس نے اپنی جینز کو ٹخنوں سے اوپر تک فولڈ کیا ہوا ہے۔ علی عباس کو بھی بنا روشنی کے اس منظر سے مانوس ہونے میں چند لمحے لگے مگر مہوش ملک سے وہ یوں آشنا تھا کہ اس کے چہرے کے تاثرات جاننے کے لیے گھٹا ٹوپ اندھیرا بھی رکاوٹ نہ بن سکتا تھا۔ اس کے دل کی بات بنا لفظوں کے سہارے جان سکتا تھا۔

"اتنی تھکی تھکی سی کیوں لگ رہی ہو؟"

"علی عباس! تمہیں اب مجھے زبان سے بتانا پڑے گا کہ میں کیسی اور کیوں لگ رہی ہوں؟" گھور اندھیرے میں

اس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ وہ جواباً" خاموش ہی رہا۔ اس کے کمرے میں بالکل اندھیرا تھا اور وہ جان بوجھ کر خاصا اندر کی طرف کھڑا تھا تاکہ مہوش کو ٹھیک سے دکھائی نہ دے سکے۔ جبکہ مہوش کے چہرے پر چھائی پریشانی اداسی اور اضطراب اسے بنا کسی کوشش کے نظر آرہا تھا۔

"رو کیوں رہے تھے؟" اس نے اندھیرے میں بھی علی کی آنکھوں میں سرخی دیکھ لی۔ کئی ثانیے خاموشی ایک تیسرے فرد کی طرح ان کے آس پاس موجود رہی پھر علی بولا۔

"تم شاید سو نہیں سکیں' آرام کرلو۔"

"میں شاید سو نہ سکوں میں شاید یونہی بے آرام رہوں۔ کچھ اور کہو۔"

"مہوش! مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

"ایسا ممکن ہے کہ تنہائی تمہیں میسر آسکے؟ کیا ملے گا نظریں چرا کر؟ کیا نہیں جانتے کہ مہوش ملک ہر جگہ حصہ دار ہے' تمہاری تنہائی کی بھی۔ تمہارے اندر باہر طاری سکوت کی بھی۔"

"میں نے تم سے کہا تھا ناکہ انجام۔۔۔"

"وہ بات تم نے ایک دفعہ کہی تھی' ان باتوں کا کیا جو ہزار ہا بار کہیں؟"

مہوش نے تیزی سے علی کی بات کاٹ دی۔ وہ بے بسی سے لب چباتا ہوا اسے بس دیکھ کر رہ گیا' وہ بھلا کب جیت پایا تھا مہوش ملک سے؟

☆ ☆ ☆

"علی!"

وہ بیڈ پہ کتابیں بکھرائے بڑے انہماک سے تمام ریفرنس بکس سے مطلوبہ نکات کو رائٹنگ پیڈ پر نوٹ کرتا جارہا تھا کہ اچانک اسے اپنی پشت پہ ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ مہوش دروازے سے سر اندر کیے اس کے جواب کی منتظر تھی اس کے متوجہ ہوتے ہی وہ بولی۔

"کھیلو گے؟"

"کیا؟"

"یہ۔" اس نے پہلے ایک ہاتھ میں موجود بیٹ کو دروازے سے اندر کرکے اس کے سامنے کیا اور پھر گیند والا ہاتھ بھی اس کے سامنے لہرایا اور آخر میں چھلانگ کے سے انداز میں حرکت کرتی ہوئی پوری کی پوری کمرے میں آکھڑی ہوئی۔

"نہیں۔" علی نے سپاٹ سا "نہیں" اس کے منہ پہ دے مارا اور پھر یوں اپنے کام میں مگن ہو گیا جیسے اس کی آمد سے پہلے تھا۔ مہوش چند ثانیے ناراضی و غصے کے ملے جلے تاثرات لیے اس کی پشت کو گھورتی رہی پھر زبان باہر نکال کر ناک چڑھاتے ہوئے اس کی غصیلی شکل کی کاپی کرکے اپنا غصہ ٹھنڈا کیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

"علی!" وہ چائے کے خالی کپ کو گھورتے ہوئے کب سے سلیب کے پاس کرسی رکھ کر بیٹھا تھا جب وہ اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔ اس نے ذرا سی گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"کھیلیں؟" وہ ڈرتے ڈرتے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں۔"

مہوش کچھ دیر اس کی جھکی ہوئی پلکیں دیکھتی رہی۔ وہ بہت محو ہو کر خالی کپ کے پیندے کو گھور رہا تھا۔ وہی مخصوص سا حلیہ' ماتھے پہ بل' چہرے پہ بیزاری' بین والی قمیص' آستینوں سے فولڈ ہوئے بازو' سانس کے زیروبم کے سوا بے حس سا وجود اور اردگرد سے لاتعلق' مہوش کا دل چاہا وہ اس کو جھنجکتا ہوا شرماتا ہوا نظر آئے پہلی ملاقات کی طرح۔ کم از کم اس کے چہرے کے تاثرات تو نرم تھے تب وہ کرسی گھسیٹ کر اس کے مقابل آبیٹھی اور غیر محسوس انداز میں اس نے دو تین دفعہ کپ کے اندر جھانکنے کی کوشش کی مگر اس کی یہ حرکت علی عباس کی نگاہوں میں آئے بنا نہ رہ سکی تھی۔ وہ قدرے رخ موڑ کر سنک کی ٹونٹی کو دیکھنے لگا جس میں سے پانی کا ایک قطرہ بس ٹپکنے کو ہی تھا۔ مہوش نے بھی اس کی تقلید کی۔ اس نے کن اکھیوں سے مہوش کی سمت دیکھا جواب ٹونٹی کی بناوٹ حفظ کررہی تھی۔ وہ بنا آواز پیدا کیے کرسی پیچھے کی طرف دھکیلتے ہوئے اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ مہوش کی نظروں نے اس کا تعاقب نہیں کیا کیونکہ وہ بڑے دھیان سے اپنی آستین فولڈ کررہی تھی۔

☆ ☆ ☆

علی عباس لان میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پہ بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے سنگتروں سے بھری ٹوکری رکھی تھی۔ وہ عدم توجہی سے ایک سنگترہ ہاتھ میں لیے اسے چھیل رہا تھا اگرچہ اس کی نظریں سنگترے کی جانب ہی تھیں' مگر دھیان کہیں اور تھا جب ہی سنگترے کے کچھ چھلکے سنگتروں والی ٹوکری میں گر رہے تھے اور کچھ ٹیبل پہ' جبکہ بالکل قریب ہی پڑی چھلکوں کے لیے رکھی گئی چھوٹی سی ٹوکری خالی ہی پڑی تھی۔

"علی عباس!" آواز مانوس سی تھی مگر آج لہجہ بڑا دوستانہ تھا اور انداز التجائیہ سا۔

"میں بیٹھ جاؤں؟" وہ پوچھتے پوچھتے ہی بیٹھ گئی۔

"تم کھیلتے کیوں نہیں؟" گیند اور بلا اس کے ہاتھوں میں موجود تھے۔

"اس لیے کہ مجھے گیند کے پیچھے بھاگ دوڑ کرنا پسند نہیں۔"

"اچھا!" پر تاسف سے اچھا کو خاصا لمبا کھینچا تھا اس نے۔

"تم ایسا کرو۔ تم امپائر بن جاؤ۔" اسے اچانک ہی آئیڈیا سوجھا تھا۔

"جب کھیلنا ہی تم نے اکیلے ہے تو پھر امپائر کی کیا ضرورت؟" علی عباس نے سنگترے کی پھانک منہ میں ڈال کرتے ہوئے پوچھا۔

"آج اگر تم امپائر بن گئے تو شاید کل یا پرسوں یا سوں تھوڑا سا کھیل بھی لو۔" مہوش نے بڑی سادگی سے اسے بتایا۔

"چلو' میں آج ہی کھیل لیتا ہوں۔" وہ ایک دم ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"سچ؟" وہ کھلکھلا اٹھی "تم آج ہی کھیلو گے؟" اسے بے یقینی سی تھی۔

"ہاں۔ آج ہی کھیلوں گا' امپائر کل بن جاؤں گا۔" علی عباس نے بھی قدرے دوستانہ جواب دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم خاصے سمجھ دار ہو علی! امید ہے کہ مجھے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

"ملک عباس اطہر سر پہ شملہ باندھے صوفے کی مرکزی نشست پہ بیٹھے تھے۔ ان کے پہلو میں علی عباس سر جھکائے متانت سے بیٹھا تھا۔ دائیں طرف والے صوفہ پہ ایک دراز قد' تنومند شخص بیٹھا تھا جس نے کالا کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پن اور کچھ کاغذات تھے کچھ کاغذات ٹیبل پہ بھی بکھرے ہوئے تھے۔ اللہ بخش' ملک صاحب کے عین پیچھے اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

"دیکھو بیٹا! مجھے مایوس مت کرنا۔ تمہارا انتخاب میرے دل کا فیصلہ ہے' دماغ کا نہیں۔ میری لاج رکھنا۔ یہ شملہ' یہ جاگیر' یہ رتبہ' آخر کار سب تمہیں مل جائے گا۔ ان میں سے کسی چیز کو وقت سے پہلے حاصل کرنے کی خواہش جاگی تو چور رستہ نہ اپنانا۔ مجھ سے صاف صاف کہہ دینا۔ جو چیز مجھے تمہیں کل دینی ہے' وہ آج اور ابھی دے کر تمہاری چاہ پوری کردوں گا۔"

"مجھے جو چاہیے تھا۔ آپ نے مجھے دے دیا' اس کے سوا میری کوئی چاہ نہیں۔"

علی عباس بولنا تو کب سے چاہ رہا تھا مگر اس نے احتراما" ان کی بات نہ کاٹی تھی۔ ان کی بات پوری ہوتے ہی وہ بول پڑا تھا۔

"تم میری توقع سے زیادہ ذہین ہو اور میں تمہارے متعلق تمہاری توقع سے زیادہ مثبت سوچتا ہوں۔ اتنا جانتا ہوں کہ کئی خیر خواہوں اور کئی بدخواہوں نے مجھے یہ قدم اٹھانے سے روکا مگر میں اپنے فیصلے پہ ڈٹا رہا۔ امید ہے کہ تم میرا انتخاب درست ثابت کرنے کی

کوشش کرو گے۔"

"مجھ سے آپ کی جو بھی امید وابستہ ہو گی' میں اسے ضرور پورا کروں گا۔ آپ نہیں جانتے' آپ نے مجھے کیا دیا ہے۔ آپ کی عزت' آپ کی ساری امیدوں کا اپنی زندگی سے زیادہ خیال رکھوں گا۔ میں تو شاید مر ہی جاتا اگر آپ نہ ہوتے۔" آخری فقرہ بولتے ہوئے علی عباس کی آنکھوں میں نمی ٹھہر گئی تھی۔

"چلو! مجھے بتاؤ کیا کیا چیزیں چاہئیں تمہیں؟ میں شہر سے واپسی پہ لیتا آؤں گا۔" ملک صاحب نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اسے چمکارتے ہوئے کہا۔

"آپ مجھے میرے پورے نام سے بلائیں نا' وہ نام جو ایک مکمل نام لگتا ہے۔"

"علی عباس!" انہوں نے جھٹ پٹ اس کی خواہش پوری کر دی۔ اس نے فرط جذبات سے ان کے ہاتھ ہاتھوں میں لے کر چوم لیے۔ اس کا بہت دل چاہا تھا' وہ اسے سینے سے بھینچ لیں مگر انہوں نے فقط اس کے ہاتھ کی پشت کو ہلکا سا تھپتھپا کر چھوڑ دیا۔

☆ ☆ ☆

علی عباس پہ نظر پڑتے ہی مہوش کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وجہ علی عباس کی مصروفیت تھی۔ وہ بڑی گہری نظروں سے ہاتھ میں موجود ڈائری نما کاپی کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

"تمہیں Tense نہیں آتے؟" وہ غالباً" اس کی موجودگی محسوس کر چکا تھا۔

"نہیں تو' آتے ہیں۔" اس نے کمزور سے لہجے میں کہا۔ "یعنی وہ میرے ٹیسٹ دیکھ چکا ہے۔" وہ ندامت سے سوچ رہی تھی۔

"پھر کیا تمہاری ٹیچر کو نہیں آتے؟ جو ہر جگہ کراس لگا ہے؟"

"نہیں وہ۔۔۔" وہ بڑے ولولے سے اس کی بات کی تردید کرنے کو گویا ہوئی تھی مگر بات بنا نہ آئی اس لیے چپ ہو گئی اور اس لمحے کو کوسنے لگی جب اس نے لاؤنج میں بیٹھ کر ہوم ورک کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ تو اپنی طرف سے خاصی بے فکر ہو کر بیٹھی تھی کہ لالہ تو گھر نہیں تھے اور علی عباس شاذ و نادر ہی اپنے کمرے سے نکلتا تھا مگر وہ بڑی فرصت سے صوفے پہ عین اس کے بیگ کے سامنے بیٹھا تھا۔

"میں سمجھا دوں؟" وہ پہلی دفعہ دوستانہ انداز میں بات کر رہا تھا۔

"تت۔۔۔ تم؟" مہوش حیرت بھرے انداز میں سوال کر رہی تھی۔ علی عباس نے اس کی سوال کرتی آنکھوں میں دیکھ کر کندھے اچکائے' وہ اس کے سوال کی نوعیت نہیں سمجھ پایا تھا۔

"تم مجھ سے جونیئر ہو بھلا مجھے کیسے پڑھا سکتے ہو؟"

"پڑھانے کے لیے کلاس میں آگے پیچھے ہونا میٹر نہیں کرتا' صرف ریسکٹو سبق آنا چاہیے اور آئی تھنک کہ میں تمہیں بہت اچھا پڑھا سکتا ہوں۔"

"اچھا؟" مہوش کو گویا کسی نے ڈنڈا کھینچ مارا تھا۔

"ادھر آؤ شاباش!" وہ اسے بچوں کی طرح چمکارتے ہوئے بلا رہا تھا۔ مہوش کے منہ کا ذائقہ کڑوا ہو گیا اور وہ اس وقت کو کوسنے لگی جب وہ گرم پانی سے منہ دھونے کے لیے اٹھی تھی اور علی عباس نے اس کی غیر موجودگی میں ٹیسٹ بک دیکھ لی۔

☆ ☆ ☆

علی عباس ایک نظر مہوش کے چہرے پر اور ایک ہاتھ میں پکڑے کاغذ پر ڈالتا۔ ہر دفعہ جب وہ مہوش کو دیکھتا' مہوش جزبز سی ہو جاتی۔ کاغذ سے جب بھی اس کی نگاہ اٹھتی تو ان نگاہوں میں مزید سے مزید تر حیرت ہوتی۔

"آتا جاتا تو تمہیں کچھ ہے نہیں' مگر جو اسائنمنٹ تمہیں دی گئی اس میں رتی بھر کی بھی غلطی نہیں۔" بالآخر علی عباس کی حیرت سوال بن کر اس کے لبوں تک آ گئی۔ مہوش ذرا سا گڑبڑائی مگر پھر اس نے فوراً" خود کو کمپوز کر لیا۔ علی عباس جائزہ لیتی نگاہوں سے اسے بغور دیکھتا رہا۔ وہ گردن جھکا کر پاؤں کے انگوٹھے کو گھورنے لگی۔

"کہاں سے نقل کیا ہے یہ؟" علی کی رعب دار آواز سے وہ سہم سی گئی۔

"وہ۔۔۔" اس نے تھوک نگلا۔ "مم۔۔۔ میں نے یہ اس کی mistakes (غلطیاں) کمپیوٹر کی مدد سے ٹھیک کیں۔"

"کمپیوٹر سے؟" اسے حیرت ہوئی۔ مہوش نے جواباً" صرف اثبات میں گردن ہلائی۔

"مگر کیسے؟"

"ادھر لکھتی جاتی ہوں نا تو جو غلطی ہوتی ہے' کمپیوٹر اسے پوائنٹ آؤٹ کر کے اس کے متوقع درست جوابات آپشنز کی صورت میں بتا رہا ہے۔"

"اچھا؟" علی عباس نے پر سوچ سی آواز میں کہا اور اس کا ذہن اندر ہی اندر اسکیچ بنانے لگا کہ کس طرح یہ کام ہوتا ہو گا۔

"کمپیوٹر ہے تمہارے پاس؟"

"تمہارے پاس نہیں ہے؟" مہوش نے جواب دینے کے بجائے اس سے سوال کر دیا۔

"نہیں۔"

"تو لالہ سے کہو نا' دلا دیں۔" وہ مدبر سے انداز میں کہتی ہوئی اس کے پاس آ بیٹھی۔

"اچھا مگر پہلے تم اپنا تو دکھاؤ نا مجھے' اگر وہ اچھا ہے تو اس جیسا ہی لے لوں گا ورنہ کوئی اور دیکھ لوں گا۔" علی کسی طور بھی یہ ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا کہ کمپیوٹر جیسی مقبول عام چیز کو اس نے آج تک حقیقت میں دیکھا بھی نہیں تھا۔

"چلو۔" مہوش نے خوش دلی سے کہا اور جذبات میں اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ علی نے چونک کر اسے دیکھا' وہ اسے بازو سے پکڑ کر اپنے کمرے کی طرف لے کر جا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر معصومیت کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ علی عباس کو کہیں سرسراہٹ سی محسوس ہو رہی تھی وہ بار بار کبھی اس کے کہنیوں سے ذرا نیچے تک فولڈ ہوئے بازو کو دیکھ رہا تھا اور کبھی اس کی گرفت میں موجود اپنی کلائی کو۔

☆ ☆ ☆

"یہ لو کر لو بات۔" مہوش نے فون پہ کسی سے ناراضی سے کہتے ہوئے ریسیور عباس لالہ کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اس وقت صوفے پہ ان ہی کے کندھے کے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔

"جی بیٹا کہیے۔" عباس لالہ اپنی لاڈلی کی عزیز از جان سہیلی سے ہمیشہ شفقت سے بات کرتے تھے۔

"لالہ! یہ میرے ساتھ مری جانے کو راضی نہیں ہو رہی۔" لالہ رخ نے شکایتی لہجے میں انہیں بتایا۔

"تو بیٹا! پچھلی دفعہ گئی تھی نا۔ اب کی بار جانا بھی ضروری ہے کیا؟"

"لالہ؟ نانو نے خاص طور پر تاکید کی تھی اسے ساتھ لانے کی۔"

"تو آپ نانو سے کہیں کہ وہ خود ہماری گڑیا سے بات کر لیں۔ تب تو یہ مان جائے گی۔" انہوں نے آسان سا حل پیش کیا۔

"انہوں نے بھی بات کی تھی لالہ! مگر یہ نہیں مانی' اس کی ایک ہی ضد ہے کہ علی عباس بھی ساتھ جائے گا اور بڑے ماما جی کو یہ بات ٹھیک نہیں لگ رہی۔"

ملک عباس ساری گفتگو کے دوران پہلی دفعہ چونکے تھے اور اپنے ساتھ بیٹھی مہوش کو دیکھنے لگے جو اپنی چٹیا کو ہاتھ میں پکڑ کر لاپروائی سے ادھر ادھر جھلا رہی تھی۔

"لالہ؟" لالہ رخ کو لگا تھا کہ شاید لائن کٹ گئی۔

"ہوں۔۔۔ ہاں۔۔۔ میں بات کرتا ہوں۔" وہ غائب دماغ سے لگ رہے تھے۔

"ٹھیک ہے لالہ! میں انتظار کروں گی۔" لالہ رخ نے اختتامی کلمات کہہ کر فون بند کر دیا۔

"مہوش!" وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"علی عباس نہیں جائے گا تو میں بالکل بھی نہیں جاؤں گی۔ آپ مجھے کبھی بھی مت کہیے گا۔" اس نے قطعی لہجے میں کہا تھا۔

"لیکن بیٹا! آپ لڑکیوں میں علی عباس کا کیا کام؟" انہوں نے اسے رسان سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"کام ہے۔ وہ میرا دوست ہے اور آپ اس سے

کہہ دیں کہ اگر علی عباس کو نہیں لے کر جانا تو میں بھی کسی صورت نہیں جاؤں گی۔"

وہ تیز لہجے میں کہتی ہوئی وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں کمپیوٹر بالکل نہیں آتا نا؟" وہ تاسف اور ہمدردی کے ملے جلے تاثرات لیے علی عباس سے پوچھ رہی تھی۔ آنکھوں میں تجسس کا ایک جہاں لیے کمپیوٹر اسکرین کو بصد شوق دیکھتا علی عباس اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہاں مجھے شوق ہی نہیں ہے تو۔" وہ اپنی کمزوری کو چھپانا چاہ رہا تھا، جب ہی نامہ بیانی کر بیٹھا۔

"جی نہیں ہے تو ، راتی ایکسائنمنٹ سے دوڑے کیوں چلے آتے ہو؟"

"میں کہاں آتا ہوں ہتم کھینچ لاتی ہو۔" وہ نظریں چرا رہا تھا۔

"میں تو بس ہلکا سا اشارہ کرتی ہوں۔ تم میرے پیچھے کھنچے چلے آتے ہو۔" اس نے علی عباس پہ انکشاف کیا۔ وہ یک ٹک اسے گھورنے لگا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ متبسم ہوئی۔

"ڈمپل۔"

"یہ والا۔" وہ اپنی شہادت کی انگلی دائیں گال پہ رکھ کے بولی۔

"نہیں 'یہ والا۔" علی عباس نے تردید کرتے ہوئے اس کے بائیں گال کے ڈمپل کو اپنی انگشت شہادت کے ساتھ بہت نرمی سے چھوا تھا۔ اس کی مسکان گہری ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"میں کہہ رہی تھی نا تمہارے کمرے کی کلر اسکیم کے ساتھ یہی شیڈ میچ کرے گا۔ اسی لیے میری خواہش تھی کہ تم یہ کلر لو۔"

علی عباس کی اسٹڈی ٹیبل پہ سجے ہوئے کمپیوٹر کو توصیفی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی وہ سارا کریڈٹ لینے کے لیے بضد تھی۔

"مگر یہ تو میرا انتخاب ہے۔" وہ شوخ ہوا۔

"تمہارا انتخاب ہی تو میری خواہش ہے۔"

مہوش کے الفاظ نے پھر اسے مجبور کر دیا کہ وہ سر اٹھا کر اسے دیکھے۔ اگرچہ ابھی وہ نوجوانی کی حدود میں داخل ہو رہا تھا مگر جس طرح کے ماحول میں وہ رہا تھا۔ اس طرح کا ماحول کسی کو بھی وقت سے پہلے بڑا کر سکتا تھا۔ مہوش کے چہرے پر اسے ایسا کچھ نظر نہ آیا 'جس کا اسے گمان گزرا تھا۔ وہی بھولی بھالی سی صورت 'وہی بچوں جیسی تجسس بھری گول گول مٹکتی آنکھیں۔ علی عباس شرمندہ تھا اپنے اندازے پر مگر وہ اپنی اس شرم ساری کی وجہ سے نظریں نہیں چرا رہا تھا۔ وہ تو اس سرسراہٹ سے فرار چاہ رہا تھا جو اس کے اندر بپا تھی 'جو کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ اس کا دل ہمک رہا تھا بڑے غیر محسوس انداز میں کسی کی طرف کھنچ رہا تھا اور اس کی حرکت سے جو سرسراہٹ اسے محسوس ہوئی اس نے اس کے اندر سنسنی دوڑا دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اچھا بابا اچھا۔ میری طرف سے تم جیتیں میں ہارا ہوا ہی ٹھیک ہوں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں حقیقتاً نہیں جیتی کیا؟ احسان کر رہے ہو؟" مہوش تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ کر براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ علی عباس بنا پلک جھپکائے اسے تکے گیا۔

وہ ان آنکھوں کا پجاری تھا۔ نہ جانے کتنے ہی ماہ و سال گزر گئے تھے 'اسے ان آنکھوں کے خمار کا عادی ہوئے۔ حتیٰ کہ میں بھٹکتے نوجوان کی جگہ ایک بھرپور مرد نے لے لی۔ مہوش کی دو چٹیائیں بچپن کی گڑیوں کے ساتھ ہی کہیں کھو گئیں۔ اب اس کے سیدھے لمبے گھنے بال ہر وقت اس کی پشت پہ بسیرا کیے رہتے۔ اس کی آنکھیں ویسی کی ویسی تھیں۔ گول گول مٹکتی ہوئی بچوں کی طرح شرارت سے بھری ہوئی اور علی عباس کی بے خودی کی ٹکٹکی کے آگے خاموشی سے جھک جانے والی۔ اس وقت بھی وہ جھکی ہوئی تھیں اور اس کی پلکوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ علی عباس کو یہ لرزش بڑی محبوب تھی۔ بارہا اس کا دل چاہا کہ چھو کر اس لرزش کو محسوس کر لے مگر اس نے ایک خواہش کے سوا کبھی دل کی نہ مانی تھی۔ دل کے کہنے پر اس نے صرف اس سے محبت کی تھی اور کچھ نہیں۔

"مہوش!"

"ہوں۔" اس کے منہ سے اتنی آواز برآمد ہوئی کہ وہ بمشکل ہی سن سکا۔

"مجھے اچھا نہیں لگتا تمہارا لڑنا۔"

"یعنی تمہیں میں اچھی نہیں لگتی ؟" آج وہ نہ جانے کیا سننے پہ آمادہ تھی۔

علی عباس بغور اس طرف دیکھنے لگا۔ وہ قینچی چپل میں مقید دائیں پاؤں کے انگوٹھے کو اضطرابی کیفیت میں ادھر سے ادھر ہلا رہی تھی۔ اس کے ناخن گہرے رنگ کی مہندی سے رنگے ہوئے تھے۔ علی عباس کے کانوں میں اپنی ہی آواز کی بازگشت سنائی دی۔

"مجھے مہندی لگے ناخن بہت پسند ہیں۔" وہ یاد کرنے میں ناکام رہا کہ اس نے کب یہ بات کہی تھی۔ اس کی نظریں ذرا اوپر کو اٹھ آئیں۔

"تم یہ ہر وقت آستینیں کیوں موڑے رکھتی ہو؟" جھنجلائی ہوئی آواز میں بیزاری سے کیا گیا سوال۔

"تم جو موڑے رکھتے ہو۔" نرم سی آواز میں سادگی سے دیا گیا جواب۔

علی عباس نے محبت پاش نگاہوں سے اس کی فولڈ ہوئی آستینوں کو دیکھا۔ ذرا اوپر تک جاتی اس کی باہیں اسے پھر سے ماضی کے کسی دن میں لے گئیں۔

"تمہارے بال اس سے لمبے نہیں ہو سکتے؟" لہجے میں سوال سے زیادہ افسوس تھا۔ جواباً کسی نے ہاتھوں سے ٹٹول کر اپنے بالوں کا جائزہ لیا تھا۔

"ارے! تمہیں تو تیل کی خوشبو سے الرجی تھی نا؟" علی عباس نے اس کے تیل سے چپڑے ہوئے بالوں کو دیکھ کر کہا تھا۔

"ہاں! تھی۔" اپنا مفہوم واضح کرنے کے لیے مہوش نے "تھی" پہ زور دیا تھا مگر علی اس کے اس فعل کی پذیرائی نہ کر سکا۔ وہ منتظر نگاہوں سے نہ جانے کتنی دیر اسے دیکھتی رہی تھی۔

اور آج ۔۔۔ آج بھی ایسا ہی تھا۔ وہ جواب طلب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ علی عباس کی نظریں اس سے ٹکرائیں تو اس کی آنکھوں کی تحریر نے اسے مسمرائز کر دیا۔ ان آنکھوں نے ہی تو اسے جوگی بنا دیا تھا 'اس کے وجود کو قید کر لیا تھا۔ ان آنکھوں نے تو اسے باندھ لیا تھا۔ ان آنکھوں میں تو اس کی زندگی بستی تھی۔

"میں اچھی نہیں لگتی؟" سوال دہرایا گیا تھا۔ علی عباس نے لمحہ بھر کو ان آنکھوں میں دیکھا جن میں شوق کا جہان آباد تھا۔ جو انتظار کر کر کے مضمحل سی نظر آ رہی تھیں۔ جو پرامید سی ہو کر اسے تکے جا رہی تھیں۔ جن میں اپنا عکس وہ باآسانی دیکھ سکتا تھا۔ اعتراف کی گولی نگلے بنا اب شاید گزارا نہ ہو پاتا۔

"لگتی ہو۔" نہ جانے کیسے اس کی زبان سے یہ لفظ پھسلے تھے۔ ہوش و دیوانگی میں جس در پہ اس نے کئی بار خود کو زیر پایا تھا 'اس در سے نسبت کو اپنانا نہ جانے اتنا کٹھن کیوں تھا۔ مہوش نے آنکھیں موند لیں۔ آنسو اس کے گالوں پہ لڑھک پڑے۔ اس کے چہرے پہ وہ آسودگی تھی 'جو لمبی مسافت کے بعد منزل کا نشان نظر آنے پر مسافر کے چہرے پہ ہوتی ہے۔

"مگر مجھ سے لڑا مت کرو۔" علی نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا 'جہاں سے ٹوٹا تھا۔ مہوش نے یوں حیرانی سے اس کی طرف دیکھا 'جیسے کہتی ہو "ابھی کچھ کہنا باقی تھا؟"

اس کا آنسو خشک ہوتا ہوا ڈمپل میں کہیں کھو گیا تھا۔

"کیونکہ تم مجھ سے لڑتی ہو تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔" علی گمبھیر لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"اس لیے نہیں کہ لڑتے ہوئے تم بدتمیز لگتی ہو بلکہ اس لیے کہ تم اس دنیا کی شاید آخری ہستی ہو 'جس سے میں اختلاف نہیں کرنا چاہتا۔ اور اس لیے بھی کہ تم شاید وہ پہلی انسان ہو 'جسے میں کھونا نہیں چاہتا۔"

مہوش نے ایک پرسکون سی سانس خارج کی۔ اس کی آنکھیں لو دے رہی تھیں۔ وہ گلال ہوئے جا رہی تھی۔ وہ اس لمحے اتنی خوبصورت لگ رہی تھی کہ علی عباس نے نظر بھر کر دیکھنے سے گریز کیا کہ کہیں نظر ہی نہ لگ جائے۔

✡ ✡ ✡

"بی بی! بی بی کہاں ہیں آپ؟" مہوش ہاتھ میں فرائنگ پین لیے اِدھر اُدھر گھومتی ہوئی بی بی کو آوازیں دے رہی تھی۔

"کیا بات ہے دمی رانی!" وہ دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتی ہوئی نہ جانے کس کونے سے برآمد ہوئی تھیں۔

"آپ نے یہ ابھی تک مقبول چاچا کے فلیٹ میں نہیں بھجوایا۔" اس کا اشارہ فرائنگ پین میں موجود مچھلی کے سالن کی طرف تھا۔

"اگر میں نہ دیکھتی تو یہ وہیں فریج میں دھرا رہتا۔ پتا ہے نا آپ کو اس کا سر درد کرنے لگ جاتا ہے۔ اتنی تیز لگتی ہے اسے مچھلی کی خوشبو۔ اگر وہ پانی پینے کے لیے فریج کھول لیتا تو؟" اس نے ان کے جواب کا بھی انتظار نہ کیا تھا اور نان اسٹاپ بولنا شروع ہو گئی۔

"ارے بیٹا! علی عباس کو پسند نہیں تو تم کھالو۔ تمہیں تو بہت مرغوب ہے نا۔" سادہ لوح سی بی بی نہ جانے اس کی کس دور کی پسند کا تذکرہ کر رہی تھیں۔

"نہیں، آپ یہ مقبول چاچا کو دیں ابھی فوراً۔" اس نے بحث کرنا فضول تصور کیا تھا۔

"بیٹا! اپنے لالہ کے لیے تو ذرا سا سالن نکال لو۔ رات کو انہوں نے فرمائش کر کے بنوایا تھا۔"

"بی بی! پلیز دے دیں اس کو۔ لالہ کھا چکے ہیں رات کو۔"

بی بی کو جاتے ہی بنی۔

"جلدی آیئے گا۔" اس نے آواز لگائی تھی اور پھر ان کے واپس آتے ہی اس نے ان کے ہاتھ سے فرائنگ پین جھپٹ کر کم و بیش چھ دفعہ رگڑ رگڑ کر دھویا اور ابھی وہ اپنے اس شغل کو جاری رکھتی اگر باہر علی عباس کی گاڑی کی آواز سنائی نہ دیتی۔ گاڑی کے رکنے کی آواز آتے ہی اس نے فرائنگ پین کو برتنوں کی ٹوکری میں گھسیڑا اور خود کچن کی پچھلی طرف موجود واش بیسن پہ صابن سے ہاتھ دھونے لگی۔ ہر بار صابن لگا کر ہاتھ اچھی طرح مل کے دھونے کے بعد وہ انہیں ناک کے قریب لاتی اور پھر صابن رگڑنا شروع کر دیتی۔

"مہ وش!" وہ اسے پکارتا ہوا یقیناً "لاؤنج سے کچن کی طرف بڑھ رہا تھا اس نے جلدی سے دیوار پہ موجود ٹاول اسٹینڈ سے تولیہ کھینچا، ہاتھ خشک کیے اور کچن کی طرف دوڑی۔ جونہی وہ پچھلے دروازے سے کچن میں داخل ہوئی، وہ بھی سامنے والے دروازے سے آ دھمکا۔

"تمہارے لیے۔" وہ چھوٹتے ہی بولا اور ایک سفید رنگ کا شاپر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

"کیا ہے؟" اس نے شاپر اس کے ہاتھ سے لے لیا اور خاصے اہتمام سے کھولنے لگی۔

"فش مستی؟" وہ بے یقینی سے گویا ہوئی، کسی زمانے میں یہ اس کا فیورٹ برگر تھا۔

"تمہارے سر میں درد نہیں ہوا اس کی خوشبو سے؟" وہ مڑ کر اس سے سوال کرنے لگی۔

"نہیں۔" اس نے رسان سے کہا اور سست روی سے قدم اٹھاتا اس کے قریب آگیا۔ "کیونکہ تم نے مقبول یا اللہ بخش کے ہاں بھجوا دی فش اور۔۔۔" اس نے اس کے ذرا ذرا سے ٹھنڈے ہاتھ تھام لیے اور سونگھ کر بولا۔ "ہاتھ بھی اچھی طرح دھو لیے ہیں۔" وہ کھلکھلانے لگی۔

✡ ✡ ✡

"صاحب! وہ۔۔۔" اللہ بخش کچھ ہچکچا رہا تھا۔

"کہہ بھی چکو اللہ بخش! ایسی بھی کیا بات ہے جو تم کہہ نہیں پا رہے۔"

"صاحب! وہ بچوں کے متعلق بات کرنی تھی۔"

"ہاں ہاں کہو۔"

"وہ بہت قریب آ گئے ہیں اور۔۔۔"

"اور؟" ملک عباس کو کسی انہونی کا احساس ہوا۔

"کافی گھل مل بھی گئے ہیں۔"

"تو؟" ان کے اعصاب تن گئے تھے۔

"تو یہ کہ آپ ان کا رشتہ واضح کر۔۔۔"

"اللہ بخش!" وہ تیزی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

"نن۔۔۔ نہیں نہیں صاحب! میرا مطلب تھا کہ بچے ہیں نا سمجھ ہیں، معاملات کی باریکی کا اندازہ نہیں انہیں۔ آپ ان پر اگر ان کے درمیان رشتہ واضح کر دیں تو سنبھل جائیں گے۔"

"کیا مطلب؟ کیسے؟" اللہ بخش کی اس بات سے ان کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے تو پڑ گئے تھے مگر ماتھے کی تیوریاں جوں کی توں تھیں۔

"آپ کے کہے کو سمجھیں گے صاحب! آپ بس انہیں ایک دفعہ باور کرا دیں کہ ان کے بیچ قربت بڑھی تو یہ بات معیوب ہو گی۔"

"اللہ بخش! حالات اس نہج پہ آ چکے ہیں، تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"صاحب! چھوماں بی بی، میری اور بی بی کی یہی خواہش تھی کہ بات آپ تک پہنچنے سے پہلے رفع دفع ہو جائے۔ ہم میں سے ہر ایک نے کوشش بھی کی مگر۔۔۔"

"مگر کیا؟"

"مگر شاید اس الجھن کا سلجھن آپ کے ہاتھوں ہونا لکھا ہے۔"

"یعنی تم سب لوگوں کی کوششیں رائیگاں گئیں؟" انہوں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

اللہ بخش نے سر جھکا لیا۔ ان کے چہرے پر تفکر کے سائے گہرے ہو گئے۔

✡ ✡ ✡

علی عباس، جب بڑے صاحب کے بلاوے پر ان کے سامنے حاضری دینے آیا تھا۔ انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سر جھکا کر بیٹھتے ہوئے اسے یہ احساس تک نہ تھا کہ بابا صاحب جو منتر اس پر پڑھ کر پھونکنے والے ہیں، وہ اسے ساکت و صامت کر دے گا۔ اس بات نے اس کے جسم سے جیسے توانائی کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا تھا۔ وہ اتنی کمزوری محسوس کر رہا تھا کہ اسے لگا کہ وہ پلکیں اٹھا کر ان کی جانب دیکھ بھی نہ سکے گا۔

"علی عباس!" انہوں نے علی عباس کی لٹھے کی طرح سفید پڑتی رنگت سے نظریں چراتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ علی عباس نے پوری توانائی مجتمع کر کے گردن موڑ کر انہیں دیکھنا چاہا مگر وہ اپنے وجود کو صرف اتنی ہی حرکت دینے میں کامیاب ہوا کہ اس کی دائیں ابرو ذرا سی ہلی اور ہونٹوں کے گوشے ذرا سے کپکپائے۔ وہ اس سے اتنے شناسا تھے کہ اس کی اس بے معنی سی حرکت سے ہی سمجھ گئے کہ وہ خود کو ہمہ تن گوش ظاہر کرنا چاہ رہا ہے۔

"تم ہی پھر اس سے بات کرو، تم اس سے بے تکلف بھی ہو کافی، ہم عمر بھی ہو۔ میں تو ایسی باتیں کرتا اچھا نہیں لگتا۔"

اس نے جواباً "اپنی جھکی ہوئی پلکوں کو ذرا اور جھکا کر جیسے اثبات میں گردن ہلائی ہو۔

"لڑکا بہت اچھا ہے۔ میں ہر طرح سے اطمینان کر کے ہی بات آگے بڑھاؤں گا مگر میری خواہش ہے کہ تم اس معاملے میں ذاتی دلچسپی لو۔ آخر کل کو تم نے ہی اسے اس گھر سے رخصت بھی کرنا ہے۔"

ان کے رتبے کے شایان شان نہیں تھا کہ وہ اس کو تنبیہہ کرتے۔ انہیں صرف اپنا مدعا بیان کرنا تھا، جو انہوں نے کر دیا۔ وہ گھر کے منظر میں کسی فرد کے اضافے کے متمنی تھے۔ گویا کوئی ایسی جگہ تھی، جسے پُر کرنے کے لیے انہیں کوئی نیا درکار تھا۔ کسی خلا کو پُر کرنے کے لیے وہ کہیں نیا رشتہ استوار کرنا چاہ رہے تھے۔ یعنی اس خلا کو ختم کرنے کے لیے علی عباس کا وجود ناموزوں تھا۔

✡ ✡ ✡

وہ ٹانگیں لمبی کیے گھٹنوں تک کمبل لیے لیپ ٹاپ گود میں دھرے لیپ ٹاپ کی اسکرین کو بڑے انہماک سے گھور رہی تھی۔ علی عباس جس انداز میں چلتا ہوا اس کے کمرے میں داخل ہوا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بنا آہٹ کیے اس تک پہنچنا چاہتا ہے۔ جب ہی وہ منہمک ہی رہی تاکہ وہ اپنے مطلوبہ انداز میں آسکے۔ علی عباس کی باتوں اور معاملات کو ذرا سا بھی ڈسٹرب کرنا گوارا نہیں تھا اسے۔ وہ آکر خاموشی سے اس کے بیڈ کے کنارے تک گیا۔ مہوش نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔

"تم نے کل سے شرٹ چینج نہیں کی؟" لیپ ٹاپ پہ تھرکتی اس کی انگلیاں تھم گئیں۔ علی عباس خاموش رہا گویا کوئی غیر معمولی بات ہوئی تھی۔

"مہ وش!" نہ جانے کتنی دیر بعد اس نے اسے پکارا تھا۔

وہ تڑپ کر کمبل سمیت اس کے قریب آگئی۔ علی عباس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ کرب میں ہے۔ اس کی ذات کسی انہونی کی زد میں آئی ہے۔

"کیا ہوا علی عباس؟" اس کی مکمل نام سے مخاطب کیے جانے کی خواہش کے سبب وہ اسے بہت کم صرف علی کہا کرتی تھی۔

"بابا نے مجھے کہا ہے۔" وہ بات مکمل نہ کرسکا۔ مہوش نے اس کے بائیں شانے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا جیسے کہتی ہو۔ "بتاؤ نا"

"کہ میں شاہ وار کے متعلق تمہاری رائے جانوں اور۔۔۔" وہ پھر سے رک گیا۔

"اور؟" اس نے زخمی سے سوالیہ لہجے میں کہا۔

"اور تمہیں اس کے متعلق ان کی رائے بتاؤں۔" علی بڑی مشکل سے بات مکمل کرپایا تھا۔

"میں لالہ سے بات کرتی ہوں۔"

"مہوش!" اس کو اس کی پکار اجنبی سی لگی گویا وہ کوئی غیر متوقع بات کرنا چاہ رہا تھا۔

"کہو!"

"بابا جانی اگر اس بات کے حق میں ہوتے تو سب سے پہلے ان ہی کے ذہن میں آتا ہمارا مستقل ساتھ۔"

"علی عباس! لالہ اس بات کے حق میں نہیں تو؟" اس نے چیختے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ اس کو یوں لگا کہ علی عباس کے شانے پر رکھا اس کا ہاتھ یکدم زرد رنگ ہوگیا ہے۔

"بابا کا زرخرید ہوں میں' انہوں نے میری وہ بھوک مٹائی جس کا زہر میرے رگ و پے میں سرایت کرکے مجھے وحشی اور جنونی بنا رہا تھا۔"

"تو؟" ایک اور چبھتا ہوا "تو" اس کے سامنے سوال بنا کر رکھا گیا۔

"تو یہ کہ۔۔۔" اس نے لحظہ بھر کو رک کر اپنے دل کی رضا کی تہ کے گراف کو جانچا اور پھر بولا۔ "بابا اگر میری گردن کاٹنا چاہیں تو میری خواہش ہوگی' میں سر تن سے جدا ہونے تک اپنے قدموں پہ کھڑا رہوں تاکہ انہیں ذرا سا جھکنے کا تردد بھی نہ اٹھانا پڑے۔"

اس کی بات پہ مہوش کا ہاتھ اس کے کندھے سے یوں ڈھلک آیا' جیسے سوکھی ٹہنی درخت سے ٹوٹ کر گرتی ہے۔ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ نظریں چرا رہا تھا گویا اپنے الفاظ پہ شرمندہ تھا۔ اس کے لبوں کے گوشے تھر تھر کر رہے تھے یعنی وہ مضطرب تھا۔ اس کی پلکوں میں لرزش تھی گویا وہ خوف زدہ تھا۔ اس کی سانسوں کی ترتیب ناہموار تھی گویا اس کی زندگی موت کا مسئلہ تھا۔ وہ اپنی کپکپاتی ہتھیلیوں میں کچھ تلاش کررہا تھا گویا اسے کچھ ملنے کی آس تھی۔

"تمہاری زندگی میں ہوں علی عباس! وہ اگر جان کا نذرانہ بھی چاہیں تو معاملات میں طے کروں گی' تم نہیں۔"

مہوش نے بڑی سہولت سے اس کے کندھوں کی گٹھڑی اپنے سر پر اٹھالی۔

"میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتا۔" اس نے ایکدم رخ موڑ کر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

"جانتی ہوں۔" مہوش نے اس کی نم آنکھوں میں تیرتی اپنی شبیہہ کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور

اس کے ہاتھوں کی پشت کو سہلانے لگی تھی۔

✡ ✡ ✡

"لالہ! علی عباس شاہ دار کے متعلق بتا رہا تھا۔"
ناشتے کی میز پہ اس نے سرسری سے انداز میں تذکرہ کیا علی عباس نے ناشتا ادھورا چھوڑ کر اٹھنا چاہا' نہ جانے کیوں اس کا سخت جان' کٹھور دل مہوش ملک کے معاملے میں چوزہ سا ہو گیا تھا۔ مہوش نے آنکھوں پہ گرے کالے دبیز پردوں کو اٹھا کر ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھا' ٹھہرے رہنے کا اشارہ تھا' وہ اٹھنے میں کامیاب بھلا کیسے ہو سکتا تھا؟

"لالہ! مرد کی ذات سے وابستہ ہر ایک رشتہ یا تو علی عباس کا روپ دھار کر میرے سامنے آیا یا پھر آپ کی شکل میں۔" وہ ملک عباس کے جواب کا انتظار کیے بنا پھر سے بولنا شروع ہو گئی تھی۔
"کسی تیسرے کی گنجائش کسی صورت نہیں نکل سکتی۔"
ملک عباس اطہر ہر قسم کے رد عمل کے لیے تیار تھے مگر انہیں امید نہ تھی کہ احوال قصہ اتنے دو ٹوک انداز میں اور اتنی جلدی ان کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ انہیں بخوبی علم تھا کہ علی عباس دست سوال دراز کرنے کبھی نہیں آئے گا کیونکہ ایک دفعہ انہوں نے اس کے بنا کہے اس کی سب سے بڑی خواہش پوری کر کے اسے بے مول خرید لیا تھا۔ اب کی بار گھر کے نوجوانوں کو جس قسم کا امتحان درپیش تھا' اس میں گھربار' نام' رتبہ' خاندان اور کام کاج کے متعلق استفسار کیا جاتا۔ ستم ظریفی کہ علی عباس کو تو اپنا نام بھی پورا نہ آتا تھا' اس کے پاس اس امتحان کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا اسے بس موجود ہونا تھا ہر صورت۔
مہوش نے ایک ہی جھٹکے میں اسے کڑا امتحان میں پہنچا دیا تھا اور اب خود بڑی نفاست سے ٹشو سے اپنا منہ صاف کر رہی تھی۔ ملک عباس کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی۔ انہوں نے ایک دم کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اللہ بخش ان کی پشت کی جانب شرمندہ شرمندہ سا کھڑا تھا۔ علی عباس چاہ کر بھی سر نہ اٹھا سکا۔
"یہ کیا بے ہودگی ہے؟" وہ دھاڑے تھے۔
"تمہاری خواہش ہے۔" بڑے رسان سے تصحیح کی گئی۔
"خواہش نہیں' حسرت۔" انہوں نے ایک ایک لفظ پہ زور دیا۔
"حسرت' نا تمام رہ جانے والی خواہشوں کو کہتے ہیں۔" وہ ترکی بہ ترکی جواب دے رہی تھی۔
"تم لوگ خود سر اور بے حیا تو ہو سکتے ہو مگر اتنے بااختیار نہیں کہ میرے ہوتے ہوئے یہ خواہش پوری ہو۔"
"آپ بھی اتنے بااختیار نہیں کہ ہماری خواہش کا پورا ہونا یا نہ ہونا آپ کے ہاتھ میں ہو۔"
"اللہ بخش! اس سے کہو میری نظروں سے دور ہو جائے۔" وہ پھٹ پڑے تھے۔
"بٹیا رانی! اٹھو۔" اللہ بخش نے آگے بڑھ کر اس کے شانوں پہ ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے اسے وہاں سے اٹھانا چاہا۔ مگر وہ نہیں اٹھی تو ملک عباس خود پھنکارتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔
مہوش نے سختی سے اللہ بخش کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اللہ بخش نے ایک نظر مہوش پر ڈالی اور ایک نظر باہر کی طرف جاتے دروازے کو۔ اور پھر کچھ ہی لمحوں بعد وہ وہاں سے جا چکا تھا۔
"تم نرمی سے بات کرتیں نا!" مضمحل سے علی عباس نے پریشانی سے کہا۔
"ان کا لہجہ دیکھا تھا تم نے؟" وہ رو دینے کو تھی۔
"ہمیں ان سے اپنی بات منوانی ہے' ان پر اجارہ داری نہیں جمانی۔" وہ رسانیت سے اسے سمجھا رہا تھا۔ ان دونوں کے وجود اداسی کی سیاہی کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔

✡ ✡ ✡

چائے کا کپ ہاتھ میں لیے اس نے لالہ کے کمرے کے دروازے پر دستک دی مگر کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے پاؤں کو ذرا سا آگے سرکایا اور پنجے کی مدد سے ادھ کھلے دروازے کو دھکیل دیا۔ کمرے میں صرف زیرو کے بلب کی روشنی تھی۔
"لالہ!" وہ سست روی سے قدم اٹھاتی ان کے قریب چلی آئی۔ انہوں نے غصے سے منہ پھیر لیا۔ وہ باغ میں کھلنے والی کھڑکی کے پاس رکھی آرام کرسی پر بیٹھے تھے۔
"لالہ! اس میں کیا برائی ہے؟"
"شاہ دار میں کیا برائی ہے؟" سوال کے بدلے سوال آیا تھا۔
"وہ مجھے اس رشتے میں قبول نہیں۔"
"علی عباس مجھے اس رشتے میں قبول نہیں۔"
"لیکن علی کو آپ بہت سال پہلے ایک اس سے بھی معتبر حوالے سے اپنا چکے ہیں۔"
"وہ ایک بالکل الگ معاملہ تھا مہوش!"
"بیٹا بنا سکتے ہیں اور فرزندی میں نہیں لے سکتے۔ فرق ہی کیا ہے ان دو باتوں میں؟"
انہوں نے رخ پھیر لیا۔ وہ لفظوں میں نہیں بتا سکتے تھے کہ مہوش کی یہ ضد' انہیں کس قدر ناگوار گزر رہی ہے۔
اس نے ان کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھ دیے۔ نہ جانے کب وہ ان کے قدموں میں آ بیٹھی تھی۔ انہوں نے بھلا اس کی طرف دھیان کب دیا تھا جو انہیں علم ہوتا۔
"علی عباس کو بہاول پور بھیجنا ضروری تھا یا ضرورت پیدا کی گئی؟" اس نے سوال کیا۔
"مجھے جھوٹے بہانوں کی ضرورت نہیں۔ اس کی وہاں واقعی ضرورت تھی۔" انہوں نے بات ختم کر دی۔

✡ ✡ ✡

"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا اللہ بخش! کیا کروں؟" سوکھے پتوں کو پاؤں تلے روندتے ہوئے وہ اللہ بخش کے ساتھ باغ میں چہل قدمی کر رہے تھے۔
"صاحب! علی بچے سے بات کریں' آپ کا کہا وہ ٹالیں' یہ ناممکن ہے۔"
"نہیں اللہ بخش! نہیں' پہلے اپنا خون تو آزما لوں۔" انہوں نے فوراً" اس کی تجویز رد کر دی۔
"مہوش بی بی تو شاید ہی۔" اللہ بخش نے دانستہ طور پر بات ادھوری چھوڑی۔
"ہوں۔" ملک صاحب نے پر سوچ انداز میں ہنکارا بھرا۔
"صاحب آپ۔" اب کی بار اللہ بخش چاہ کر بھی اپنی بات پوری نہ کر پایا۔
"کیسے مان جاؤں اللہ بخش؟ خیر خواہوں' دوستوں' دشمنوں' سبھی نے وقتاً" فوقتاً" مجھے اسی بات کا ڈراوا دیا تھا لیکن تب میں انتخاب کر چکا تھا علی عباس کا' اگر ان کے ڈراووں' بہکاووں سے متاثر ہوتا تو گویا خود اپنے انتخاب کو غلط کہتا' مگر آج سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ اس وقت علی عباس کو دھتکار دینا بہتر تھا' کم از کم یہ ذلت تو نہ اٹھانی پڑتی۔"
"صاحب! کوئی راستہ نہیں ہے؟" اللہ بخش نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
"نہیں۔ اللہ بخش! نہیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرے تمام جاننے والے بخوبی واقف ہیں کہ یہ فیصلہ میں خود بالکل نہیں کر سکتا' کیونکہ ابھی دو ماہ پہلے تک ہر چھوٹی بڑی تقریب میں ان دونوں کے رشتے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ کئی ایک زبانوں نے گھر کی بات گھر میں کرنے کا مشورہ دیا مگر میں نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ مجھے یہ بات پسند نہیں۔
اللہ بخش! اگر میں نے اپنی گفتگو میں تکرار کے ساتھ "مجھے" کا لفظ استعمال کر کے اس بات پر اپنی نامنظوری کی مہر نہ لگائی ہوتی تو شاید میں ان دونوں کے متعلق سوچتا۔ مگر اب جبکہ میرے حلقہ احباب کو میری ناپسندیدگی کا بھی واضح علم ہے اور میں شاہ دار کو کئی لوگوں کی موجودگی میں اپنے گھر مدعو کر چکا ہوں' تو اب یہ ناممکن ہے۔"
اللہ بخش سر جھکائے ان کی باتیں سنتا رہا۔
"مجھے یہ تبصرے سننا بالکل بھی گوارا نہیں اللہ

بخش! اگر لوگ کہیں' ملک عباس اطہر بچوں کے ہاتھ کا کھلونا بن گیا۔ جس بات کو میں نے اتنی بار رد کیا ہو' اس کے لیے مان جانا میرے شملے کو ملگجا کر سکتا ہے ان کی یہ ضد تسلیم کرنا گویا یہ حقیقت تسلیم کرنا ہے کہ علی عباس اور مہوش ملک نے میری ناک کے نیچے ناٹک سجائے رکھا اور مجھے اس وقت خبر ہوئی' جب تماشائی کے سوا میرے لیے کوئی کردار نہ بچا تھا۔"

"صاحب آپ دنیا والوں کو یہ بھی تو کہہ سکتے ہیں کہ سب آپ کی رضا سے ہوا۔"

اللہ بخش ان سے ہر قسم کی بات کر لیتا تھا' بعض ذرا ڈر کے اور بعض بنا ڈرے۔

مجھے ہنسی نہیں اڑوانی اللہ بخش! ایک زمانہ جانتا ہے ملک عباس اطہر کو' اس کے مزاج کو' اس کی عادت کو' ابھی میں اتنا لاغر اور بے بس نہیں ہوا ہوں کہ ان کے آگے جھک جاؤں اور زمانے کو خود پہ پھبتیاں کسنے کی دعوت دوں۔"

☼ ☼ ☼

"اچھا فرض کریں میں علی عباس سے شادی نہیں کرتی تو کیا آپ عمر بھر اس کی شادی نہیں کریں گے؟" انہوں نے اسے ایک نہایت لمبا چوڑا لیکچر دیا تھا' جس میں ڈراوے' دھمکاوے' پیار' دھونس' واسطے اور جذباتی بلیک میلنگ کی خوب فراوانی تھی۔ وہ زیادہ تر ان کی باتوں کو ٹالتی رہی یا پھر ہاں' ناں میں جواب دیتی رہی۔ دوران گفتگو وہ سانس لینے کے لیے رکے تھے کہ اس نے سوال داغ دیا۔ انہوں نے ایک نظر اس کے بے تاثر چہرے کو دیکھا اور بولے۔

"کروں گا' ضرور کروں گا۔"

"تو پھر یہ بتائیں کہ کس سے کریں گے؟"

"کسی بھی اچھی لڑکی سے۔ وہ ملک عباس کا وارث ہے' اسے کوئی بھی اچھی لڑکی مل سکتی ہے۔"

"تو پھر وہ اچھی لڑکی مہوش ملک کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ مہوش "کوئی بھی" نہیں ہے۔"

"لالہ! جن باتوں کو اعتراضات بنا کر آج آپ اسے میرے لیے رد کر رہے ہیں' کل جب آپ کسی بھی جگہ پہ اس کا رشتہ لینے جائیں گے تو ان باتوں کو خود ہی جسٹی فائی کریں گے' کتنی ڈپلومیسی ہو گی نا یہ؟"

"مہوش!" وہ دھاڑے۔

"چلا کیوں رہے ہیں لالہ! آپ کے اپنے ہی عمل میں تضاد ہے' اس بات کو قبول کریں۔ جب آپ کو اس کے سہارے کی ضرورت تھی۔ کوئی جوان قابل بھروسا مزدور چاہیے تھا' تب جہاں بھر کی باتیں سنی ان سنی کر کے آپ نے اسے اپنا نام دیا' اپنا گھر' اپنا رتبہ' اپنا سب کچھ دے دیا' اپنی ساری دولت جاگیر کا منتظم بھی بنا دیا اور آج جب اسے آپ کی ضرورت ہے' جب اسے آپ سے کچھ چاہیے تو آپ اسے دھتکار رہے ہیں۔ اس کا وہ ماضی کھنگالنے بیٹھ گئے ہیں' جس کے لیے آپ نے اس گھر کے ملازموں تک کو قسمیں دے رکھی تھیں کہ کوئی اسے نہیں کریدے گا۔"

وہ ان ہی کا خون تھی' ان ہی کے زیر سایہ پل کر جوان ہوئی تھی۔ آج اگر وہ ان کے سامنے بنا ڈگمگائے کھڑی تھی تو یہ انہی کی ضد' ہٹ دھرمی اور اعتماد کا عکس تھا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ ان کی ہر تدبیر رائیگاں جا رہی تھی یعنی اب انہیں وہ انتہائی قدم اٹھانا ہی ہو گا' جس سے وہ اب تک نظریں چرا رہے تھے۔

علی عباس اگرچہ بیٹوں سا ہی تھا مگر لے پالک تھا۔ اگرچہ اس نے ہمیشہ ان کا مان رکھا تھا' ان کی ہر ایک بات مانی تھی' مگر بہرحال ان کے اندر کے روایتی ملک کی انا انہیں اس بات سے روک رہی تھی کہ وہ اپنے معاملات سلجھانے کے لیے اس کی خدمات حاصل کریں۔ اگرچہ وہ خونی رشتوں سے بڑھ کر مخلص اور اولاد سے بڑھ کر فرماں بردار تھا مگر۔ غیر تھا۔ اور غیر سے مدد لینے کا خیال ہی ان کے لیے سوہان روح تھا۔

"لالہ! آپ کی ذات میں بھی ایک ادھورا پن تھا' ایک خلا تھا۔ مت بھولیں کہ یہ علی عباس ہی ہے' جس نے اس خوبی سے اس خلا کی پیوند کاری کی کہ کسی کو اس کے غیر حقیقی ہونے کا شبہ تک نہیں گزرتا۔ لالہ! آج اگر آپ اس کے سر پر دست شفقت رکھ لیں گے تو اس کی ذات بھی مکمل ہو جائے گی ورنہ اس میں ہمیشہ کے لیے ایک ادھورا پن رہ جائے گا اور اس کے ذمہ دار آپ ہوں گے صرف آپ۔ اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے ختم مت کریں۔ وہ مر جائے گا' ختم ہو جائے گا۔"

بات کے اختتام تک اس کا لہجہ گلوگیر ہو گیا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ فقرہ مکمل کر سکی اور پھر وہاں سے بھاگ آئی۔

تاریخ ایک جاگیردار کے ہاں جنم لینے والی ایک اور کہانی کو اپنے سینے میں محفوظ کر رہی تھی۔

ملک عباس کی آنکھوں سے انگارے بن کر شعلے لپکاتا انکار۔

علی عباس اور مہوش ملک کی معصوم نظروں کی التجا۔

مقابلہ ان دونوں کے بیچ تھا۔ فیصلہ مستقبل کے دامن میں کہیں چھپا ہوا تھا۔

نہ معلوم انکار کی قطعیت اپنا غرور پاش پاش ہونے سے بچا پائی یا پھر بھولی بھالی سی معصوم سی درخواست اپنا وجود تسلیم کرانے میں کامیاب ہونے والی تھی؟

☼ ☼ ☼

"لالہ! کیا سوچ کر آپ شاہ دار کو بلا رہے ہیں؟" وہ بجلی کی سی رفتار سے لاؤنج میں داخل ہوئی اور کڑے تیوروں سے سوال کرنے لگی۔

"میں بعد میں بات کرتا ہوں۔" ملک عباس اس کے آنے سے قبل فون پر مصروف تھے۔ اس کے کڑے تیوروں سے گھبرا کر انہوں نے فون بند کر دیا اور بولے۔

"یہ سوچ کر کہ تمہارا ولی ہوں' ملازم نہیں۔ جس کے ذمے صرف پال پوس کے جوان کرنا تھا۔ جواب دینا ہے' کل تمہارے والدین کو۔"

"اچھا! کیا جواب دیں گے؟ یہ کہ ان کی بیٹی کی خواہش جو اس کے لیے زندگی موت کا مسئلہ تھی' وہ آپ نے اپنی انا کی بھینٹ چڑھا دی؟" مہوش نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں' یہی جواب دے لوں گا۔ کم از کم تمہارے باپ سے یہ تو نہیں کہنا پڑے گا نا کہ آپ کی بیٹی کو کسی طوائف زادے سے بیاہ آیا ہوں۔"

"اچھا! تو پھر اپنے باپ کو کیا جواب دیں گے؟ کیا آپ کا باپ سوال نہیں کرے گا کہ کیوں ایک طوائف زادے کو میرا نام' میرا حوالہ دے آئے؟"

"میرا باپ تمہارا بھی کچھ لگتا ہے' شرم و حیا تو رہی نہیں' ادب لحاظ کا ہی پاس رکھ لو۔" ملک عباس آگ بگولہ ہو گئے۔

"میں بھی تو آپ کی کچھ لگتی ہوں۔ اگر میں بے حیا' بدتمیز ہوں تو آپ ہی نرمی برت لیجیے۔ دکھا دیجیے اپنی وسیع النظری' شعور اور پیار۔"

"جو تمہیں چاہیے وہ نرمی یا پیار نہیں' بے جا ڈھیل ہے' جو ملکوں کی بیٹیوں کو کبھی نہیں ملا کرتی۔"

"ایک بات جان لیجیے لالہ! میری رگوں میں بھی ایک ضدی ملک کا خون ہے۔ حرام موت مر جاؤں گی خود کو قربان نہیں کروں گی۔"

وہ قطعی انداز میں کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑے عباس اطہر اس کے جاتے ہی ڈھے سے گئے۔ نہ جانے کیوں انہیں لگنے لگا تھا کہ مہوش کی سرکشی ان کے اندر عالم نزع کی سی کیفیت کشید کر رہی ہے۔

☼ ☼ ☼

"کب آؤ گے؟" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"جلدی ہی۔" علی عباس کی تسلی دیتی آواز ماؤتھ پیس پہ ابھری۔

"میں تھکنے لگی ہوں۔"

"ابھی سے؟" علی عباس نے گردن موڑ کر دیوار پہ لٹکے کیلنڈر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں' ابھی سے۔" اس نے جیسے ہتھیار ڈال دیے۔

"تم آ جاؤ نا' مجھے لے جاؤ۔" علی عباس اس کی بات کے جواب میں اتنی دیر خاموش رہا کہ اسے لگا لائن کٹ

گئی ہے۔

"سن رہے ہو؟"

"ہوں۔ ہاں۔" وہ غائب دماغی سے ہی سہی مگر سن رہا تھا۔

"تو بولتے کیوں نہیں؟ کہو نا کہ لے جاؤ گے۔ کہو نا کہ آجاؤ گے۔ کہو نا کہ مجھے اکیلا نہیں چھوڑو گے۔" شدت جذبات سے اس کی آواز قدرے اونچی ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے کمرے کے قریب سے گزرتے ملک عباس ٹھٹک کر رک گئے۔

"لے جاؤں گا۔ آجاؤں گا۔ کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔" اس نے بالترتیب اس کی ساری باتوں کے جواب دیے۔

"علی عباس! تم مجھے نہیں چھوڑو گے نا؟" خدشات میں گھرا' واہموں سے بھرا' بے یقین لہجہ۔

"نہیں چھوڑوں گا پگلی! کتنی بار بتاؤں؟"

"چاہے لالہ ہی کیوں نہ مجبور کردیں؟"

"تمہاری چاہ سے بڑھ کر کوئی مجبوری نہیں ہے میری۔"

"لالہ! تمہیں فورس کریں' تب بھی تم پیچھے نہیں ہٹو گے نا؟"

"وہ مجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگتے' مشورہ اور مدد بھی نہیں' ہمدردی اور دوستی بھی نہیں' پیار اور محبت بھی نہیں' اگر وہ تمہیں متزلزل نہ کرپائے تو سمجھو جیت ہماری ہے۔"

"تم نہیں جانتے میرے دل کے جس پلڑے میں تم ہو' اٹھنا اس کے نصیب میں لکھا ہی نہیں۔ اس کے مقابل چاہے ساری دنیا آجائے یا موت' کوئی چیز اسے بے وزن نہیں کرسکتی۔ میں تمہارے ساتھ جینا چاہتی ہوں' تمہاری ہو کر مرنا چاہتی ہوں' مجھے اپنا لو گے نا؟ انکار تو نہیں کرو گے نا؟ بولو نا علی عباس! میں تمہاری زندگی ہوں نا؟ تمہاری زندگی تمہارے در پر سائل بن کر کھڑی ہے' جھولی بھر دو گے نا؟ بولو نا' بھر دو گے؟"

وہ جنونی کیفیت میں بنا رکے مسلسل بولے جارہی تھی۔ یوں تو اس کے لفظ علی عباس سے سوال کررہے تھے مگر وہ اتنا بھی نہیں رکی کہ اس کا جواب سن سکے۔ اس کی آواز بھرا چکی تھی اور آنکھیں نم ہو چکی تھیں مگر وہ ایک ہی طرح کا مفہوم رکھتی باتوں کی تکرار کیے جارہی تھی۔ اس کے بے ربط جملے اور ناہموار سانسیں اس کی ذہنی ابتری کا ثبوت تھے۔

"تم میرا سکون ہو علی! تمہارا ساتھ ہی میری راحت ہے' تمہارا نام ہی میری تکمیل ہے۔ مجھے اپنا حوالہ دے دو۔ تمہارے بابا جانی کہہ دیں تب بھی انکار نہ کرنا۔ میرے لالہ کہہ دیں تب بھی انکار نہ کرنا ملک عباس اطہر کہہ دیں تب بھی انکار نہ کرنا۔ میں جانتی ہوں تم مقروض ہو مگر خدارا مجھے بلی چڑھا کر کوئی بار مت اتارنا۔"

وہ علی عباس کی روح تک کا سفر کر آئی تھی۔ اس سے بہتر اسے کوئی نہیں جانتا تھا' نہ جان سکتا تھا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ ادھورے سے علی کو اپنا تعارف دے کر ملک عباس نے اس کی ایسی تشنگی مٹائی ہے' جس کے بدلے میں وہ اپنی سانس تک ان کے ہاں گروی رکھنے پر رضامند ہو جائے گا۔ وہ علی عباس کی سرشت سے واقف تھی۔ ملک عباس نے تو محض نظریہ ضرورت' ازراہ ہمدردی اور حصول جنت کے لیے اسے اپنا نام دیا تھا مگر علی عباس نے خلوص نیت سے ٹھان لیا تھا کہ وہ ان کا بن کر رہے گا' ان کا ہو کر جیے گا۔ اس نے اپنی ذات ختم کر ڈالی تھی۔ اس نے اس خوبی سے علی کو ملک علی عباس اطہر کے قالب میں ڈھالا تھا کہ اس کا "حوالہ" ملک عباس کے لیے فخر بن گیا تھا' مگر خود علی عباس ان کے لیے کیا تھا؟

ملکیت۔ صرف ملکیت۔

وہ لے پالک تھا۔ وہ بھول چکا تھا اس بات کو مگر ملک عباس کو یہ یاد تھا کہ وہ غیر ہے۔ اس کا ان سے خونی رشتہ فقط اس حد تک تھا کہ اس کی رگوں میں دوڑتا خون ان کے احسان کا رہون منت تھا۔ وہ ان کے ٹکڑوں پہ پلا تھا مگر انہوں نے کبھی بھی نہیں جتایا تھا۔ گویا ان کے لاشعور میں یہ بات پہلے سے کہیں موجود تھی کہ کسی بھی وقت یک مشت وصولی کی نوبت آسکتی ہے لہٰذا وہ اس شان بے نیازی سے دیتے رہے تھے کہ وقت تقاضا مقروض حیل و حجت بھی نہ کرسکے اور پھر وہ وقت آہی گیا جب انہوں نے رات گئے بہاول پور سے لوٹنے والے علی عباس کو علی الصبح طلب کیا اور پوچھا۔

"تم مہوش کو انکار نہیں کرسکتے علی عباس؟"

☼ ☼ ☼

آج لالہ رخ آئی تھی مہوش صبح ہی سے اسے لیے اپنے کمرے میں گھسی ہوئی تھی۔ علی عباس کی طویل چپ اور مہوش کے جنون کے توں رنگ ڈھنگ نے انہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا تھا لہٰذا انہوں نے قصد کیا کہ وہ لالہ رخ سے اس بابت بات کرکے مہوش کو سمجھانے کی تاکید کریں گے۔ وہ اپنی انا پر اتنی سی چوٹ تو سہ سکتے تھے کہ کسی سے مدد مانگ لیتے مگر ایسی کاری ضرب انہیں کسی صورت گوارا نہ تھی' جو مہوش ملک کے مطالبے کے آگے ہتھیار ڈالنے کی صورت ان کا مقدر بنتی۔

لالہ رخ سے مدد لینے کا فیصلہ کرتے وقت انہیں اپنے اعصاب بہت کمزور پڑتے محسوس ہوئے۔ وہ گزشتہ کئی راتوں سے بے خوابی کا عذاب جھیل رہے تھے۔ ان کا بی پی ہمہ وقت ہائی رہنے لگا تھا۔ کاروباری معاملات کی دیکھ بھال تو عرصہ دراز سے علی عباس کررہا تھا مگر آج کل وہ خود کو اتنا کمزور' نقاہت زدہ اور غائب دماغ محسوس کررہے تھے کہ گھرداری' دنیا داری اور دینداری کو بھی وقت نہیں دے پارہے تھے۔ ٹینشن ان کے لیے ایک ایسا کرب تھی جس نے انہیں نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ جلد سے جلد اس معاملے کا تصفیہ چاہتے تھے' جب ہی انہوں نے مہوش کے کمرے کا رخ کیا۔

"لالہ کی ایموشنل بلیک میلنگ سے وہ ڈگمگائے گا تو ضرور مگر پیچھے نہیں ہٹے گا۔"

مہوش پریقین لہجے میں لالہ رخ سے کہہ رہی تھی۔ عباس اطہر ان کی گفتگو سننے کے لیے دانستہ طور پر رک گئے اور دروازے پر دستک دینے کے لیے بڑھا اللہ بخش کا ہاتھ بھی واپس اپنی جگہ پر آگیا۔

"کتنے لاڈوں سے پالا ہے انہوں نے تم دونوں کو' تم لوگ ان کی ایک خوشی کا خیال نہیں کرسکتے؟" لالہ رخ تاسف بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

ملک صاحب کو گونا گوں ڈھارس ہوئی اس کی بات سن کر۔

"ان کی ایک خوشی ہماری پوری زندگی پر محیط ہے اور پالا ہے تو احسان نہیں کیا۔ والدین ہی بچوں کو پالتے ہیں۔" بے پروا سا ہٹ دھرم سا لہجہ تھا۔

"پالتے ہیں' ضرور پالتے ہیں' مگر وہ سرپرست جو حقیقی والدین نہ ہو کر بھی والدین کی سی محبت اور شفقت دیں ان کی پرورش ہمارا حق نہیں ہمارے اوپر احسان ہوتا ہے' قرض ہوتا ہے' جسے اتارنا ہمارا فرض ہوتا ہے۔"

لالہ رخ نے ایک کڑوی حقیقت کو تلخ سے پیرائے میں اس کے سامنے رکھا۔ ملک عباس کے چہرے پر بھی ایک تاریک سا سایہ لہرا کر گزر گیا۔

"تو کریں وصول اپنی اجرت۔ لے لیں میری ساری جاگیر' دولت' جائیداد' مگر دھونس تو نہ جمائیں۔ میری زندگی تو نہ مانگیں میری پرورش کے بدلے۔ اتنا ہی ناقابل قبول تھا وہ تو کیوں اٹھا کر لے آئے تھے اسے گھر؟ لوگوں کی واہ واہ لینے کے لیے تو اسے بیٹا بنا لیا' مگر بہن کی خاطر اسے بہنوئی نہیں بنا سکتے؟ یہ کیسا تضاد ہے؟ بولو۔ بتاؤ۔"

وہ لالہ رخ کو جھنجوڑ رہی تھی۔ اس سے جواب طلب کررہی تھی مگر اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ ان دونوں سے چند قدموں کے فاصلے پہ کھڑے ملک عباس اطہر کے چہرے پہ یکدم ہی زردی کھنڈ گئی تھی۔ اللہ بخش کو آگے بڑھ کر انہیں سہارا دینا پڑا۔

"مگر کیسی بہن؟ ہونہہ! سگی ہوتی تو درد ہوتا نا انہیں میرا۔"

وہ سفاکی سے کہہ رہی تھی۔ ملک عباس نے اللہ بخش کو واپس مڑنے کا اشارہ کیا۔ جانے سے پہلے انہیں لالہ رخ کی آواز سنائی دی' وہ کہہ رہی تھی۔

"ہاں! اگر ہوتیں تو تمہیں بھی درد ہوتا" احساس ہوتا ان کا' کیونکہ بہنیں تو جان وار دیا کرتی ہیں' مگر تم۔۔۔ ڈس گسٹنگ۔"

"علی کو بلاؤ اللہ بخش!" وہ بدقت بول پائے۔ ان کی آواز بے حد دھیمی تھی۔ اللہ بخش نے انہیں لاؤنج میں ہی صوفے پہ بٹھایا اور خود علی عباس کے کمرے کی طرف بھاگا۔

"بابا!" وہ بھاگتا ہوا آیا تھا اور آتے ہی زمین پر بیٹھ کر اس نے اپنے ہاتھ ان کے گھٹنوں پر رکھ دیے۔

"ڈاکٹر کو فون کرو اللہ بخش!" اس کے لہجے میں جہاں بھر کی پریشانی در آئی۔ وہ ہاتھ سے سینے کی بائیں جانب کو ہلکا سا مَل رہے تھے۔ ان کی رنگت بدل رہی تھی۔

"مقبول سے کہو گاڑی نکالے۔" وہ ان کے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو رگڑتا ہوا متفکر لہجے میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں خوف سے وحشت در آئی تھی۔

"میرا اپنا بیٹا ہوتا تو۔۔۔" وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکے۔ ان کی سانس اکھڑ رہی تھی۔

"میں ہوں نا بابا! آپ کا علی عباس! آپ کا اپنا بیٹا!" اس نے لفظ اپنا پہ خاصا زور دیا۔ جواباً ان کے لبوں پہ ایک لکیر سی نمودار ہوئی' جو مسکان تو بالکل نہیں استہزا ضرور تھا۔

"اللہ بخش' مقبول۔۔۔!" وہ باآواز بلند چیخا۔

"کیا ہوا؟" مہوش اور لالہ رخ بھاگتی ہوئی آئی تھیں۔ وہ دونوں ہی سراسیمہ تھیں۔ مہوش بھی علی عباس کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گئی۔

"لالہ۔۔۔ لالہ۔۔۔!" اس نے ان کا نڈھال ہوتا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ بے تابی سے ان کی بے دم ہوتی آنکھوں میں زندگی کی رمق تلاش کرنے لگی۔

"لالہ رخ! پانی لاؤ۔"

"م۔۔۔ میں اسے۔۔۔ تمہارے۔۔۔ ساتھ بیٹھا ہوا بھی۔۔۔ نہیں دیکھ سکتا۔" وہ لاچاری سے کہہ رہے تھے۔

علی عباس بدک کر اس سے دور ہو گیا۔ مہوش نے لحظہ بھر کو بے یقینی سے اسے دیکھا مگر پھر فوراً "لالہ رخ" کی جانب متوجہ ہو گئی' جو پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھا رہی تھی۔

اس نے لالہ رخ کے ہاتھ سے گلاس لے کر ان کے لبوں کو لگایا۔ انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ گلاس اس کے پاؤں کے بالکل قریب آکر گر گیا۔ اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔ اس کی اس حرکت پہ ان کی گردن نے خفیف سی حرکت کی اور رخ موڑ لیا۔ وہ سن ہو گئی۔ نہ جانے مزید کیا ہوا تھا' شاید اللہ بخش اور مقبول آ گئے تھے یا شاید وہ لوگ ادھر سے انہیں آوازیں ہی لگاتا رہ گیا۔ شاید لالہ رخ نے اسے کندھوں سے تھام کر زمین سے اٹھا لیا تھا یا شاید وہ چپکے سے اپنے گھر چلی گئی۔

شاید لالہ نے آخری وقت اس کی طرف دیکھا تھا' اپنی مخصوص محبت پاش نظروں سے یا شاید وہ روٹھے روٹھے ہی چل دیے۔

☼ ☼ ☼

اس نے اپنی ویران نظریں قد آدم آئینے کی طرف اٹھائیں اور اپنا عکس دیکھا۔ اس کا جسم سر سے پاؤں تک کئی رنگوں میں رنگا تھا۔ کئی خوشبوؤں میں بسا تھا۔ عروسی لباس کا رنگ' کنگنوں کا رنگ' مہندی کا رنگ' نیل پالش کا رنگ۔۔۔ مہنگے پرفیوم کی خوشبو' کاسمیٹکس کی خوشبو' تازہ پھولوں کی خوشبو۔۔۔ مگر نہ جانے کیوں اسے حزن و یاس کا رنگ سب سے گہرا محسوس ہوا' نہ جانے کیوں اسے لگا کہ اس کے وجلے دھلائے وجود سے کافور کی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی ہے۔

قدموں کی چاپ سنائی دی۔

"علی!" اس کی بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں نے بے آواز پیش گوئی کی۔ کتنی خواہش تھی اس کی کہ اسے اس روپ میں سب سے پہلے وہی دیکھے اور مبہوت ہو جائے۔

اس کی خواہش کا پہلا حصہ پورا ہو گیا' وہ ہی آیا تھا۔ نہ جانے اس کی ایسی کتنی ہی چھوٹی چھوٹی خواہش

بروقت پوری ہوتی رہی تھیں جن کے بدلے قدرت نے اس کی سب سے بڑی خواہش رہن رکھ لی۔

وہ آیا ضرور تھا مگر مبہوت نہیں ہوا تھا۔ اللہ بخش اس کے پیچھے ہاتھ باندھے مؤدب سا کھڑا تھا۔

"یہ کچھ رقم رکھ لیں۔" اس نے ذرا سا آگے بڑھ کر نوٹوں کی ایک گڈی اسے تھمائی۔

مہوش نے خاموشی سے وہ اس کے ہاتھ سے لے لی اور اپنی کلائی پہ بندھے پاؤچ میں دھنسانے لگی۔ ذرا سی تگ و دو کے بعد ہی وہ نوٹوں کو اس میں منتقل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ علی عباس اس ساری کارروائی کے دوران نازک سی سینڈل میں مقید مہندی اور نیل پالش میں رنگے اس کے پاؤں کو دیکھتا رہا۔ نہ جانے کب، کتنے برس پہلے اس نے اسے یونہی مضطرب انداز میں پاؤں کے انگوٹھے کو اسی طرح دائیں بائیں حرکت دیتے دیکھا تھا، جیسے وہ آج دے رہی تھی۔

"اللہ آپ کو خوش رکھے۔"

علی عباس نے اس کے سر پر رکھنے کے لیے ہاتھ ضرور بڑھایا تھا مگر اس کی بڑی انگلی کی پور کی گانٹھ مہوش کے کامدار دوپٹے پہ جڑے ایک موتی سے نگینے کے ساتھ مس ہوتے ہی ہمت ہار بیٹھی اور اس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ مہوش کی آنکھ سے آنسو نکل کر رخسار تک آ گیا۔ علی عباس کا دل چاہا، وہ ایک بار نظر بھر کر اسے دیکھ لے مگر اس نے اس خواہش کا بھی لمحہ بھر میں گلا گھونٹ دیا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔

"علی!"

مہوش کے لب پھڑپھڑائے مگر آواز نہیں نکلی، وہ پھر بھی رک گیا۔ اس کے دل میں شدید ترین خواہش پیدا ہوئی کہ وہ رخ موڑ کر اس کی بات سن لے مگر وہ مجبور تھا۔ اس کی پشت پہ اللہ بخش کی موجودگی اسے یہ احساس دلاتے رہنے کے لیے کافی تھی کہ وہ ملک علی عباس اطہر بن چکا ہے۔ مہوش کا علی کہیں کھو گیا ہے۔ وہ بے بسی سے لب چبانے لگا۔

اللہ بخش اس کے یک لخت رکنے پر ٹھٹکا۔

"اکیلے نہ رہنا۔" مہوش نے بے آواز التجا کی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

اللہ بخش نے متلاشی نظروں سے سنسان کوریڈور کو دیکھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ علی عباس کس کی بات پہ رک کر سر ہلا رہا ہے، مگر تب تک علی عباس کے قدموں نے پھر سے حرکت شروع کر دی تھی اور وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔ "مہ وش!"

علی نے چلتے چلتے اسے مخاطب کیا۔ مہوش نے چونک کر سر اٹھایا، کیا واقعی اس نے آخری بار اسے اپنے مخصوص انداز میں مخاطب کیا تھا۔

"آئی ایم سوری۔" اس نے اندر ہی اندر کہیں سرگوشی کی۔

"کبھی معاف نہیں کروں گی۔" اس نے تیزی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کی درخواست ضدی انداز میں رد کر دی۔

علی عباس نے کسی اندرونی تکلیف کی شدت سے گھبرا کر آنکھیں میچ لیں۔

☆ ☆ ☆

علی عباس جلے پیر کی بلی کی طرح اپنے کمرے میں چکر لگا رہا تھا۔ اسے کسی کل چین نہ آ رہا تھا۔ آج مہوش کی شب عروسی تھی۔ یعنی علی عباس کے لیے یہ شب گراں تھی۔ اس کی یہ شب، بیداری کی نذر ہونے والی تھی۔ اسے ساری رات سلگنا تھا۔

ادھ کھلی کھڑکی سے جھانکتے چاند کو دیکھنے لگا۔

"مہ وش!" اس کے لبوں سے سسکاری سی نکلی۔

"کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ بابا ہمیں منع کرنے کے بجائے ہمارے سر پر دست شفقت رکھ دیتے۔ میں مزاحف (مسخ شدہ) کیوں ہوں۔ مزاحف رہنا میرے ہی مقدر میں کیوں لکھا تھا۔ میں وہاں پیدا ہوا جو جگہ میرے لیے نہیں تھی، میری اصل نہیں تھی۔ میں وہاں بھی اپنی اصل شبیہہ، اپنی اصل حالت سے دور تھا اور یہاں بھی میں اپنے مرکز سے دور رہا۔ کتنا بدنصیب ہوں میں، اپنے محور کے گرد گردش ہی نہ

کر سکا۔ ہر جگہ مجھے میری ذات مسخ شدہ ملی۔ ہر حوالہ لاکھوں تبدیلیوں کا سفر کرتے ہوئے مجھ تک آتا ہے۔ کاش! بابا نے مجھے ضرورت کے بجائے محبت سے اپنایا ہوتا۔ ان کا خیال ان کی پرواہی تو تھی، جو انہوں نے مجھے اپنایا، مگر یہ خیال، یہ پروا ہمدردی کی شکل میں کیوں ملا مجھے۔ بابا کے لیے میں نیکیاں خریدنے کا ذریعہ تھا، مگر انہوں نے محض اپنی سرپرستی میں لے لینے کو ہی سب سے بڑی نیکی کیوں سمجھا۔ وہ یہ بھی تو سوچ سکتے تھے کہ نیک اولاد صدقہ جاریہ ہے اور میں ان کی اولاد ہوں۔! ہر چیز، ہر بات، ہر حوالہ ایک تغیر کے ساتھ ہی مجھ تک کیوں آتا ہے۔ میں وہاں کے لیے مس فٹ تھا تو وہاں پیدا ہی کیوں ہوا؟

وہ مجھے میرا مرکز، میرا اصل لگنے لگی تھی تو پھر مجھے ملی کیوں نہیں؟

"بابا۔ بابا! یہ آپ نے کیا کر دیا۔ ہمیشہ کے لیے مجھے میری حقیقت سے دور کر دیا۔ میں تو قطرہ قطرہ بوند بوند اس کا ہو چکا تھا بابا! کیسے سمیٹ پاؤں گا خود کو۔ کیونکر اکٹھی کر پاؤں گا اپنی ذات کی کرچیاں۔ اور ان کرچیوں سے علی عباس کی جو نئی شکل تشکیل ہوگی، نہ جانے میں اسے پہچان بھی پاؤں گا یا نہیں؟ پتا نہیں کیسا ہوگا نیا علی عباس۔ اس میں حقیقی علی عباس کا عکس ہوگا۔ یا میری نئی ذات بھی تبدیل ہو کر، مسخ ہو کر مجھ تک پہنچے گی اور میں ساری عمر اس دکھ کے ساتھ جیتا رہوں گا کہ میرا نیا جنم میرے اندر کے انسان کو مار گیا۔ مہوش کے علی کو مار گیا۔ مجھے ہمیشہ کے لیے اپنے اصل سے دور کر گیا، میری شناخت کو بدل گیا۔

مہوش سے میں نے اک روز کہا تھا کہ میرا حقیقی تعارف، حقیقی حوالہ، اصل پہچان وہی ہے جو تمہیں بھائے، پھر کیوں۔ کیوں، کیوں قدرت نے مجھے میری اصل سے دور کر دیا۔؟ مجھے مجبور کر دیا کہ میں اپنی ہی ذات کی بدلی ہوئی حالت کو برداشت کروں، میں مزاحف کیوں۔؟"

ملک علی عباس اطہر کا اندر باہر، رواں رواں نوحہ کناں تھا۔ مہوش کے علی کی موت پر۔ اب جس جسم کو اس نے تا زیست گھسیٹنا تھا، وہ مہوش کے علی کا نہیں ملک علی عباس اطہر کا جسم تھا۔

یعنی ایک مزاحف!

وہ جو انقلاب جھیل چکا ہو اپنی اصل کھو چکا ہو، مسخ شدہ۔

☆

نزہت شبانہ حیدر

دل کی راہوں کے خواب گر

ناولٹ

شاید ماریہ نے حسب وعدہ امی کو باتوں میں لگالیا تھا۔ اس نے اٹھ کر پانی کے دو تین چھینٹے منہ پر مارے پھرباہر نکل آئی۔

ٹی وی لاؤنج میں سب ہی باتوں میں مصروف تھیں۔ اسے آتا دیکھ کر ماریہ نے اس کے لیے جگہ بنائی اور اتنا تو وہ بھی جانتی تھی۔ کہ اس کی جگہ صرف وہیں پر بن سکتی ہے۔ آپی نے تو اپنی زندگی میں اتنا مصروف رہنا تھا کہ کسی دوسرے کی جگہ ذرا بمشکل ہی بن پاتی۔ آپی کی اس عادت سے سب سے زیادہ خسرو چڑتا تھا۔

"یہ جو تمہاری آپی ہیں نا۔ یہ صرف پوز کرتی ہیں۔"
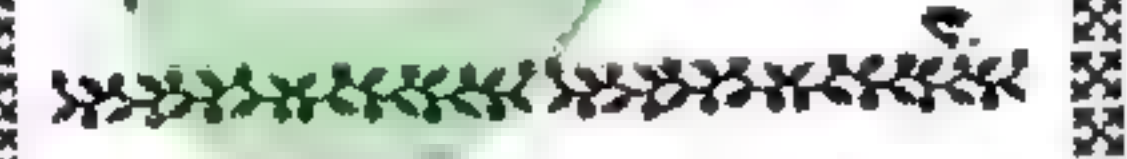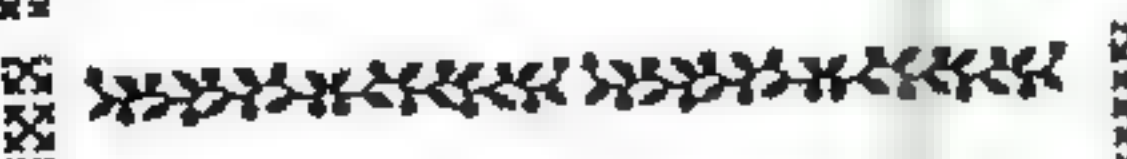
"کیا بدتمیزی ہے۔" عبیر کو بہت الجھن ہوتی تھی۔ وہ اپنی عادت سے چڑتی بھی تھی اور مجبور بھی تھی کہ کسی کی برائی بڑی مشکل سے سن جاتی تھی۔ وہ تو ایک ماسی کو بھی برابھلا کہنے کی روادار نہیں ہوتی تھی۔ علیا تو اس کی آپی تھیں۔ لیکن عالیہ مرزا جا" پوری امی بن گئی تھیں۔

"زندگی میں ہر چیز کو فاصلے پر رکھو اور بے تکلفی کی اجازت تو دنی ہی نہیں چاہیے۔"

"خسرو تو اکثر کہتا ہے کہ اگر اس گھر میں عبیر نہ ہو تو کوئی یہاں قدم بھی نہ رکھے۔"

"اچھا چپ بھی ہو جاؤ۔" اسے اپنے آپ کا موضوع گفتگو بن جانا بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

"میں نے اپنی زندگی میں تم سے زیادہ احمق لڑکی نہیں دیکھی۔ ساری دنیا کو اپنی تعریفیں سننا پسند ہوتی ہیں لیکن تم تو جانے کس مٹی کی بنی ہوئی ہو۔"

"بات یہ ہے خسرو! کہ تعریفیں اگر وہاں سے آئیں جہاں سے توقع نہ ہو تو اچھی بھی لگیں۔ تمہارے منہ سے تو کوئی بات بھی نئی نہیں لگتی۔"

"کیا مطلب ہے؟" خسرو نے آنکھیں نکالیں۔

"تمہارا مطلب ہے کہ زندگی میں کچھ نیا آنا چاہیے۔ کچھ نئے لوگ کیونکہ تم ہم لوگوں کی شکلیں دیکھ کر بور ہو گئی ہو۔"

"پلیز فضول بکواس نہیں کرو۔" اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ اس کے دل کی کسے خبر تھی وہ تو صرف اتنا چاہتی تھی کہ کبھی امی بھی اسے سراہیں۔

دو لفظ پیار کے۔۔۔ پیار کے لفظ تو بہت دور کی بات ہے۔۔۔ وہ تو بہت عجیب سی باتیں کرتی تھیں۔

کبھی کبھی تو عبیرہ پھپھو سے پوچھتی کہ کیا امی ہماری سگی امی ہیں تو پھپھو ہنس کر اسے لپٹا لیتیں۔

"پاگل ہو گئی ہے بالکل۔ بیٹا! سب ماؤں کے الگ انداز ہوتے ہیں ذکیہ تم سے بہت پیار کرتی ہے مگر ذرا مختلف انداز ہے اس کا۔"

وہ چپ چاپ پھپھو کی شکل دیکھے جاتی۔ عادت نہیں تھی ورنہ ضرور پوچھتی کہ۔۔۔

"پھپھو! پیار کے سارے انداز ہر بندے کو پتا ہوتے ہیں۔۔۔ یہ کس طرح کا پیار ہے؟"

ایسے میں اگر خسرو اسے دیکھ لیتا تو ٹھنڈا پانی لا کر اس کے سامنے رکھ دیتا۔

"خاموشی سے پانی پی لو تاکہ تھوڑا ریلیکس ہو جاؤ۔"

"میرے آرام کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ پانی تو ایسے لا کر رکھا ہے جیسے فالودہ یا جوس ہے۔" اس نے جل کر کہا۔

"اوہو! فالودہ یا جوس کون سی بڑی بات ہے۔ رات کو چلنا۔ آغا جوس ہاؤس پر کھلا دوں گا۔"

"مجھے کہیں نہیں جانا۔ بھوکی نہیں ہوں اور نہ تمہارے طعنے سننے کا شوق ہے۔"

"یہ تمہیں ہر بات طعنہ کیوں لگتی ہے؟ کیا یہ خانہ بالکل خالی ہو گیا ہے۔" خسرو نے آہستہ سے اس کے سر کو چھوا۔ وہ کہہ ہی نہیں سکی کہ دماغ خالی نہیں ہے دل خالی ہے۔

خسرو اس کی اٹھتی گرتی پلکوں کو غور سے دیکھتا رہا۔

"تم بہت اچھی ہو عبیرہ! اگر میچور نہیں ہو۔ مجھے لڑکیاں میچور اچھی لگتی ہیں۔"

"کیا ہو گیا ہے؟" ماریہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔ "خسرو! تم پھر اس کے پیچھے پڑے ہو گے۔"

"کیا مجھے ایسا ہی سمجھ رکھا ہے۔ لڑکیوں کے پیچھے پڑے رہنے والا۔" خسرو نے غالباً "برا مان کر کہا۔

"میں تو ان بی بی کو کچھ سمجھا رہا تھا۔"

"اور تمہاری بات اس نے ضرور سمجھ ہی لینی ہے۔"

"بے شک نہیں سمجھے مگر میں اپنا فرض ادا کرنے پر مجبور ہوں۔"

"توبہ۔۔۔ تمہارا جملہ تو ایسا ہے جیسے "مجبور آپ سے دور رہنے پر مجبور۔"

دونوں بہن بھائی اسی طرح لڑتے تھے۔ اسے پھپھو کا گھرانہ اسی لیے اچھا لگتا تھا۔ یہاں زندگی تھی۔ محبت تھی۔ اس کے اپنے گھر میں کیا تھا۔ نہ زندگی تھی نہ محبت۔

☼ ☼ ☼

کھانا کھا کر جو لیٹے تو اٹھتے اٹھتے شام کے چار بج گئے۔

"اف خدایا!" اس نے بوکھلا کر ماریہ کو جھنجوڑا۔

"ماری! تمہیں پتا ہے میں امی سے کیا کہہ کر آئی تھی۔"

"کیا کہہ کر آئی تھیں؟" ماریہ نے جماہی روکی۔

"ماریہ! کیا تمہیں امی کا پتا نہیں ہے۔ وہ دس ہزار دفعہ جرح کریں گی۔"

"پھر علیا آپی۔ وہ تو امی سے بھی چار ہاتھ آگے ہیں۔ تمہیں پتا ہے ناں وہ تو سیدھا سیدھا شک پر اتر آتی ہیں۔ آج کل کا زمانہ۔ آج کل کے حالات۔۔۔ ان کی تو تان یہیں آ کر ختم ہوتی ہے۔"

"علیا آپی تو نفسیاتی کیس ہیں۔ بلکہ گھر میں سب ہی لوگ۔ پتا نہیں تم کیسے نفسیاتی مریضہ ہونے سے بچ گئیں۔"

ماریہ نے تھوڑا جھنجلا کر کہا تو وہ چپ کی چپ رہ گئی۔

وہ اسے کیا بتاتی کہ نفسیاتی مریض تو شاید وہ بھی اندر سے ہو رہی ہے۔ لیکن اس کی خبر کسی کو نہیں ہے۔ اب اسے خود اپنی ہی سوچوں سے ڈر لگتا تھا۔ لیکن بات یہ تھی کہ وہ کسی چیز کو روکنے پر قادر نہیں تھی۔ سوچوں کو دماغ میں آنے سے روکنے کے لیے اس کے پاس کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ پھر اس پر علیا آپی کی کسیلی باتیں۔

"امی! آپ کو پتا ہے وہ جو مرزا صاحب کی لڑکی تھی ناں۔"

"کون سی لڑکی؟"

"وہی جس کا آصف کے ساتھ۔۔۔" آپی دانستہ جملہ پورا نہیں کرتیں۔

"توبہ توبہ۔" امی نے مشین اٹھا کر ایک طرف رکھ دی۔

"اللہ کسی کو ایسی اولاد نہیں دے۔ ماں باپ کا نام ڈبو کر رکھ دیا۔ زمانے پر ایسی مار پڑی ہوئی ہے کہ لڑکیاں بھاگ بھاگ کر اپنی شادی رچا رہی ہیں۔"

عبیرہ نے اپنا سر کتاب میں اور گھسا لیا۔ اسے اس قسم کی باتیں بہت بری لگتی تھیں لیکن ظاہری بات ہے کہ وہ علیا آپی کا منہ بند کر سکتی تھی نہ امی کا۔

اور اب علیا آپی مرزا صاحب کے گھر کا نقشہ کھینچ رہی تھیں۔

"امی! آپ کو یاد ہے نا بیٹی کے بھاگنے پر ان لوگوں کی کیا حالت ہو گئی تھی اور بے غیرت لوگ ایسے ہیں کہ واپس اپنی بیٹی کو گلے سے لگا لیا۔"

"ہائیں! یہ کب کی بات ہے؟"

"ایک ہفتہ پہلے کی۔"

یہ اور اس طرح کی باتیں۔۔۔ وہ جھنجلا کر اٹھ جاتی۔

☼ ☼ ☼

ان کی باتیں سنتے سنتے اس کے سر میں اتنا شدید درد اٹھا کہ وہ جا کر اندر لیٹ گئی۔ اس کا شدت سے دل چاہا کہ ایک دفعہ اٹھ کر امی بھی اس کے پیچھے آ جائیں ماتھے پر ہاتھ رکھ کر خیریت پوچھ لیتیں یا صرف اتنا ہی کہہ دیتیں۔ کہ "کیا ہوا بیٹے؟"

وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے چپ چاپ لیٹی رہی لیکن کوئی بھی اٹھ کر اندر نہیں آیا۔ لیکن یہ اس کا وہم تھا۔ کوئی اندر آیا تھا۔ پھر اس آنے والے شخص نے کرسی گھسیٹی اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تم آج آئیں کیوں نہیں؟ میں انتظار ہی کرتا رہا۔"

"دھوپ بہت تیز تھی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"تیز تھی تو پھر کیا ہوا۔ اس دھوپ نے مجھے بھی تو جلایا تھا مگر میں نے تو کوئی شکایت نہیں کی۔"

"وہ بات یہ ہے کہ۔" اس کی پیشانی پسینے میں بھیگنے لگی۔ اس کے سامنے عبیرہ کی یہی حالت ہو جاتی تھی۔

"تمہارے ہاتھ اتنے ٹھنڈے کیوں ہو رہے ہیں۔"

اس نے عبیرہ کا ہاتھ تھاما۔ اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح محبت بھرا اور تھوڑا تھوڑا شکایت آمیز تھا۔ وہ جب بھی اپنی کوئی بات اسے نہیں بتاتی تھی وہ یوں ہی ناراض ہو جاتا تھا۔

"تم کیا سمجھتی ہو تم اپنی کوئی بات مجھے نہیں بتاؤ گی تو مجھے خبر نہیں ہو گی۔ مجھے تو سب سے پہلے خبر ہو جاتی ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔" اس نے لب کاٹے۔

"کوئی میڈیسن لے لو۔"

"ہاں لے لوں گی۔ کوئی آ رہا ہے۔" اس کے لہجے میں ڈر سا تھا۔

"اتنا ڈرتی کیوں ہو' چلا جاتا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد علیا آپی نے اندر جھانکا۔

"عبیرہ! امی بلا رہی ہیں۔ رات کے کھانے میں کیا بنانا ہے۔ جا کر بنا لو۔"

اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ وہ اٹھنا نہیں چاہ رہی تھی لیکن اٹھنا تو تھا اور جا کر سالن بھی بنانا تھا۔ اس کی ساری سہیلیاں بڑے مزے سے کہتی تھیں کہ۔

"ہم تو میٹرک کے بعد کھانا بنانا سیکھیں گے۔ امی کہتی ہیں ابھی صرف پڑھنے پر دھیان دو۔" اور اس کے گھر کا تو انداز ہی نرالا تھا۔

علیا آپی کو تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ انہوں نے روپیٹ کر انٹر کیا تھا' وہ بھی تھرڈ ڈویژن میں۔ اس کے بعد انہوں نے پڑھائی چھوڑ دی۔ اس کے بعد ان کا سارا وقت رسالوں کی چٹ پٹی خبریں پڑھتے اور محلے والوں کی چٹ پٹی باتیں سننے میں گزرتا تھا۔

رفتہ رفتہ یہ حال ہو گیا کہ ان کو اپنے علاوہ محلے کی ہر لڑکی بدچلن لگنے لگی۔

"وہ لپ اسٹک بہت تیز لگاتی ہے۔"

"وہ چھت پر لٹکی رہتی ہے۔"

"اس کے گھر لڑکے بہت آتے ہیں۔"

علیا آپی نے امی سے کہہ کہہ کر اس کا آنا جانا بھی محلے میں بند کروا دیا۔ پڑوس والی اسما سے اس کی بہت اچھی دوستی تھی۔ ایک دن علیا آپی نے اس کو کسی لڑکے کے ساتھ اسکوٹر پر آتے دیکھ لیا۔ بس وہیں۔ اس کے خراب کردار کا فتویٰ صادر ہو گیا۔

عبیر لاکھ رو رو کر کہتی رہی کہ وہ لڑکا اس کا صرف ماموں زاد بھائی ہی نہیں' رضاعی بھائی بھی ہے لیکن وہ علیا آپی تھیں' ایک دفعہ ان کے منہ سے جو کچھ نکل جاتا وہ پتھر پر لکیر بن جاتا تھا۔

"بس کہہ دیا۔ اب اسما سے نہیں ملنا۔ امی! آپ بھی اس کو سمجھائیے۔ بہت زبان چلانے لگی ہے۔"

"صحیح تو کہہ رہی ہے علیا! جوان جہاں لڑکوں کا گھر ہے۔ تجھے آخر اتنا گھسنے کی ضرورت کیا ہے۔"

امی کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں تھیں۔

عبیر ایک دم ڈر گئی۔

اس کے ساتھ کی لڑکیاں اب تک نونہال پڑھتی تھیں اور بچوں کا کارٹون سنو وائٹ شوق سے دیکھتی تھیں۔ صرف وہ الگ تھلگ سی رہ گئی تھی۔ پڑھتی میٹرک میں تھی اور شوق اس کے یونیورسٹی کالج کی لڑکیوں والے ہو گئے تھے۔ ہر لڑکا جو کار سے ٹیک لگا کر خوب صورت سے انداز میں باتیں کرتا ہوا نظر آ جاتا۔ یا جینز میں ملبوس ہیرو جیسے لڑکے جو اپنی بائیک پر بہت تیزی سے گزرتے اس کو یوں لگتا کہ سب اسے ایک نظر دیکھتے ضرور ہیں۔

ماریہ بھی تو یہی کہتی تھی کہ "تم تو واقعی دیکھنے کی چیز ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بہت فرصت سے بنایا ہے۔"

کاش اللہ تعالیٰ میرا ذہن بھی اتنی فرصت سے بنا ڈالتے۔ وہ اپنی سوچوں پر خود شرمندہ ہو جاتی۔ اسے پتا تھا یہ غلط ہے۔

اور یہی چیز سب سے زیادہ بندے کو مارتی ہے۔ جب آپ کو پتا ہو کہ یہ چیز غلط ہے اور دل دماغ پھر وہی کام کرے۔ اس کے لیے لڑکے صرف لڑکے نہیں رہے تھے۔ ہیرو بن جاتے تھے۔ ہیرو بھی وہی پرانے زمانے والے۔ جو محبت میں جان دے دیتے تھے اور اپنی ہیروئین کو دنیا کے ہر ظلم و ستم سے بچا لے آتے تھے۔

لیکن اسما کے بھائی تو بالکل بھائیوں جیسے ہی تھے۔ وہ ان کے گھر میں کھیل کود کر بڑی ہوئی تھی۔

ابرار بھائی' انصار بھائی۔ سب ہی اسے اسما کی طرح ہی سمجھتے تھے۔ وہ جب میٹرک میں پہنچی تب صرف یہ ہوا تھا کہ آنا جانا تھوڑا کم ہو گیا تھا۔ لیکن سب اس سے ابھی بھی ویسی ہی محبت کرتے تھے۔

وہ رات دیر تک لحاف میں سر چھپائے روتی رہی۔ آہستہ آہستہ بے آواز سسکیاں۔ اپنے رونے کی آواز صرف وہ سن سکتی تھی یا پھر کرسی پر بیٹھا ہوا وہ شخص۔

"اب کیوں رو رہی ہو' کیا پھر سے لڑائی ہو گئی؟"

اس کا لہجہ سنجیدہ تھا اور آنکھیں شرارت سے مسکرا رہی تھیں۔

"میں کوئی گندی بچی نہیں ہوں' جو لڑائی کروں۔"

اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔

"تو پھر میرے ساتھ کیوں لڑائی کرتی ہو؟"

"کب کی ہے لڑائی؟ میں علیا آپی نہیں ہوں' جو لڑتی رہوں۔"

"تم نے آپی کو بدنام کیا ہوا ہے' اتنی اچھی تو ہیں۔"

"تمہیں ہی اچھی لگتی ہوں گی' مجھے نہیں اچھی لگتیں۔"

"پاگل ہو۔ وہ تمہاری آپی ہیں۔ بہن تو پھر بہن ہوتی ہے۔"

"تم بالکل ماریہ جیسی باتیں کرنے لگے ہو۔ مجھے بھی یہ سب باتیں پتا ہیں لیکن ایک بات بتاؤں۔ یہ جو رشتے ہوتے ہیں ناں' یہ آپ نے خود سے نہیں اختیار کیے ہوتے۔ ان جبر کے رشتوں کو ہم محبت کے رشتوں میں بدلتے ہیں' اپنے عمل سے اپنی نیت سے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی کہا ہے کہ صرف مجھ سے محبت کرنا کافی نہیں' تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو اس کا ثبوت عمل سے دو۔ نماز پڑھو' روزے رکھو۔ لوگوں سے ہمدردی سے پیش آؤ۔ تب میری محبت حاصل ہو گی اور والدین یہ چاہتے ہیں کہ ہم چونکہ ان کی اولاد ہیں' لہٰذا ان کی جاگیر ہیں۔ وہ جو چاہیں ہم سے سلوک کر سکتے ہیں۔ میں امی سے محبت کرتی ہوں لیکن یہ ایسی محبت ہے جس کا ہونا نہ ہونا ایک برابر ہے۔ ماؤں کو ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

عبیر گھٹنوں پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اچھا چلو' چپ ہو جاؤ۔ میں ہوں نا۔ تمہارے سارے غم بانٹنے کے لیے۔ پھر کیوں پریشان ہوتی ہو۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے بالوں پر رکھا۔

"چلو' چپ ہو جاؤ روتے نہیں ہیں شاباش' مجھے جلدی گھر جانا ہے۔"

"کس لیے؟" اس نے شانے سے اپنا دایاں رخسار رگڑا۔

"بالکل بچوں والی حرکت۔" وہ ہلکے سے مسکرایا۔

"اب بائیں گال پر بھی یہی حرکت کرو۔ ایک آنسو کیوں بچا لیا۔"

اس نے کہتے ہوئے اس کے گال سے آنسو کا قطرہ چن لیا۔

"یہ دیکھو۔" اس نے اپنی انگلی سامنے کی جس پر ایک چھوٹا سا آنسو کا قطرہ مسکرا رہا تھا۔

"یہ بہت قیمتی ہے۔" اس نے اب آنسو کو اپنی ہتھیلی پہ پھیلا لیا۔ "میں آئندہ تمہیں روتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا۔"

"اچھا جانے دو۔ اب نہیں رووں گی۔" اس نے ہاتھ پھیلا کر وعدہ کر لیا۔

"لیکن خدا کے واسطے کبھی اپنی جینز بھی دھو لیا کرو۔ بہت گندی ہو رہی ہے۔"

"جب تم گھر آجاؤ گی تو خود ہی دھو دیا کرنا۔"

"اچھا' اچھا" وہ جھینپ گئی۔ "زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔"

✲ ✲ ✲

ہلکی ہلکی ٹھنڈ شروع ہو چکی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس نے لحاف بہت پہلے سے ہی نکال لیا تھا۔ اسے لحاف میں گھس کر لیٹنا اچھا لگتا تھا۔ "علیا آپی نے تو اس پر بھی بہت برا مانا تھا۔

"عبیر! تمہیں آخر تکلیف کیا ہے؟ دو مہینے پہلے سے لحاف نکال لیتی ہو۔ تمہارا بس چلے تو گرمیوں میں بھی لحاف اوڑھا کرو۔" اور حقیقت بھی شاید یہی تھی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھیں اس لیے وہ خاموش رہی۔

"لب تم اپنی دیوانگیاں عشرت کو مت دکھانا سارے خاندان میں خوب ہی ڈنکا بجے گا۔" امی کے لہجے میں ترشی تھی۔

"میں تو مہمانوں کا ویسے ہی بہت خیال رکھتی ہوں۔"

"مہمانوں کا خیال رکھنے کی ضرورت نہیں بی بی! اپنا خیال رکھ لیا کرو۔ وہ ہی بہت کافی ہے۔ میں تو مہربانی ہو گی تم ہے۔"

امی کا لہجہ بالکل بھی اچھا نہیں تھا اور اپنا قصور اسے یاد نہیں آرہا تھا۔

"امی! آپ نے جو کمرا سیٹ کرنے کو کہا تھا وہ کر دیا ہے' ڈسٹنگ وغیرہ سب کچھ تو ہو گیا ہے۔ اب کس بات سے ناراض ہیں؟"

"کون سی چادر میں نے بچھانے کو کہا تھا۔ آخر صحیح بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔"

"اچھا جو کہا تھا' وہی کر دیتی ہوں۔ اصل میں سننے میں غلطی ہو گئی۔"

"یہ غلطی آج کوئی پہلی دفعہ نہیں ہوئی ہے۔ دماغ نہ جانے کون سے عرش معلی پر رہتا ہے۔" امی بڑبڑاتے ہوئے چلی گئیں۔ وہ اٹھ کر چھوٹی تائی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

علیا آپی نے چادر نکال کر بچھا دی تھی۔ پرانی سی چادر نے کمرے کا سارا حسن ہی ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ حالانکہ یہی کمرا پہلے کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ صبح سے اس کمرے کو چمکانے میں وہ ضرورت سے زیادہ ہی تھک گئی تھی۔ اور اب صرف ذرا سی بات نے سب کیے کرائے پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ تکیے پر سر رکھ کر بے اختیار ہی رونے لگی۔

وہ اکثر اسی طرح بے اختیار رو پڑتی تھی۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ وہ روتے روتے سو گئی۔ آنکھ کھلی تو باہر سے باتوں کی آواز آرہی تھی اور کمرے کے دروازے پر کوئی ایستادہ تھا۔ وہ ایک دم سے ڈر گئی۔

"آپ کون ہیں؟" اس کی آنکھیں ابھی تک روشنی سے مانوس نہیں ہو پا رہی تھیں۔

"آپ کا تایا زاد۔ آپ کیا اکثر یونہی بیٹھے بیٹھے گم ہو جاتی ہیں۔"

"نہیں تو۔" وہ ڈر سی گئی۔ صبح ہی تو امی نے کتنی جھاڑ پلائی تھی کہ اپنے حواس صحیح رکھنا۔ میں کوئی فضول بات سننا نہیں چاہتی۔

اور ہوا کیا۔ آتے ہی جیسے سب کو خبر ہونے لگی۔ اس نے خفت سے شال کو اپنے گرد لپیٹا۔

"آپ کو سردی بہت لگتی ہے؟"

"اے اللہ!" اس نے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ "یہ انسان ہے یا جادوگر۔ ہر بات کی اس کو خبر کیوں ہو رہی ہے۔"

"آپ سے کس نے کہا؟" اب کے اس نے اپنے حواس مجتمع کر لیے تھے۔

"مجھے کون کہے گا۔۔۔ میں سارے نتائج خود اخذ کرتا ہوں۔"

"اور ضروری ہے کہ وہ صحیح ہوں؟" اس نے چڑ کر کہا۔

"صحیح ہی ہوتے ہیں۔ غلط بات ذرا کم ہی میرے منہ سے نکلتی ہے۔"

"خوش فہم" اس نے جھک کر سلیپر پاؤں میں ڈالے۔

"کیا مجھ سے کچھ کہہ رہی ہیں؟"

"جی نہیں۔" وہ کھڑی ہو گئی۔ اسی وقت تائی جان اندر آگئیں۔

"رقیہ کی بیٹیاں بہت شرمیلی ہیں۔ کمرے سے باہر ہی نہیں نکلتیں۔"

"تائی جان!" اس کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔ "میں ذرا سو گئی تھی۔ اس لیے۔" اس نے تھوک سے پہلے حلق گیلا کیا پھر تائی جان کو جواب دیا۔

"ارے بھئی یہ سونے کا کون سا ٹائم ہے جا کر اپنی بہن کو دیکھو' کب سے کچن میں لگی ہوئی ہے۔"

"علیا آپی!" اس نے حیرت سے سوچا۔ رات کا کھانا تو اس کی ذمہ داری تھی اور علیا آپی کبھی بھی اس کے حصے کا کام نہیں کرتی تھیں۔

جب بھی اس کی طبیعت خراب ہوتی' تب بھی وہ خود ہی کرتی' اس لیے کہ اسے پتا تھا۔ اسے تسلی بھی رہے گی اور پھر کون سا کوئی اس کی تکلیف پر پریشان ہونے والا ہے۔

ابھی چار دن پہلے کی ہی بات تھی۔ جب اس کے سر میں شدید درد اٹھا تھا۔ دو تین گولیاں بھی کھالیں پھر بھی یوں لگ رہا تھا جیسے سر درد سے پھٹ جائے گا۔ جس وقت وہ رات کا کھانا پکا کر ہٹی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے نیم بے ہوش ہو۔ علیا آپی اپنے کمرے میں تھیں اور امی شاید سو رہی تھیں۔ جب وہ اچانک ہی آ گیا۔

"کیا ہوا ہے؟" اس نے جلدی سے عبیر کو تھاما۔

"کچھ نہیں۔" اس نے ہاتھوں سے کنپٹیاں دبائیں۔

"پھر سر میں درد ہو رہا ہے نا؟" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

"نہیں' کچھ بھی نہیں ہو رہا۔"

"پھر جھوٹ! کیوں جھوٹ بولتی ہو مجھ سے؟" اس کا لہجہ ناراض ہونے لگا۔

"چلو آرام کرو۔ میں میڈیسن لے آتا ہوں۔"

"کہاں سے لاؤ گے۔ سردی ہو رہی ہے۔"

"ایک بات سنو' تمہیں بہت سردی لگتی ہے نا تو ضروری نہیں کہ دوسروں کو بھی سردی لگے۔ یار! ہم لوگ یوں بھی سخت جان ہوتے ہیں۔ ہر چیز برداشت کرنی چاہیے۔ سمجھ آگئی نا بات چلو شاباش۔ یہ دودھ کا گلاس پی لو۔ میں علیا آپی کی دراز میں دوائی دیکھتا ہوں۔"

"ان کی دراز سے کوئی چیز کم نہیں ہونی چاہیے۔"

"کیوں کیا تم پر چوری کا الزام آجائے گا۔ صرف ایک دوائی لینے پر۔"

"بات دوائی کی نہیں ہے۔ وہ پسند نہیں کرتیں۔ کوئی ان کی دراز کو ہاتھ لگائے۔"

"پھر باہر سے لے آتا ہوں۔" وہ کہتے ہی باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ واپس بھی آگیا۔

"باہر کچھ بھی سردی نہیں ہے۔ عبیر! تم ایسا کرو ڈاکٹر سے اپنا چیک اپ کرواؤ۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

"اچھا کروا لوں گی۔"

"کروا لوں گی۔ پرسوں یہ بات تمہاری دوست نے بھی کہی تھی نا۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا۔" وہ حیران ہو گئی۔

"تم نہیں بتاؤ گی تو مجھے پتا نہیں چلے گا؟ تمہارے متعلق ہر بات کا مجھے علم ہوتا ہے۔ سمجھ میں آیا۔" اس نے عبیر کی ہتھیلی پر میڈیسن رکھی۔

"چلو میرے سامنے کھاؤ۔"

"اور اگر نہیں کھائی تو۔"

"کھانی تو پڑے گی جناب۔۔۔ تم جانتی تو ہو نا۔ میں پھر جاؤں گا ہی نہیں اور اگر کوئی ادھر آگیا تو۔"

"کون آئے گا۔" اس کی ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ گئیں۔ "کس کو اتنی فرصت ہے۔"

"تو اس کیوں ہو جاتی ہو؟"

"نہیں تو۔" اس نے سر جھکا لیا۔
"آپ جواب کیوں نہیں دیتیں۔" خضر کی نظر میں پریشانی تھی۔
"آپ یقین کریں ـــ میں نے زندگی میں اتنی لڑکیاں دیکھی ہیں۔ اتنی لڑکیوں سے میری ملاقات رہی ہے مگر ان کی میں کوئی بھی آپ کی طرح نہیں ہوگی۔ کمال ہے اس عمر میں تو لڑکیاں اتنی شوخ اور باتونی ہوتی ہیں۔ اتنا بولتی ہیں کہ سر میں درد ہو جائے اور آپ کے پاس تو سوال کا ہی جواب نہیں۔"
"آپ نے کچھ پوچھا تھا؟"
"جی ہاں میں یہی پوچھ رہا تھا کہ آپ اداس کیوں رہتی ہیں؟"
"نہیں تو۔" وہ تیزی سے کھڑی ہو گئی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہ سوال اس نے کیا تھا اور اب خضر۔
"میں اداس نہیں رہتی۔" اس نے سنبھل کر کہنا شروع کیا۔
"لیکن کیا کیا جائے کہ شکل ہی ایسی ہے۔"
"کیسی شکل ہے؟" خضر نے سینے پر دونوں ہاتھ باندھے۔
"جیسی آپ کہہ رہے ہیں۔"
"اور آپ کو پتا ہے میں نے کیا کہا تھا۔ میں نے اداس صورت سے پہلے ایک اور بات کہی تھی۔ میں نے کہا تھا۔ اتنی خوب صورت شکل ہے، پھر اداسی کیوں ہے لیکن آپ ہماری دنیا میں کہاں رہتی ہیں۔ نہ جانے کس بات کو سوچ رہی تھیں۔ آپ کے چہرے پر اتنی چمک سی تھی کہ میں یہی سوچ رہا تھا کہ آپ کے پاس ضرور کوئی قدیم نسخہ ہائے وفا ہوگا۔"
"خضر!" تائی جان الماری کی کھٹر پٹر سے فارغ ہو چکی تھیں۔
"بہت بولنے لگے ہو۔ ذرا کم بولا کرو۔"
"کمال ہے امی! ابھی اس دن جب آپ چھوٹی خالہ کی طرف گئی تھیں تو وہاں آپ کو یہ پریشانی لاحق تھی کہ میں اتنا کم کیوں بول رہا ہوں۔ ماؤں کو چاہیے۔ ایک اسٹینڈرڈ رکھیں۔ کیوں خواب ناک شہزادی! صحیح کہہ رہا ہوں؟" وہ عبیر کی طرف متوجہ ہوا۔
"پتا نہیں۔" وہ بے بسی سے بولی۔ چار سال پہلے جب خضر آیا تھا تو اس قدر باتونی نہیں تھا لیکن اب تو جیسے وہ ہر راز جاننے پر تلا ہوا تھا۔
عبیر! تم اس کی باتوں پر نہ جانا۔ یہ یوں ہی پاگل بنا رہا ہے۔" تائی جان نے پتا نہیں یہ جانے کیوں کہا۔
"امی! ابھی تو کسی کو پاگل بنایا بھی نہیں ہے۔" اس کا انداز اب بھی وہی تھا۔ عبیر کو کسی انجانے احساس نے گھیر لیا۔ وہ ایک دم باہر نکل آئی۔
امی نماز پڑھ کر اٹھ ہی رہی تھیں۔
"عبیر! ادھر آؤ۔" انہوں نے سلام پھیر کر اسے اشارے سے بلایا۔
"کیا کہا تھا میں نے تم سے۔"
"جی کیا کہا تھا؟ سب کچھ تو کر دیا ہے۔" وہ حیران سی ہو کر امی کی شکل دیکھنے لگی۔
"تم جیسی اولاد صرف ذلیل و رسوا کرا سکتی ہے۔" امی نے دانت پیس کر آہستہ سے کہا۔
"میں نے کہا بھی تھا۔ اپنے حواسوں کو قائم رکھنا۔ تم کیا سمجھتی ہو۔ کیا اندر سے باتوں کی آواز نہیں آ رہی تھی۔"
"امی! ایسا کیا کر دیا ہے۔ تھک گئی تھی، اسی لیے نیند آ گئی تھی۔"
"پہاڑ توڑے تھے کیا؟ علیا کیا انسان نہیں ہے کب سے کچن میں لگی ہوئی ہے۔"
"مگر کیوں؟ وہ تو کبھی رات کا کھانا نہیں بناتیں۔ آپ تو جانتی ہیں پھر۔"
"مجھے نہیں پتا۔"
وہ اٹھ کر کچن میں آ گئی۔ آپی نے تقریباً ہر چیز ہی بنا لی تھی اور ہر چیز ہی بے کار بنی تھی۔ اس نے میٹرک کی چھٹیوں کے بعد انٹرنیشنل کوکنگ کلاس جوائن کر لی تھی۔
"لاؤ ان ہی میں سے کچھ بنا لوں۔"
وہ ساری سبزیاں نکال کر چوپ کرنے بیٹھ گئی۔
"اب تم کیا کر رہی ہو۔ کیا مہمانوں کو سبزیاں کھلانے کا ارادہ ہے؟"
"ان میں چکن بھی ڈالتے ہیں۔" اس نے رسانیت سے کہا۔
"چکن زیادہ نہیں ہے۔"
"جتنا ہے! اسی میں کام ہو جائے گا۔" اس نے سوپ کی چیزیں پتیلی میں ڈالتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے سوپ، فرائیڈ رائس، جلفریزی اور لبنانی کباب بھی فٹافٹ بنا لیے۔
جس وقت وہ کباب تل رہی تھی۔ اسی وقت خضر کچن میں آ گیا۔
"کیا پک رہا ہے جناب؟" اس نے ڈھکنا ہٹایا۔
"ارے!" اس نے علیا کو مخاطب کیا۔ "دیکھیں سارا گوشت تیل کے اندر گرا ہوا ہے۔ یہ کیسے گر گیا؟"
"یہ کڑاہی گوشت بنا ہوا ہے۔" علیا نے جیسے خضر کی عقل پر ماتم کیا۔
"اچھا اور آپ تیل کی کون سی ڈش بنا رہی ہیں؟" اس نے آہستہ سے عبیر کو مخاطب کیا۔
"تیل کی ڈش؟" وہ حیران رہ گئی۔ یوں بھی وہ کباب فرائی کرنے میں اتنی مگن تھی کہ اس نے علیا اور حذیفہ کے مکالمے سنے ہی نہیں تھے۔
"میں نے آپ کا نام خواب ناک شہزادی رکھا ہے تو بالکل صحیح رکھا ہے۔ آپ نے اتنی دیر سے ہم لوگوں کی باتیں ہی نہیں سنیں؟"
"وہ وہ۔" عبیر سٹپٹا گئی۔ دو دفعہ تو امی سے ڈانٹ پڑ چکی تھی کہ اپنے حواسوں میں رہنا اور اب پھر۔
"اصل میں جب میں کوئی کام کر رہی ہوتی ہوں تو ساری توجہ میری اسی کام کی طرف ہو جاتی ہے۔" اس نے جلدی سے صفائی پیش کی۔
"یعنی آپ ہر کام بہت دل لگا کر کرتی ہیں۔ اس کا دوسرا مطلب تو یہی ہوا۔"
"جی ـــ!" اس نے سر ہلایا۔
"مگر آپ نے کیا کام کیا ہے۔ ساری شام آپ کمرے میں پڑی سوتی رہیں اور اب وہاں سے نکلی ہیں تو نہ جانے کون سے کباب فرائی کر رہی ہیں۔ میں نے تو ایسے کباب کبھی کھائے ہی نہیں۔"
"کوئی بات نہیں، ماریہ شوق سے کھاتی ہے۔ میں اسے بلا لوں گی۔"
"بھئی اس بلی کو مت بلانا، کان نوچ کر کھا لیتی ہے۔" اس نے کہتے ہوئے ایک کباب منہ میں ڈال لیا اور اس وقت تو کچھ نہیں کہا لیکن رات کے کھانے پر اس نے صرف چائنیز چیزیں ہی کھائیں۔
حتیٰ کہ تائی جان بھی تیل میں ڈوبے شوربے کو دیکھ کر فرائیڈ رائس کھانے لگیں۔
"عبیر! بہت اچھا کھانا بنایا ہے۔ مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ خواب ناک شہزادی کو اتنے اچھے کھانے بنانے آتے ہیں۔"
اس کے کہنے پر عبیر نے امی کو ڈھونڈنا چاہا۔ کاش امی بھی سن لیں لیکن امی کہیں نظر ہی نہیں آئیں۔ وہ رات کا کھانا کھانے کے بعد کچن میں جا کر برتن دھونے لگی۔
اسی وقت خضر بھی ان کے پیچھے آ گیا۔ اسے پتا نہیں چلا یوں بھی شاید ـــ سب ٹھیک ہی کہتے تھے۔ کہ اسے دنیا کی خبر کم ہی ہوا کرتی تھی۔ خضر تھوڑی دیر علیا سے باتیں کرتا رہا پھر اس کی طرف پلٹ آیا۔
وہ اس وقت چھری دھو رہی تھی، جب خضر نے اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھے۔
پانی کا نلکا پوری رفتار سے کھلا ہوا تھا اور گر بھی رہا تھا لیکن دیکھتے میں پانی کا رنگ لال لال سا ہو رہا تھا۔ ایک لمحے کو تو خضر کو سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ ہوا کیا۔ پھر اس کی سمجھ میں آ گیا کہ عبیر کا ہاتھ کٹ گیا ہے۔ لیکن اگر ہاتھ کٹا تھا تو وہ تو وہیں قریب ہی کھڑا تھا۔
اس نے تو عبیر کی ذرا سی اف بھی نہیں سنی تھی لیکن یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے نل بند کیا تو شور ایک دم تھم سا گیا۔ اور اسی وقت عبیر نے چونک کر اسے دیکھا۔
"کیا کر رہے ہیں آپ؟"
"یہ سوال مجھ سے پوچھنے کے بجائے آپ نیچے نگاہ

ڈالیں تو مہربانی ہوگی اور یوں بھی میرا خیال ہے کہ آپ کا تعلق شاید انسانی نسل سے تو نہیں ہے۔
ارے اتنا خون بہہ گیا اور آپ کے ماتھے پر ذرا شکن نہیں۔ آئیے ڈریسنگ کر دوں۔"
"کوئی ضرورت نہیں' پہلے میں برتن دھولوں۔"
"کیا دماغ خراب ہے۔ بھئی علیا! کیا یہ لڑکی نارمل نہیں ہے۔ اسے ذرا جو احساس ہو۔"
"ان کو احساس ہوتا تو فکر کس بات کی تھی۔" علیا نے جلے بھنے لہجے میں جواب دیا۔
"یہ ہر معاملے میں صرف اپنی چلاتی ہیں۔ دوسروں کے سامنے مظلوم بننے کا شوق۔"
"سن لیا آپ نے' اب آپ جائیے مجھے کام کرنا ہے۔"
"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ لاؤ برتن میں دھو دوں۔ مجھے یوں بھی پریکٹس ہے۔ جب ہم لوگ جرمنی میں تھے تو ہم لڑکے زیادہ تر اپنا کام خود ہی کرتے تھے۔"
"لگتا تو نہیں کہ آپ کوئی کام کرتے ہوں گے۔"
"ارے واہ! یہ کیا بات ہوئی۔ بلکہ کھانے تو میں بہت اچھے بنایا کرتا تھا۔ یہ اور بات کہ وہ کسی کو پسند نہیں آیا کرتے تھے۔ اس لیے میرے سارے دوست مجھے زبردستی برتن دھونے پر لگا دیا کرتے تھے۔ کہتے تھے "خدا کے واسطے کھانا ہم لوگ خود بنالیں گے۔ تم صرف برتن دھویا کرو۔"
خضر سہولت سے باتیں کرتا ہوا۔ اسے کچن سے باہر لے آیا۔ اور اپنے والٹ سے سنی پلاسٹ بھی نکال کر اسے لگا دیا۔
تائی جان کا بستر امی نے اپنے کمرے میں لگایا تھا اور وہ شاید سو چکی تھیں۔
علیا نہ جانے کہاں تھی۔ وہ سنی پلاسٹ لگا کر دوبارہ کچن میں آنے لگی تو خضر نے روک دیا۔
"تم یہیں اسٹول پر بیٹھ جاؤ۔ میں بتاتا ہوں برتن دھونے کا صحیح طریقہ۔"
"میں کیا غلط طریقے سے دھو رہی تھی۔" وہ چڑ گئی۔
"غلط تو نہیں' لیکن اگر آپ برتن بھی یوں دھوئیں جیسے تھیسس لکھ رہی ہوں تو پھر وہی ہوگا جو ابھی ہوا۔"

"توبہ!" عبیر وہیں اسٹول پر ٹک گئی۔ خضر نے ایک نظر مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ چپ چاپ اسے کام کرتا دیکھ رہی تھی۔ وہ خاموش تھی لیکن خضر کو لگ رہا تھا جیسے وہ بول رہی ہے وہ جہاں سے آیا تھا' وہاں سب ہی بہت تیز بولتے تھے۔ اس کی ساری کزن پٹاخہ تھیں اور ہر ایک کو باتیں کرنے کا خبط تھا۔ لیکن یہ لڑکی نہ جانے کون سے جہاں کی تھی۔
اس کا لہجہ دھیما دھیما۔ لو دیتا ہوا تھا اور آواز کھنکھناتی ہوئی تھی۔ وہ جب بھی بات کرتی تھوڑی دیر بعد اس کا چہرہ لال سا ہونے لگتا۔ ایسا کیوں تھا۔ یہ تو خضر کی سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن اس کا وہ چہرہ اسے اچھا لگتا تھا۔ یہ بات اسے ایک لمحے میں پتا چل گئی تھی لیکن اسے اس گھر کا بھید سمجھ میں نہیں آیا تھا۔
کچھ عجیب سا اسرار تھا۔ وہ تو ایک منٹ بھی نہیں رکتا۔ لیکن اس چہرے نے کہیں جانے ہی نہیں دیا۔ حالانکہ امی بھی نہیں آنا چاہ رہی تھیں۔ انہیں اپنی دیورانی پسند نہیں تھیں لیکن یہ بابا جان کا آرڈر تھا کہ اگر کراچی جاؤ تو وہیں ٹھہرنے کا انتظام رکھنا۔
"اب سو جائیے۔ سارا کام تو ختم ہی ہو گیا۔" اس کی شفاف آنکھوں میں جیسے شکر گزاری تھی لیکن اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔
"ایک بات پوچھوں عبیر؟"
"پوچھیے۔"
"تم ہمیشہ اتنی چپ رہتی ہو؟" خضر نے اس دفعہ اسے تم سے ہی مخاطب کیا۔
"اس طرح کیوں پوچھا آپ نے؟"
"کیوں' کیا نہیں پوچھ سکتا؟"
"آپ کل ہمارے گھر آئے ہیں اور آج یہ پوچھ رہے ہیں۔ جو میرے ساتھ رہتے ہیں' کبھی انہوں نے نہیں پوچھا' آپ سے تو پھر ایک دفعہ کی ملاقات ہے۔"

"بعض اوقات ایک بار ہی کافی ہوتا ہے۔" خضر نے سنجیدگی سے کہا' پھر بات پلٹ دی۔
"تم سیکنڈ ایئر کے ایگزام دو گی نا؟"
"جی۔"
"تیاری ہے؟"
"بس۔۔۔ میں اور ماریہ مل کر کرتے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تو پوچھ لیتے ہیں۔"
"اچھا میں جب تک ہوں' مجھ سے پوچھ لینا۔"
"جی اچھا۔" اس کے تابعداری سے کہنے پر خضر کو ہنسی تو آئی لیکن اس نے ضبط کر لیا۔
"سنو!" خضر نے جاتے جاتے اسے پھر روک لیا۔
"درد ہو رہا ہے؟"
"پتا نہیں۔" اس نے ابھی آدھا ہی جواب دیا تھا کہ علیا اندر سے نکل آئی۔ "تمہیں کمرے میں جانے کا ہوش نہیں؟"
"جا ہی رہی تھی آپی!" وہ مڑ کر ایک دم اپنے کمرے میں چلی گئی۔ خضر کو علیا کے لہجے کی تلخی کا احساس ہوا۔
"وہ جا ہی تو رہی تھی۔"
"وہ نہیں جاتی' تم اسے نہیں جانتے۔" اس کے لہجے میں نفرت ہی نفرت تھی۔
خضر کے منہ میں جیسے کڑواہٹ سی گھل گئی۔ اندر آ کر بھی وہ بہت دیر تک علیا کے لہجے کے بارے میں سوچتا رہا۔
"صبح امی سے پوچھوں گا۔ عبیر ان کی سوتیلی بیٹی تو نہیں۔"
وہ نہ جانے کب تک سوچتا رہتا۔ کہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اسے کیا ہو گیا۔ ابھی اس نے برتن دھوئے اس کے ساتھ اور اب آدھی رات اس کے متعلق سوچنے میں گزار دی۔
خضر نے اٹھ کر لائٹ آف کی مگر اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔
اندھیرا کمرے میں تھا۔ اس کی آنکھوں میں تو جیسے ابھی تک روشنی سی تھی۔

☆ ☆ ☆

عبیر اپنے کمرے میں چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی کہ ایک دم ہی کمرے کے باہر آہٹ سے ہوئی۔ یہ مخصوص چاپ صرف ماریہ کی ہی ہو سکتی تھی۔ وہ ایک دم خوف زدہ ہو گئی۔
"سنو! تم جاؤ۔"
"نہیں۔" اس کے لہجے میں اطمینان ہنوز تھا۔
دیکھو پلیز! چلے جاؤ۔ تم ماریہ کو جانتے نہیں ہو۔ وہ مجھے پاگل بنا دے گی۔
"تمہیں کون پاگل بنا سکتا ہے۔" اس کے لہجے میں خفیف سی شرارت تھی۔ "تم تو بنی بنائی پاگل ہو۔"
"میں کیوں پاگل ہونے لگی۔" اس نے دوبارہ چڑ کر کہا۔
"تم نے پٹی چینج کر لی؟"
"ہاں کر لی تھی۔"
"اب درد تو نہیں ہے۔" اس نے ہاتھ بڑھایا۔
"نہیں اور پلیز اب جاؤ۔"
"ماریہ شاید علیا آپی سے باتیں کرنے لگ گئی ہے ورنہ ابھی سیدھی دندناتی ہوئی میرے کمرے میں موجود ہوتی۔"
"اچھا بابا! جا رہا ہوں۔"
ماریہ نے کمرے میں قدم رکھا تو عبیر کتاب پڑھ رہی تھی۔
"تم کیا چھوٹے بچوں کی طرح زور زور سے رٹا لگاتی ہو۔"
"نہیں تو۔"
"ابھی میں نے خود تمہاری آوازیں سنی تھیں۔"
"تمہارا تو دماغ خراب ہے' بیٹھو۔"
"نہیں میں بیٹھنے کے لیے نہیں آئی۔ مجھے کام ہے باہر چلو۔"
"میں کیسے جا سکتی ہوں۔" اس نے بے بسی سے کہا۔
"کیوں نہیں جا سکتیں؟ اللہ تعالیٰ نے یہ ٹانگیں کس لیے دی ہیں۔"
"نہیں تم میرا مطلب نہیں سمجھیں' ابھی پندرہ

دن پہلے ہی تو میں گئی تھی۔"
"پھر کیا ہوا؟" ماریہ نے کندھے اچکائے۔
"یہ تو زندگی ہے۔ ہلا گلا' شاپنگ' تفریح' پھر زندگی کو زندہ لوگوں کی طرح ہی گزارنا چاہیے۔ موت سے پہلے کیا مرنا۔"
"اچھا بس چپ کر جاؤ۔ جنہیں کچھ کرنا نہیں ہوتا' ان سے فلسفیانہ باتیں کروا لو اور میں کوئی شاپنگ پہ نہیں جا رہی۔ تم دکان داروں سے اتنی قیمت کم کرواتی ہو کہ مجھے شرم آنے لگتی ہے۔ لوٹ لیتی ہو ان بے چاروں کا۔"
"ہاں تو دنیا میں جینے کے لیے اس طرح کرنا ہی پڑتا ہے۔" ماریہ نے مصنوعی سرد آہ بھری۔ "بعد میں وہ جو آئے سارے لٹیرے آجاتے ہیں ان کے لیے بھی کچھ پیسے بچانے ہوتے ہیں یا نہیں۔ دیکھو' باتوں میں میرے ذہن سے نکل گیا۔ ابھی تم باتیں کر رہی تھیں نا!"
"تمہارا تو دماغ خراب ہے۔ کس سے باتیں کروں گی۔"
"اب یہ تو مجھے نہیں پتا۔" ماریہ نے شرارت سے آنکھیں نچائیں۔ "مگر ایک بات ہے تمہارے کمرے میں کوئی بھی آسانی سے آسکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ تمہارا کمرا بالکل الگ ہے اور پھر کھڑکی میں کوئی گرل وغیرہ بھی نہیں' ڈر تو لگتا ہو گا۔"
"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اب تو عادت ہو گئی ہے۔"
"کاہلی کو اپنی عادت کا نام مت دو۔ ایک دن کا کام ہو گا۔ کسی کو بلوا کر یہ کام کروا لو علیا نے تو بڑا زبردست سا کمرہ لے لیا ہے۔" ماریہ نے سر جھٹکا۔
"خدانخواستہ کبھی کوئی کود کر اندر آ گیا تو؟" ماریہ نے جھرجھری لی۔

☆ ☆ ☆

اس نے آپی کے کمرے میں جھانکا۔
"آپی! میں آجاؤں؟"
"کس لیے؟"
"ایسے ہی باتیں کرنے کے لیے۔"
"تم اور تمہاری باتیں۔" ان کی تیوری چڑھ گئی۔ "تمہارا جس طرح بچوں جیسا دماغ ہے نا۔ تم صرف بچوں سے ہی باتیں کر سکتی ہو۔ اونہہ!"
"نہیں' نہیں آپی! ایسی بات نہیں۔ آپ ایک دفعہ مجھ سے بات کر کے دیکھیں۔ آپ کو پتا چلے گا کہ میں بالکل بھی بچوں والی بات نہیں کرتی۔" اس نے عاجزی سے کہا۔
مگر آپی اس وقت تخت فرعون پر براجمان تھیں۔ انہوں نے اس کو جھڑک دیا۔
"جاؤ یہاں سے۔"
وہ باہر آکر چپ چاپ پلنگ پر بیٹھ گئی اور ٹانگیں جھلانے لگی۔
"عبیر! کتنی دفعہ منع کیا ہے کہ اس طرح ٹانگیں نہیں چلایا کرو' نحوست ہوتی ہے لیکن تم ... تم کبھی نہیں سمجھو گی۔ مجھے بتاؤ میں تمہیں کون سی زبان میں بات سمجھاؤں۔" امی نے غصے میں ——— آواز دبا کر کہا۔ "کیا سوچیں گی بڑی بھابھی کہ میں نے اولاد کی کیسی تربیت کی ہے۔"
"امی! آپ کو ہر وقت بس اس بات کی پروا رہی ہے کہ دوسرے کیا سوچیں گے۔ کبھی ایک دفعہ یہ بھی سوچ لیا کریں کہ میں کیا سوچتی ہوں۔ کیا کہتی ہوں۔"
اس نے یہ ساری باتیں کہہ بھی دیں لیکن وہاں اس کی باتیں سننے کے لیے کوئی موجود نہیں تھا۔ ہوتا یہی تھا کہ امی کھڑے کھڑے باتیں سناتیں اور جواب کا انتظار کیے بغیر جھٹ پٹ وہاں سے چل پڑتیں۔
ان کے اوپر بہت گہرا رنگ تھا علیا آپی کی باتوں کا۔
یہ ماریہ کی اپنی رائے تھی۔ جس سے بچپن میں تو عبیر نے کبھی اتفاق نہیں کیا تھا۔ لیکن اب وہ سوچتی تھی کہ شاید ایسا ہی ہے کیونکہ اس سے پہلے وہ یہ سمجھتی تھی کہ وہ امی کی سوتیلی بیٹی ہے اور جتنے قصے اس نے سوتیلی ماؤں کے ظلم کے پڑھے تھے۔ امی ان سے کہیں کم ظالم تھیں۔ وہ بہت زیادہ مار پیٹ نہیں کرتی تھیں۔ اندھیرے کمرے میں بھی بند نہیں کرتی تھیں۔ جس

طرح کے اس کی پڑھی ہوئی۔ کہانیوں میں سوتیلی ماں بچوں کے ساتھ سلوک کرتی تھی۔
اور بچپن کی معصومیت میں اس نے یہ ساری باتیں علیا آپی کے ساتھ شیئر بھی کر لی تھیں۔ اس وقت تو علیا نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ نہ اچھا نہ برا لیکن صرف ایک ہفتے بعد اسے پتا چل گیا کہ علیا نے اس کی باتیں بہت غور سے سنی ہیں۔ اس کی چھوٹی سی شرارت تھی یا کوئی غلطی اب اسے صحیح طریقے سے یاد بھی نہیں تھا۔ لیکن اس کی سزا اسے بہت بری ملی۔ اسے دو گھنٹے تک اندھیرے کمرے میں بند ہونا پڑا۔
اندھیرا کمرا اور دیواروں پر بنے لمبے لمبے خوف ناک سائے۔ ان کی ڈراؤنی آنکھیں تھیں اور بڑے بڑے ناخن۔ دروازہ پیٹ پیٹ کر اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ درد کرنے لگے۔
"علیا آپی! دروازہ کھول دیں۔" کی گردان سے حلق میں خراشیں پڑ گئیں اور آنسو تو کب کے بہنے بند ہو گئے تھے۔ اب صرف خوف تھا اور گھٹی گھٹی سسکیاں۔

پتا نہیں کتنی صدیاں گزریں۔ بہت ڈھیر سارا وقت تب دروازہ کھلا اور امی نے اسے گود میں اٹھایا۔
اور اس دن' زندگی میں پہلی دفعہ علیا آپی کو بڑی زبردست ڈانٹ پڑی۔ اب بھی عبیر سوچنے بیٹھتی تو اسے لگتا۔ یہ کوئی بہت پرانی بات تھی۔ جب ایسا جادو ہوا تھا کہ علیا کو ڈانٹ پڑی تھی اور وہ بھی اس کی وجہ سے۔ اس بات کے لیے وہ ہمیشہ امی کی مشکور رہتی جنہوں نے سختی سے کہا تھا کہ "آئندہ تم اسے اندھیرے کمرے میں بند نہیں کرو گی۔"
"میں اس کی دشمن نہیں ہوں۔ اس کی بڑی بہن ہوں۔ اگر کچھ کرتی ہوں تو اس کی بھلائی کے لیے کرتی ہوں۔ آپ کو پتا نہیں کیوں اتنا غصہ آرہا ہے۔"
"مجھے پتا ہے تم اس کی بڑی بہن ہو۔ اگر اس نے غلط کیا ہے یا شرارت کی ہے تو اسے ڈانٹ لو' مار لو۔"
اور علیا نے گویا یہ بات ذہن نشین کر لی۔
چھوٹی سے چھوٹی بات پر وہ اس کا منہ تھپڑ مار مار کر سرخ کر دیتی اور ماریہ اس سے کہتی "عبیر! تمہارے گال اتنے سرخ کیوں رہتے ہیں تم ضرور علیا سے چھپ کر بلش آن لگاتی ہو۔"
علیا سے چھپ کر۔ اس کا دل چاہتا بہت زور سے ہنسے۔
چھپ کر کوئی کام کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اس کی خبر عبیر کو نہیں تھی۔ کیونکہ علیا کو ہر بات پتا چل جاتی تھی۔
"کیسے اور کیوں؟ وہ اس کی کھوج میں نہیں پڑتی تھی۔ بہت بچپن سے اسے پتا چل گیا تھا کہ علیا سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں تھا۔ اس کو اپنے ددھیال اور ننھیال دونوں جگہ یکساں پسند کیا جاتا تھا۔ اس وقت تک عبیر ہر جگہ سست' کاہل' جس کا کسی کام میں دل بھی نہیں لگتا تھا اور جو ہر کام ہی خراب کر دیتی تھی' سے متعارف ہو گئی۔ اسے خبر نہیں تھی کہ خاندان میں اس کے متعلق کیا کچھ مشہور ہو گیا ہے اور اس کو اس طرح پھیلانے میں علیا کا کتنا ہاتھ ہے۔ حالانکہ اپنی اس عادت سے تو وہ خود بھی پریشان تھی۔ اس کا بھی دل چاہتا تھا کہ علیا آپی کی طرح جلدی جلدی کام کرے لیکن بچپن میں ہوئے دو دفعہ کے ٹائیفائڈ نے اس کے اندر اتنی طاقت ہی نہیں رہنے دی تھی کہ وہ ہر کام کو پھرتی سے کر لیتی۔ یہی حال پڑھنے کا تھا۔
وہ رٹا لگا لگا کر تھک جاتی۔ پھر کہیں جا کر چیزیں یاد ہونا شروع ہوتیں۔ اس وقت عبیر کا دل چاہتا کہ اپنا سر کسی دیوار سے مار دے۔
پڑھائی جیسی مشکل چیز اور پھر انسان کا ایسا دماغ' پھر ماریہ نے اسے بہت ساری چھوٹی چھوٹی دعائیں یاد کروائیں۔
"ان کو ہر نماز کے بعد پڑھ لیا کرو۔ دماغ تیز ہوتا ہے۔" اس کے علاوہ کچھ دماغی ورزشیں۔
اور علیا آپی بڑبڑاتی رہتیں۔
"پہلے تو نماز میں دل ہی نہیں لگتا تھا۔ پانچ منٹ میں نماز ختم ہو جاتی تھی اور اب پتا نہیں جانے نماز پر بیٹھی کیا کر رہی ہوتی ہے۔"

وہ ذہنیت ہی سنتی رہتی لیکن اس نے کبھی بتانے کی غلطی نہیں کی۔ بہت ساری چیزیں وقت گزرنے پر خود بخود سمجھ میں آجاتی ہیں۔ اس کو چھوٹی سی عمر میں یہ تو سمجھ میں آگیا تھا کہ علیا اس پر غصہ کرتی ہے۔ لیکن کیوں؟ اس کا جواب کبھی اسے ملا ہی نہیں اور اسے کھوج بھی نہیں تھی۔ بس کبھی کبھار دل دکھ جاتا تھا اور دل میں ایک خلش سی ہوجاتی تھی جسے وہ تھپک تھپک کر سلا دیتی تھی۔

"سگے رشتوں سے کیا بدگمانی کرنا۔" پہلی دفعہ یہ سوچ میٹرک میں اس کے دماغ میں آئی تھی اور اس سوچ کو اس نے کبھی خود کو بھولنے نہیں دیا اور ماریہ چڑ جاتی۔

"تم کسی دن پچھتاؤ گی۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ مسکرا دیتی۔ "ابھی تک تو یہ لفظ صرف کتابوں میں پڑھا ہے کبھی سامنا ہوا تو دیکھ لیں گے۔"

"اونہہ! دیکھ لیں گے۔" ماریہ اس کی نقل اتارتی۔ "انسان کو اتنا اچھا بھی نہیں بننا چاہیے۔"

"اچھا بننے کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ میں ہوں ہی اچھی۔" وہ ماریہ کو چھیڑتی۔

"تمہیں ہر بات مذاق میں اڑانے کی عادت پڑ گئی ہے۔"

یہ دوست بھی کتنی بڑی نعمت ہوا کرتے ہیں۔ حالانکہ اس نے کتابوں میں ہمیشہ یہی پڑھا تھا کہ سب سے اچھے دوست گھر والے ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کو ہر بات گھر والوں کو بتانی چاہیے لیکن یہاں ایسا ممکن ہی نہیں ہو پاتا تھا۔ امی کے مزاج میں سختی تھی پھر وہ ہر بات علیا کی نظروں سے دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ علیا جس طرح اور جو کچھ انہیں بتاتی وہ اسے وہی سمجھا کرتیں۔

نہ عبیر کی کوئی اہمیت تھی نہ اس کی بات کی اور اسے کوئی فکر بھی نہیں تھی۔ ماریہ کو اس کی خوش فکری دیکھ کر حیرت بھی ہوتی تھی اور غصہ بھی آتا تھا۔

"اس لڑکی کو کوئی بڑا واقعہ ہی راہ راست پر لا سکتا ہے۔" وہ اس وقت تو جل کر یہی سوچتی۔ لیکن بعد میں فوراً" دل سے سارے ملال نکال کر اس کے لیے دعا کرنے لگتی۔

"اللہ تعالیٰ اچھے لوگوں کے ساتھ کبھی برا نہ ہو۔"

اور پتا نہیں۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا۔ وہ بُرا ہونے کے زمرے میں آتا بھی تھا یا نہیں۔ وہ ہر چیز کو مصلحت کے خانے میں ڈال کر بری الذمہ ہو جاتی۔ اور وہ ماریہ سے بھی یہی کہتی۔

"ہم زندگی کو بدل نہیں سکتے۔ اسے قدرے کم تکلیف دہ تو بنا سکتے ہیں۔"

اور یہ کم تکلیف دہ بھی ماریہ کے خیال میں اچھی خاصی تکلیف دہ تھی۔

☼ ☼ ☼

"پتا نہیں یہ بڑی تائی جان کب تک ہمارے یہاں رہیں گی۔" علیا نے جھلا کر چیزیں پٹخیں۔

"کیوں آپی اتنی اچھی تو ہیں تائی امی۔ بہت پیار کرتی ہیں۔"

"کون بہت پیار کرتا ہے؟" علیا کے لہجے میں سختی تھی۔

"تائی امی اور کون؟" اس نے لاپروائی سے کہا۔ "پرسوں کہہ رہی تھیں۔ اگر میری کوئی بیٹی ہوتی تو بالکل تم جیسی ہوتی۔"

"ماشاء اللہ!" علیا نے طنزاً" کہا۔ "اگر ان کی اس قسم کی کوئی خواہش ہے تو انہوں نے بیٹی کی دعا کیوں مانگی کوئی سوتی جاگتی گڑیا لے لیں۔"

بعض لوگ ایسے حاضر دماغ ہوتے ہیں۔ ہر بات کا ہی جواب موجود اور وہ خود اتنی کوڑھ مغز ہو گئی تھی کہ اسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ علیا آپی سے اس قسم کی کوئی بات ہی نہیں کرنی ہے جس میں اس کی اپنی تعریف کا ذرا سا بھی پہلو نکلتا ہو۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑنے والا تھا۔ خود کو کتنی ہی دفعہ کوئی بات سمجھالو۔ مگر وقت آنے پر انسان بھول ہی جاتا ہے اور زبان کو کیا کہا جائے زبان کی اپنی ہی مرضی ہوتی ہے۔ زبان پر ہر وہ

بات [illegible] کسی کونے میں ہوتی ہے۔

جب بڑی تائی نے اس کی تعریف کی تھی۔ اسے بڑا اچھا لگا تھا۔ چلو دنیا میں کوئی تو ہے۔ جس کے نزدیک اس کے اندر بھی کوئی ایسی عادات ہیں جو قابل توجہ ہیں اور جس وقت تائی نے تعریف کی تھی۔ کاش! اس وقت علیا آپی ہوتیں تو مزا آجاتا۔ دل کے اندر بیٹھا چھوٹا بچہ کبھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔

تھوڑی سی دیر کی بات تھی مگر علیا کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

"علیا آپی!" اس نے ڈرتے ڈرتے پکارا۔

"کیا بات ہے؟" علیا نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

"تائی جان کہہ رہی تھیں کہ علیا کے ہاتھوں میں بہت ذائقہ ہے۔ بہت مزے کی چیزیں بناتی ہے۔"

"یہ کب کہا تھا انہوں نے؟" ان کا لہجہ مشکوک تھا۔

"امی کے سامنے۔"

پتا نہیں انہیں یقین آیا یا نہیں مگر موڈ قدرے بہتر ہو گیا۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔" عبیر نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔

☼ ☼ ☼

وہ چیزیں پھیلائے بیٹھی تھی۔ جب خضر نے دستک دے کر کمرے میں قدم رکھا۔

"کیا ہو رہا تھا۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔

"کچھ نہیں بہت دنوں سے کمرے کی تفصیلی صفائی نہیں کی تھی۔ بس وہی ہو رہی تھی۔"

"تفصیلی صفائی۔" خضر کو ہنسی آگئی۔ "یہ کیا چیز ہوتی ہے؟"

"ارے بس بھی کرو۔ صبح سے کام میں لگی ہوئی ہو۔" تائی جان نے اسے بھاری بکسے گھسیٹتے دیکھا تو ٹوک دیا۔

[illegible] تائی جان! [illegible]

"بات کام کرنے کی نہیں ہے۔" تائی نے اسے سمجھایا۔

"لڑکیاں دس کام کرلیں مگر ایسے بھاری کام نہیں کرنے چاہئیں۔ آگے جا کر پریشانی ہوجاتی ہے۔"

"کہاں آگے جا کر؟" اس نے پلکیں پٹپٹاتے ہوئے اگلا سوال کر دیا۔

"اف!" تائی نے سر پر ہاتھ مارا۔

بڑی ہی معصوم بچی ہے تمہاری۔ تم چھوڑ دو میں خضر سے کہہ دوں گی۔ وہ کرلے گا۔"

"ارے بھابھی! ان لوگوں کو عادت ہے۔ سارے کام کرنے کی آپ پریشان نہ ہوں۔" امی نے سہولت سے کہا۔

"لوگوں کا نام نہیں لو ذکیہ! علیا کو تم نے بہت سر چڑھایا ہوا ہے یہ چھوٹی ہو کر بھی اس سے زیادہ سمجھ دار ہے اور۔۔۔" آگے کچھ کہتے کہتے تائی جان رک گئیں۔ علیا اندر داخل ہو رہی تھی۔

"عبیر! کسی کام میں تمہارا دل ہی نہیں لگتا۔ سب کام اسی طرح پڑے ہوئے ہیں۔"

"ارے کیا ہوا! اسے کیوں ڈانٹ رہی ہو۔ میں نے ہی منع کیا تھا۔"

"آپ نے! مگر کیوں؟"

"خضر کرلے گا۔ عبیر تھک گئی تھی۔"

"اف اللہ!" عبیر نے ڈر کر دل میں سوچا۔

"آج کی یہ ہمدردی کسے زیادہ مہنگی پڑے گی، مجھے یا تائی جان کو؟" اس کا دل چاہا تائی کو خاموش کردے۔

وہ کچن میں بیٹھ کر جلدی جلدی چائے پی رہی تھی۔ جب علیا نے کچن میں قدم رکھا۔ وہ ایک دم چائے پینا بھول گئی۔ علیا کی نظریں سرد تھیں اور ان میں واضح نفرت کا ایک پیغام تھا۔

"لوگ تمہیں بہت معصوم سمجھتے ہیں۔ حالانکہ تم نہ معصوم ہو اور نہ ہی کوئی اور خوبی ہے اس کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں کی عقل پر کیا پتھر پڑ گئے ہیں جو لوگ تم سے ہمدردی کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔

تمہارا کیا خیال ہے۔ اگر انہیں رحیم والا قصہ پتا چل جائے تو کیا ہوگا، پھر تو شاید یہ لوگ تمہاری طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کریں۔ انہیں بھی پتا چل جائے گا کہ معصوم صورتوں کے پیچھے کیسے کالے دل والے لوگ ہوتے ہیں۔"

عبیر کے ہاتھ میں پانی کا گلاس لرز گیا۔ بہت عرصے بعد، بہت دنوں بعد کسی آنکھ نے محبت سے دیکھا تھا۔ شفقت سے اس کا سر سہلایا تھا۔ بیٹھ کر اس کی دوستوں کے قصے سنے تھے۔

تائی جان نے یہی تو کہا تھا کہ "میری کوئی بیٹی ہوتی تو عبیر کی طرح ہوتی اور مجھ سے اسی طرح باتیں کرتی، ایسے ہی قصے سناتی جیسا کہ یہ مجھے سناتی ہے۔ بھئی ذکیہ! تم بڑی خوش قسمت ہو۔"

بعض لوگوں کی خوش قسمتی کیسی ہوتی ہے کہ دوسرے لوگوں کو انہیں بتانا پڑتا ہے کہ آپ خوش نصیب ہیں۔ حالانکہ ذکیہ بیگم کو بھی اپنی بدنصیبی پر شک نہیں رہا تھا۔

عبیر کی دفعہ میں انہیں یقین تھا کہ اس دفعہ تو بیٹا ہی ہوگا۔ سارے زمانے کے ٹوٹکے انہوں نے آزما لیے تھے۔ نماز نہ چھوڑی لیکن پھر عبیر کو دیکھ کر اسی اللہ سے شکوہ کرنے میں انہوں نے وقت کا کوئی حساب نہ رکھا۔ حالانکہ وہ تو اتنی خوب صورت تھی کہ جو اسے ایک دفعہ دیکھ لیتا۔ اسے پیار کیے بغیر نہیں رہ پاتا۔ لیکن بعض دفعہ ماؤں کے دل بھی بڑے سخت ہو جاتے ہیں۔ یا حالات کر دیتے ہیں۔

عبیر چھوٹی سی تھی جب روڈ ایکسیڈنٹ میں شوہر کے انتقال نے انہیں بالکل ہی چڑچڑا کر دیا اور گھر کا بہت سارا انتظام علیا کے ہاتھوں میں چلا گیا۔

اور عبیر کو لگتا کہ زندگی کے بڑے امتحانوں میں سے ایک امتحان اس کی قسمت میں یہ بھی لکھا جانا تھا کہ علیا کو اس کی بڑی بہن ہونا تھا۔ اس کی زندگی میں کہیں سے کوئی محبت نہ آسکی۔ نہ ماں کی نہ بہن بھائی کی۔ کبھی کبھی اسے یوں لگتا کہ سینے میں دل کی جگہ کوئی صحرا ہے۔ پیاس کا، حرارت کا صحرا۔

ماریہ کو اس پر بہت غصہ آتا۔ وہ اکثر ہی اس بات پر الجھ پڑتی مگر عبیر اسے کیسے سمجھاتی کہ جن کے دل بچپن میں ہی ٹھٹھر جائیں۔ انہیں وقت کا کوئی بھی موسم شاداب نہیں کرتا۔ اسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ ماریہ کو گھر کی ہر بات سے آگاہ کرے یہ الگ بات کہ ماریہ خود ہی ہر چیز سے آگاہ تھی۔ کسی دوسرے کے گھر کے معاملات میں وہ دخل انداز نہیں ہو سکتی تھی اس کے ہاتھ میں صرف یہی تھا کہ وہ عبیر کے ساتھ رہے اور اس کی تکلیفوں میں اگر کچھ کمی کر سکے تو وہ کر دے۔ اس طرح کہ اسے احساس بھی نہ ہو۔

اس بات پر بھی علیا پیچ و تاب کھا کر رہ جاتی۔ کتنی دفعہ اس نے کوشش کی یہ دوستی ختم ہو جائے یا پھر عبیر جس نے ہر بات میں صرف سر جھکانا ہی سیکھا تھا۔ اس بات کو بھی سر جھکا کر مان لے۔

لیکن اس بات پر ماریہ اڑ گئی۔

"عبیر! اگر تم نے علیا کی یہ بات مانی تو میں علیا کو قتل کر دوں گی۔"

"اچھا!" وہ ہنس پڑتی۔ "کسی کو قتل کرنا اتنا آسان ہے۔"

"آسان تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔" ماریہ کندھے اچکاتی۔ "لیکن آج کے دور میں ہمارے خون میں اتنی سفاکیت اور درندگی آگئی ہے کہ پتا نہیں ہم لوگ کون سی ایسی چیز کھا رہے ہیں۔"

"کھانے پر یاد آیا۔ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ سچ اب تھوڑی دیر میں چکر شروع ہو جائیں گے۔"

"تو ناشتہ کیوں نہیں کیا تھا۔ پتا بھی ہے۔ صبح کے وقت لازمی کچھ کھا لینا چاہیے۔" ماریہ نے ڈپٹا۔

"اکثر ہی کچھ نہ کچھ کھا ہی لیتی ہوں۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔ "کبھی غصہ، کبھی ڈانٹ اور آج صبح تو دونوں چیزیں۔" ماریہ دل ہی دل میں افسوس کرکے رہ گئی۔ عبیر اس طرح بولتی نہیں تھی اور اگر آج کچھ کہا ہے تو پھر شاید زخم ہی کچھ گہرا تھا اور عبیر کیا بتاتی۔

کہ علیا نے اس کے نام سے رکھے ہوئے دو سلائس بھی اسی طرح کچن میں چھوڑ دیے کہ وہ کھانے کے قابل بھی نہ رہیں اور اس کے پوچھنے پر بے نیازی سے کہہ دیا۔

"مجھے یاد نہیں رہا تھا۔" ایسی بات جس پر آپ لڑ بھی نہیں سکتے۔ کس سے بھول چوک نہیں ہو جاتی۔

خضر نے یہ سب دیکھا تھا۔ مگر اس معاملے میں وہ کیا کر سکتا تھا۔ عبیر کو بھی دیر ہی ہو رہی تھی۔ ورنہ وہ جا کر کچھ لے ہی آتا۔

تین بجے وہ گھر لوٹی تو کچن سے بڑی اچھی خوشبو آ رہی تھی۔

"خیریت!" اس نے امی اور تائی امی کو سلام کرنے کے فوراً بعد سوال کر دیا۔

"کوئی آ رہا ہے؟" اس نے تائی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"نہیں خضر کا دل چاہ رہا تھا آج کچھ مختلف کھانے کو!" انہوں نے سبھاؤ سے کہا۔

"مختلف یا اچھا؟" اس نے شرارت سے کہا۔

"اچھا بس۔" تائی نے اس کے سر پر چپت رسید کی

"جاؤ جا کر کپڑے وغیرہ چینج کرو۔"

"نہیں ان کو ابھی تھوڑی دیر اور ڈرامے کرنے ہیں۔" علیا نے اندر داخل ہوتے ہوئے زہرخند لہجے میں کہا۔

"کیا ہو گیا ہے علیا! چھوٹی بہن سے اس طرح بات کرتے ہیں؟"

"کس بات کی چھوٹی تائی امی! آپ کو کچھ نہیں پتا۔ بلکہ بہتر ہے کہ ہم لوگ بھی اپنا منہ بند رکھیں۔"

"اس کو منہ بند رکھنا کہتے ہیں تو پتا نہیں کھولنا کسے کہتے ہیں۔" عبیر نے چپکے سے سوچا۔ علیا کی باتوں سے ——— وہ اشتہا بھی مر گئی تھی۔ جس نے ایک دم سے اسے گرفت میں لیا تھا۔

"کیا ہو گیا۔ سب لوگ خاموش کیوں ہیں؟" خضر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی نہیں۔" اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"کوئی بات ہو گئی ہے؟"

"کوئی بات ہی تو نہیں ہوتی۔"

"یہ حالات ٹھیک نہیں ہو سکتے عبیر!"

"پتا نہیں گزرے وقتوں نے جو زخم ڈال دیا ہے۔ وہ زخم چھل تو سکتا ہے مگر صحیح نہیں ہو سکتا۔ کچھ چیزیں کبھی صحیح نہیں ہو پاتیں خضر بھائی۔"

"تم نے کوشش نہیں کی ہوگی یا پھر جلد ہمت ہار دی ہوگی۔"

"آپ کو کیا پتا!" عبیر نے چڑ کر کہا۔

"یونہی ایک اندازہ تھا۔"

"اتنے اندازے نہیں لگایا کریں۔ اندازے غلط ہو جائیں تو پھر زندگی بڑی تکلیف میں گزرتی ہے۔"

"اچھا بہت ساری چیزیں بندے کے اپنے ہاتھ میں بھی ہوتی ہیں، زندگی کو ذرا کم تکلیف دہ بھی بنایا جا سکتا ہے۔"

"ایسا ہر وقت نہیں ہوتا۔" عبیر نے نفی میں سر ہلایا۔ "اور لڑکیاں اتنی صلاحیت نہیں رکھتیں کہ وقت و حالات کو اپنے انڈر کر لیں۔ معاشرہ اور بہت ساری چیزیں اس کے آگے آجاتی ہیں۔"

"مثلاً" خضر نے دلچسپی سے پوچھا۔

"مثلاً یہ کہ بہت دفعہ دل چاہتا ہے کہ یہ دنیا چھوڑ دی جائے مگر ایسا ہو نہیں سکتا۔"

"عبیر!" خضر نے ایک دم اس کی شکل دیکھی۔ "یہ تمہاری عمر اس طرح کی باتیں کرنے کی نہیں ہے۔"

"عمر کا دکھ سے کیا تعلق ہوتا ہے۔" اس کے لہجے میں ایک تلخی سی آگئی۔

"دکھ تو ہر جگہ ہر راستے میں گھات لگائے کھڑے ہیں کہ بس ہمیں سمیٹ لو۔ ہمیں لے لو۔"

"تو آپ نہیں لو۔ انہیں منع کر دو۔"

"کیا آپ کو نیند آ رہی ہے۔" اب کے عبیر نے ناراضی سے کہا۔

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔"

"تو آپ اپنا سوال بھی تو دیکھیں۔" اس نے چڑ کر کہا۔ "تو آپ نہیں لو۔ انہیں منع کر دو۔" اس نے بے ساختہ خضر کی نقل اتاری۔ جیسے دکھ نہ ہوئے ٹھٹھے لوکی ہو گئے۔"

"یہی تو اتنی دیر سے سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن تم اتنی کوڑھ مغز ہو کہ کچھ سمجھ کر ہی نہیں دے رہی ہو۔"

"میں بہت سمجھ گئی ہوں۔ تب ہی تو ایسی ہو گئی ہوں۔"

"نہیں، تم نے کچھ نہیں سمجھا ہے۔ صرف وقت کے آگے ہتھیار ڈالے ہیں اور یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ اگر چچی جان نے تمہیں خود سے دور کیا ہے تو تم بھی ان سے دور ہو گئی ہو۔ کچھ تو کوشش کی ہوتی میں اس وقت علیا کی بات نہیں کر رہا ہوں۔" اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"میں سب کچھ کرنا چاہتی تھی خضر بھائی! مگر اب میرے اندر ایک مزاحمت آ گئی ہے۔ مجھے اب اچھا بن کر نہیں دکھانا میں یوں ہی بھلی۔ اب کسی بات کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے۔"

"یہ تو تم کہہ رہی ہو، ورنہ رشتوں کی ضرورت تو ہر کسی کو ہوتی ہے۔ تم نے بہت جلدی نہیں کی عبیر!؟"

"جلدی؟" اس نے زیر لب دہرایا۔

"ہاں جلدی نتیجے اخذ کرنے میں فیصلہ کرنے میں اور پھر مایوس ہونے میں۔"

"مایوسی کوئی ایسی چیز نہیں، جسے جب دل چاہا اوڑھ لیا جائے۔ یہ تو دوسروں کے رویے ہوتے ہیں۔ جو ہمارے اندر مایوسی پیدا کرتے ہیں اور یہ بڑی ڈھیٹ چیز ہوتی ہے۔ خضر بھائی! دنیا اسے ہر روز ایک نیا دھکا دیتی ہے۔ اور ہم پھر بھی ایک سعیٔ لاحاصل میں لگے رہتے ہیں۔"

وہ چلی گئی اور خضر نے سوچا۔ لوگوں کو اس طرح بھی نہیں ہونا چاہیے کہ جب وہ چلے جائیں تو اس طرح لگے کہ وہ ارد گرد کی ساری رونقیں بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ اسی وقت اندر سے علیا نکل آئی۔

"آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔" خضر ایک دم سے گڑبڑا گیا۔

"اچھا، مجھے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔"

"شاید۔" خضر نے کندھے اچکائے بات نہ ادھوری تھی نہ پوری۔ علیا الجھ گئی۔

"جو اس گھر میں رہتا ہے یا جو اس گھر میں آتا ہے۔ وہ سب ہی لوگ کچھ عجیب سے ہیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً" میں کس طرح بتاؤں۔ آپ اتنے دن سے یہاں موجود ہیں۔ خود بھی تو کچھ دیکھا ہو گا۔"

"ہاں دیکھا تو ہے۔" خضر نے زیر لب کہا۔ "اچھے بھلے دل کو اداس ہوتے ہوئے۔ اور تو اور خزاں اور بہار بھی کبھی کبھی بالکل ساتھ جڑے ہوئے دیکھے ہیں۔"

"حد ہو گئی۔ اس گھر میں کوئی سیدھی بات نہیں کر سکتا۔"

"میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی جو سمجھ میں نہ آئے۔" خضر نے سنجیدگی سے کہا۔ "اتنی سادہ بات جتنی سادہ عبیر ہے۔"

"ماشاءاللہ۔" علیا کی ہنسی زہریلی تھی۔

"آپ سے کس نے کہہ دیا کہ عبیر سادہ ہے۔"

"کہتا کون، کچھ چیزیں دیکھنے سے بھی پتا چلتی ہیں۔"

"پھر دیکھنا صحیح نہیں ہے۔"

"یہ تو ہے۔" خضر نے دل میں سوچا۔ "یہ دیکھنا صحیح نہیں تھا۔ اچھی بھلی زندگی کچھ اور ہو کر رہ گئی ہے۔"

"کس سوچ میں گم ہیں؟" علیا نے چٹکی بجائی۔

"علیا! تم کچھ کرتی کیوں نہیں ہو۔"

"مثلاً" کیا کروں؟" اس نے تیکھی نگاہ خضر پر ڈالی

"کوئی بھی ایسا کام جو تمہیں مصروف رکھے اور جس کی وجہ سے بندے کے پاس کچھ پیسے بھی آ جائیں۔"

"آپ کو شاید علم نہیں۔ آج کل ایسا وقت ہے۔ جس میں ہر کام میں صرف پیسے لگ سکتے ہیں، پیسے آ نہیں سکتے۔"

"یہ تو اپنے سوچنے کی بات ہے پیسے صرف ایک دفعہ ہی لگتے ہیں۔ لیکن آپ اس سے بہت سالوں تک کما سکتے ہیں۔"

"یہ بات بھی ہے۔ چلیں پھر بتائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"یہ تو میں نہیں بتا سکتا۔ تم خود سوچو، تمہیں کس چیز کا شوق ہے۔ جس کا شوق ہے اس کام میں دل لگاؤ۔ محنت کرو پھر وہی چیز تمہیں رزلٹ دے گی۔"

"چلیں ٹھیک ہے میں آپ کو سوچ کر بتاتی ہوں۔"

علیا کے چہرے پر پہلی دفعہ مسکراہٹ آئی۔ اگر کوئی اس کا اتنا خیال کر رہا ہے تو اس کا بھی کچھ فرض بنتا ہے یا نہیں۔ اس نے اپنے دل میں سوچا۔

اور اسی دن علیا نے پہلی دفعہ عبیر سے پوچھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

"کیا مطلب؟" اسے علیا کے نارمل لہجے پر حیرت تو ہوئی مگر اس نے اس حیرت کو چھپا لیا۔

"میرا مطلب ہے کہ خضر کا خیال ہے کہ میرے اندر بڑی صلاحیتیں ہیں اور مجھے کچھ ضرور کرنا چاہیے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے علیا آپی!" اس نے خلوص سے کہا۔

"یہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔" علیا اپنے سابقہ انداز میں لوٹنے لگی۔

"وہ تو میں سوچ کر ہی بتا سکتی ہوں۔" عبیر نے جلدی سے کہا۔

"مجھے پتا ہے تم سوچ کر بھی اپنے ہی جیسا بیزار اور فضول سا جواب دو گی۔" علیا نے ناک چڑھا کر جواب دیا۔

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔" عبیر نے جلدی سے کہا۔ "ہر کام سوچ کر ہی کرنا چاہیے۔ لیکن اگر آپ کو بہت جلدی ہے تو میرا خیال ہے آپ کی ڈرائنگ اچھی ہے آپی! آپ اس سے ملتا جلتا کوئی کام کر لیں۔"

"بس بس رہنے دو۔ مجھے پتا تھا۔ ایسا ہی مشورہ ملنا ہے۔"

"کیوں کیا ہوا۔"

"کچھ نہیں میں خود ہی سوچ لوں گی۔ تم زحمت نہ کرو۔" اس کے اتنے روکھے جواب پر وہ خاموش ہو گئی "اور پھر خضر بھائی کہتے ہیں کہ۔" اس نے دل گرفتی سے سوچا۔

صبح ناشتے پر علیا نے اعلان کر دیا۔

"میں گانا گانا سیکھنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ میری آواز بہت اچھی ہے۔"

"یہ تم سے کس نے کہا۔" خضر نے حیرت سے کہا۔

"مجھے پتا ہے۔"

"خوامخواہ میں پتا ہے۔" خضر کو غصہ آنے لگا۔ ایک چھوٹی سی بات کہیں ایشو ہی نہ بن جائے اور علیا تھی بھی کچھ خود سری، صرف اپنی بات کو صحیح سمجھنے والی۔

"آپ بتائیے کیا سوچا ہے میں نے؟"

"اس سے تو بہتر تھا کہ کچھ نہ ہی سوچا ہوتا۔"

"یہ کیا بات ہوئی، پوری رات لگائی ہے۔"

"کیا بات ہو گئی خضر!" تائی جان نے خضر کو ہی ڈانٹا "لڑکیوں سے اس طرح بات کرتے ہیں۔"

"سوری۔" اس نے فوراً کہا تو علیا نے چونک کر خضر کا چہرہ دیکھا۔ وہاں ان کے گھر میں سوری کا کوئی رواج نہیں تھا۔ سب لوگ اپنے آپ کو بالکل صحیح سمجھتے تھے۔

"تم کسی آسان چیز میں ایڈمیشن لے لو۔ جیسا کہ کپڑوں کی ڈیزائننگ۔"

"زہر لگتا ہے مجھے یہ درزیوں کا کام۔"

"ارے یہ کسی زمانے میں ہوتا ہو گا درزیوں کا کام۔ اب آج کل جتنے لوگ ٹی وی میں آتے ہیں، ڈیزائننگ کا کام تو تقریباً سارے ہی لوگ کر رہے ہیں۔"

"اچھا آپ کو کس طرح پتا؟"

"ارے بھئی تم بتاؤ ایڈمیشن لینا ہے۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔" خضر کی بات ٹالنی مشکل تھی۔ سو اس نے مان لیا۔
بعض فیصلوں کے بڑے دور رس نتائج ہوتے ہیں۔ بہت فرق پڑ گیا تھا۔ علیا جو ہر وقت چڑی ہوئی رہتی تھی۔ اب تھکی ہاری گھر میں آتی تھی تو گھر آ کر اسے صرف سونے کی یا پھر مزید کام کرنے کی پڑ جاتی تھی۔
"انسان کی زندگی میں مقصد بڑے ضروری ہوتے ہیں۔ آپ نے وہ قول تو سنا ہوگا۔ جو بغیر کسی مقصد کے جیتے ہیں وہ جیتے نہیں اور جو کسی مقصد کے لیے مر جائیں وہ مرتے نہیں۔"
"اتنے بھاری جملے۔" عبیر مسکرا دی۔ خضر کا بڑا احسان تھا وہ جو علیا کے جملوں سے بچنے کی خاطر ہر وقت اپنے کمرے میں رہتی تھی اور جب باہر نکلتی تب بھی اس کی کوشش ہوتی تھی کہ علیا سے سامنا نہ ہو اب ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ پورے گھر میں آزادانہ گھوم پھر سکتی تھی اور تازہ ہوا میں سانس لینے کا ایک اپنا ہی مزا تھا۔
اس دن بھی وہ درخت کے پاس کھڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ جب خضر کی نظر اس پر پڑ گئی۔
"ہیلو کیا ہو رہا ہے۔"
"کچھ نہیں۔" اس نے جلدی سے جواب دیا۔ "وہ سانس لے رہی تھی۔"
"وہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔ لیکن کیا آپ کی طرف کبھی کبھار لی جاتی ہے؟"
"کیا چیز؟" اس نے بے دھیانی میں پوچھ لیا۔
"یہی سانس وغیرہ۔" اس نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی ہوئی تھی۔
"آپ مذاق اڑا رہے ہیں خضر بھائی!" وہ روہانسی ہو گئی۔
"ارے نہیں بابا!" خضر نے جلدی سے کہا۔ "میں مذاق کر رہا تھا۔ اصل میں کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ بغیر وجہ کے بھی ہنسا جائے۔ تو بس یونہی ہنس رہا تھا۔"
"کوئی بھی نہیں۔ بے وقوف نہ بنائیں۔" خضر نے ٹھنڈی سانس لی۔

"میں اگلے ہفتے تک جا رہا ہوں۔"
"کہاں۔؟"
"واپس، جہاں سے آیا تھا۔"
"مگر کیوں؟"
"کام ختم ہو گیا۔ چار مہینے کا پروجیکٹ تھا اور پھر بھی چھ مہینے لگ گئے۔"
"ارے چھ مہینے۔۔۔ آپ جانتے ہیں۔ آپ کے آنے کے بعد پتا ہی نہیں چلا کہ وقت کس طرح اور کیسے گزر گیا۔ ورنہ ہمارے گھر میں وقت گزرتا نہیں تھا۔ بہت گھٹن رہتی تھی۔ میں دروازے بند کیے کیے تھک جاتی تھی۔"
"تو دروازے کھول لیتیں؟"
"کیسے کھول لیتی۔" اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی اتر آئی۔ "کھلے دروازے سے آوازیں اندر آتی ہیں۔ وہ آوازیں جو دل دکھاتی ہیں یا پھر وہ آوازیں جو پتھر کی طرح لگتی ہیں۔ بہتر ہے کہ پھر دروازے بند رکھے جائیں۔"
"لیکن ادھر دیکھو، وعدہ کرو۔ اب اس طرح نہیں کرو گی۔ کھلی ہوا، تفریح۔ یہ سب کچھ آدمی کے لیے ضروری ہے۔ ورنہ دماغ پر بہت بوجھ پڑ جاتا ہے۔ دیکھو! جس طرح علیا نے کیا ہے۔ اسی طرح تم بھی اپنے لیے کوئی ہابی تلاش کر سکتی ہو۔ جس میں تمہیں دلچسپی ہو پھر تمہیں کمرے میں بند ہونا بالکل اچھا نہیں لگے گا۔ اور میرا خیال ہے کہ تم لکھ سکتی ہو۔ میں نے اس دن تمہاری فائل دیکھی تھی۔ بڑی اچھی شاعری کی ہے تم نے۔"
"وہ تو میں یوں ہی۔" اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
"یونہی نہیں، ہم لوگ اسی لیے پیچھے ہیں کہ اپنی ہر چیز کو بس یونہی کہہ دیتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے دی ہوئی کوئی بھی نعمت بس یونہی نہیں ہوتی۔ تم سنجیدگی سے لکھنے کی طرف آ جاؤ۔ یہ تمہیں بہت آگے کی طرف لے کر جائے گی۔"
"آپ سچ کہہ رہے ہیں خضر بھائی؟" اس کے لہجے میں معصومیت تھی۔ "میں لکھ سکتی ہوں۔"

"ہاں اور بہت اچھا۔"
"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔"
"بس کچھ باتیں خود بخود پتا چل جاتی ہیں۔ اور اچھے لوگ سب کام اچھا کرتے ہیں۔"
خضر کی تھوڑی سی حوصلہ افزائی تھی۔ وقت کا کوئی اچھا لمحہ تھا۔ جب عبیر نے صدق دل سے سوچا کہ زندگی کا یہ رخ بھی اپنے اندر کچھ نہ کچھ وسعت ضرور رکھتا ہوگا۔ چلو اس راہ پر چل کر دیکھتے ہیں۔
خضر نے بہت ساری کتابیں منگوا دی تھیں۔ "تم مطالعہ کرو۔ اس سے اچھا لکھنے میں مدد ملے گی۔"
اس سے اچھا لکھنے میں مدد ملی یا نہیں۔ مگر یہ ضرور ہوا کہ وہ وقت، جو فضول سوچ و بچار میں صرف ہوتا تھا۔ اور جن باتوں پر کڑھ کڑھ کر وہ اپنی جان آدھی کر لیتی تھی۔ ان باتوں پر اب سوچنے کا ٹائم بھی نہیں ملتا تھا۔
ماریہ کہتی "عبیر! ہمیں تو پتا ہی نہیں تھا کہ تمہارے اندر اتنی صلاحیت ہے۔ آخر تمہیں پہلے کبھی کیوں خیال نہیں آیا؟"
"خیال کیسے آ سکتا تھا۔ کبھی کسی نے بتایا ہی نہیں کہ اتنی صلاحیتیں موجود ہیں۔ وہ صلاحیتیں جو شہرت بھی دیتی ہیں۔ عزت بھی اور پیسہ بھی۔"
"خدا ان اچھے لوگوں کو ہمیشہ خوش رکھے۔ جو کسی کی زندگی میں روشنی لے کر آتے ہیں۔" ماریہ نے شرارت سے کہا۔
"آمین!" عبیر نے زیر لب کہا۔
"یہ زندگی جو مشکل لگتی ہے اور مشکل سے گزرتی ہے۔ یہ آساں بھی ہو سکتی ہے۔ اگر ہم چاہیں تو۔" ماریہ نے کہا۔
"تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ اپنی کہانی لکھ لو۔ یقین مانو بڑی مشہور ہوگی۔ ابھی پچھلے مہینے جو تم نے ناول لکھا تھا۔ وہ بھی کتنا مشہور ہوا تھا۔"
"لیکن میں اپنی کہانی کیسے لکھ سکتی ہوں۔" اس نے احتجاج کیا۔
"کسی کو کیا پتا چلے گا اور ویسے بھی میں نے پڑھا تھا کہ جو کچھ بھی لکھا جاتا ہے۔ رائٹر اس میں خود کہیں نہ

کہیں ضرور موجود ہوتا ہے۔"

"کہیں نہ کہیں نا۔" اس نے چڑ کر کہا۔ "یہ تو نہیں کہ خود پورا کا پورا ۔۔۔۔ موجود ہو۔"

"توبہ!" ماریہ کو ہنسی آگئی۔ "عبیرہ! تم کتنا بال کی کھال نکالتی ہو۔ کسی کو کیا پتا لگے گا کہ یہ تمہاری کہانی ہے' بس اللہ کا نام لے کر شروع کر دو۔ کتھارسس ہی سہی مگر تم دیکھو گی۔ تمہارا اندر بڑا پر سکون ہو جائے گا۔

وہ ہنس پڑی۔

"چلو اٹھ جاؤ۔ کچن میں آجاؤ۔ رات کا کھانا بنانا ہے۔"

"علیا نے بنانا چھوڑ دیا؟"

"نہیں میں نے خود ہی لے لیا۔ وہ تھکی ہوئی آتی ہے۔"

"تو تم نہیں تھک جاتیں۔"

"کیا فرق پڑتا ہے۔"

"اچھی بات ہے۔" ماریہ نے اس کا کندھا تھپکا۔

"محبتیں برکتیں دیتی ہیں۔ آسانیاں پیدا کرتی ہیں ۔ وہ آسانیاں جنہیں ہم اپنے ہاتھوں سے کھو دیتے ہیں ہر انسان وہی کچھ کرتا ہے جو اس کی سرشت ہوتی ہے۔ دیر سے ہی سہی مگر یہ بات میں نے سمجھ لی ہے۔ اسی لیے تم نے دیکھا نہیں ہے میں اب علیا کو کچھ نہیں کہتی ہوں۔"

☼ ☼ ☼

زندگی کی ایک راہ تو متعین ہو گئی تھی۔ اب چاہے وہ راہ آسان تھی یا مشکل مگر اس نے دماغ سے سارے فضول خیالات کو نکال دیا تھا اور پھر یوں بھی یہ سب سوچنے کا ٹائم نہیں ملتا تھا۔ اپنی پڑھائی کرتی علیا کے حصے کا کام نمٹاتی اور ناول یا افسانہ جب لکھ رہی ہوتی تو دماغ میں وہی کردار بسیرا کر لیتے۔ ان ہی کرداروں کے متعلق سوچنے میں سارا وقت نکل جاتا پھر دماغ میں اتنی ہمت باقی نہیں رہتی کہ وہ دوسری کوئی بات سوچ سکتا۔ علیا کی باتیں' امی کا رویہ' خود پر گزرے خیالات اس نے خود کو سنبھال کر جینا سیکھ لیا تھا۔

تائی امی اور خضر واپس چلے گئے تھے اور جانے والے چلے جائیں تو یوں لگتا ہے جیسے زندگی میں کبھی وہ لوگ ہمیں ملے ہی نہیں تھے۔

عبیرہ شام کو سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ جاتی تو اسے یوں لگتا کہ کوئی اس کے برابر میں بیٹھا ہوا دھیمے لہجے میں کوئی بات سمجھا رہا ہے۔

زندگی کا کوئی نکتہ' کوئی الجھا ہوا مسئلہ۔ لوگ چاند بھی نہیں ہوتے۔ سورج بھی نہیں ہوتے۔ مگر چاند کی طرح روشنی بن جاتے ہیں۔ سورج کی طرح راستہ دکھا دیتے ہیں۔ خدا ایسے لوگوں کو ہمیشہ خوش رکھے۔

دعا دل سے مانگی جاتی ہے اور اس نے تو بہت دل سے مانگی تھی مگر وہ پھر بھی کہیں بیچ راہ ہی میں رہ گئی۔ وہ قبول نہیں ہوئی۔

☼ ☼ ☼

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" تائی امی نے صاف منع کر دیا۔ "ایک تو اس لیے کہ وہ تم سے کافی چھوٹی ہے۔ ابھی سیکنڈ ایئر میں ہی ہے اور پھر میں نے تمہاری بات اپنے میکے میں کی ہوئی ہے۔" ان کا لہجہ حتمی تھا۔

"کیا مسئلہ ہے۔ زندگی میری ہے' کم از کم اس معاملے میں تو اولاد پر مرضی کا بوجھ نہ ڈالیں۔"

"خضر! تمہیں اتنی اجازت کب ملی کہ تم آگے سے مجھے اتنی باتیں پکڑا دو۔" ان کا لہجہ بہت برا ہو گیا تھا۔

خضر نے خاموشی اختیار کر لی۔ رشتے تھے رشتوں کا احترام تھا۔ لیکن اب تائی جان کو جلدی لگ گئی تھی۔

"بس تمہارا پروجیکٹ ختم ہو جائے تو واپس اسلام آباد بھی جانا ہے۔"

خضر کو افسوس ہوا۔ ابھی اس نے یہ ذکر چھیڑا ہی کیوں۔ وہ کھوئی کھوئی اداس آنکھوں والی لڑکی جس کو اپنی تائی کی تھوڑی سی محبت اور توجہ حاصل تھی۔ اس نے ایک بات کہہ کر وہ تھوڑی سی روشنی بھی واپس لے لی تھی۔ خضر کو اپنی جلد بازی پر غصہ آ رہا تھا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔

اس دن رات کا کھانا کھانے کے دوران خضر کو بڑا عجیب سا احساس ہوا۔ کھانا بہت مزے کا بنا تھا اور عبیرہ نے ہی بنایا تھا لیکن تائی جان بالکل خاموشی سے کھاتی رہیں ۔ ایک لفظ بھی انہوں نے تعریف کا نہیں کہا۔ نہ سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔

ایک منٹ میں دل پتھر کیسے ہو جاتے ہیں۔ خضر کے چہرے پر شکنوں کا جال پھیلا ہوا تھا لیکن وہ سر جھکائے خاموشی سے کھانے میں مصروف رہا۔ اسے لگ رہا تھا۔ اگر اس نے سر اٹھایا اور کسی کی آنکھوں میں دیکھ لیا تو پھر پتا نہیں کیا ہو گا۔

آرزو بری چیز ہوتی ہے۔ نہ دل کے رازوں کو راز رہنے دیتی ہے نہ صبر کا کوئی لمحہ بخشتی ہے۔ اس نے کتنی دیر امی سے بحث کی۔ انہیں منایا سمجھایا۔ حالانکہ امی ایسی نہیں تھیں مگر پتا نہیں کیوں ایک دم سے اپنی ضد پر اڑ گئی تھیں۔

"امی! آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟" رات کا سناٹا ہر طرف پھیل گیا تھا۔ اس لیے خضر کو بالکل آہستہ بولنا پڑ رہا تھا۔

"میں نے کیا کیا ہے اور تم اب ماں سے حساب لو گے کہ میں کیا کر رہی ہوں اور کیا نہیں۔"

"امی! مگر یہ کوئی اچھی بات نہیں۔"

"بس بہت ہو گیا۔ یہ تو تمہاری غلطی تھی نا خضر! میں تو اچھا خاصا اس سے پیار کرتی تھی۔ تم بیچ میں کیوں آ گئے۔"

"اف!" خضر نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ "امی مجھے کسی نہ کسی سے تو شادی کرنی تھی تو پھر عبیرہ کیوں نہیں جبکہ آج سے پہلے تک تو آپ اس کی تعریفیں بھی کرتی تھیں۔ وہ آپ کو اچھی بھی لگتی تھی پھر اب کیا ہوا۔"

"مجھے بہت ساری لڑکیاں اچھی لگتی ہیں تو کیا ان سب سے تمہاری شادی کر دوں؟"

ان کے چہرے کی سرخی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا اب ان کا بی پی ہائی ہو رہا ہے۔ خضر نے ایک دم خاموشی اختیار کر لی۔

"اب بتاؤ کیا جواب ہے۔" انہیں اب غصہ آ گیا تھا۔ "تمہیں جب میں نے بتا دیا تھا کہ یہ شادی کسی طریقے سے بھی ممکن نہیں تو پھر تم نے دوبارہ یہ ذکر چھیڑا ہی کیوں؟"

ابھی ان کی بات آدھی منہ ہی میں تھی کہ جیسے ایک دم سے کوئی شور بپا ہو گیا۔ یا رات کے سناٹے میں شاید ہر چیز اتنی ہی بڑی لگتی ہے۔

گھر میں کوئی آیا تھا یا کچھ اور' مگر کچھ ہوا ضرور تھا۔ خضر نے ایک دم دروازہ کھولا اور بھاگتے قدموں سے عبیرہ کے دروازے پر پہنچا۔ سب لوگ وہیں جمع تھے۔

"کیا ہوا؟" اس نے سب کی حیران شکل دیکھی اور ان سب کے بیچ میں سر جھکائے عبیرہ۔

"کیا ہوا؟" اس نے سوال دہرایا۔

"کچھ نہیں اندر کوئی تھا۔ کوئی لڑکا۔" علیا نے جواب دیا۔ جیسے کوئی بم پھٹا' زمین گردش کرتے کرتے تھم گئی۔ کتنی دیر کے بعد خضر کی سمجھ میں آیا کہ اس نے کہا کیا ہے۔

"یہ اندر کمرے میں اس سے باتیں کر رہی تھی۔"

"علیا! ہوش میں ہو؟"

"میں صحیح کہہ رہی ہوں۔ پوچھ لیں عبیرہ سے' سامنے کھڑی ہے۔"

علیا نے کاندھے اچکائے۔ خضر نے ایک نظر عبیرہ کے دھواں دھواں چہرے کو دیکھا۔ ان آنکھوں کو دیکھا' وہاں اذیت تھی۔ دکھ تھا مگر ہونٹوں پر خاموشی تھی۔ ابھی ابھی جو کچھ ہوا تھا اس کی نہ کوئی تشریح تھی ۔ نہ وضاحت تھی' رات تاریک تھی اور سیاہ اندھیرا بہت ساری چیزوں کا پردہ رکھ لیتا ہے مگر کون سی باتوں کا۔

چاروں طرف ایک یاسیت آمیز خاموشی تھی۔ اب کوئی کچھ نہیں بول رہا تھا اور جس نے بولنا تھا اس نے تو اب بول ہی دیا تھا۔

تائی امی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو خضر نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"آپ کچھ نہیں کہیں گی۔" اس نے سختی سے کہا۔

"کمرے میں جائیے اور عبیر تم بھی۔"
عبیر نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے روک دیا۔
"بس ٹھیک ہے۔"
تماشے ختم ہو جاتے ہیں۔ لوگ اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں مگر کیا وہ واقعی ختم ہو جاتے ہیں۔ کہانیاں تو چلتی رہتی ہیں۔ سینہ بہ سینہ۔ ایک زبان سے دوسری زبان تک۔ ایک گھر سے دوسرے گھر تک۔ لیکن یہ کہانی یہیں ختم ہو گئی۔
کسی کو خبر نہیں ہوئی۔ کہ اس رات کون آیا تھا اور وہ کہاں چلا گیا اور وہ کب سے آ رہا تھا۔
علیا نے قسم کھا کر بتایا۔ کہ وہ جس طرح اس لڑکے سے باتیں کر رہی تھی اس سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ پہلی دفعہ نہیں آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

زندگی کا حساب کتاب کبھی نہیں ہوتا۔ نہ کامیابی کا کوئی نسخہ ہے نہ ناکامی کا' زندگی میں دکھ ہے اذیت ہے ایک زخم جو کبھی بھرتا ہی نہیں۔
"آج بارش نہیں رکے گی۔"
بہت ساری لایعنی باتیں سوچنے کے بعد عبیر نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ منہ اوپر کرنے سے بارش کے قطرے اب بالکل پتھر کی طرح لگ رہے تھے۔
پہلے اذیت کا احساس ہوتا رہا۔ پھر وہ اذیت کہیں تحلیل ہو گئی۔ اب چہرہ سن ہو گیا تھا۔ اب بارش کا جو پانی نیچے گر رہا تھا۔ کسی کو پتا نہیں چل سکتا تھا کہ اس میں آنسو بھی شامل ہیں۔
"یہ دنیا جس کے خوف میں ہم مرے جاتے ہیں۔ یہ ہمیں اتنا بھی تو حق نہیں دیتی کہ کبھی دل کھول کر رو ہی لیا جائے۔" اس نے تلخی سے سوچا۔
آج صبح سے دل بہت اداس تھا۔ کتنی دفعہ اس نے سوچا کہ کیا اس کی وجہ موسم ہے' جو یہ دھند آمیز اداسی ہر طرف چھائی ہوئی ہے۔ مگر سوال' سوال ہی رہا کہیں سے کوئی جواب اس کا منتظر نہیں تھا۔ ہوا میں اب اچھی خاصی ٹھنڈ ہو چلی تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ تھوڑی دیر اور یہاں کھڑی رہی تو جس موت کی اس نے ہمیشہ دعا مانگی تھی۔ وہ آج ضرور پوری ہو جائے گی اور ایک دم وہی بے نام خوف دوبارہ سے اس کے اندر عود کر آیا۔ جس خوف سے لڑتے ہوئے اس نے اپنا سارا بچپن گزار دیا تھا۔ موت کا خوف' اندھیرے اور تنہائی کا خوف وہ خوف۔ جو اندر ہی اندر پھیلتا ہے اس نے سر جھٹکا دو تین دفعہ۔
"نہیں اب کچھ نہیں سوچنا۔ وہ وقت اب کہیں پیچھے رہ گیا ہے۔"
لیکن اسے یاد نہیں رہا کہ برا وقت کبھی پیچھے نہیں رہتا۔ وہ ہمیشہ ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ چاہے کتنا کچھ تبدیل ہو جائے۔ انسان کا اندر کبھی تبدیل نہیں ہوتا اور ایک وقت آتا ہے' جب اس خوف کے سامنے یا تو کھڑا ہونا پڑتا ہے یا ہتھیار ڈالنے ہوتے ہیں۔ لیکن اسے آج بھی یہ نہیں پتا تھا کہ اس نے ان دونوں میں سے کون سا کام کیا تھا۔ یا دونوں ہی نہیں کیے تھے اور تیسرا راستہ اختیار کیا تھا۔
اسی وقت بجلی زور سے چمکی اور دروازہ بجا۔
"کون ہے اتنی رات گئے؟" جب سے علیا کی شادی ہوئی تھی۔ اس طرح وقت بے وقت دروازے بجا نہیں کرتے تھے۔ وہ دروازے پر کھڑی سوچتی رہی۔
دروازہ پھر زور سے بجا۔
"ارے!" وہ ایک دم جیسے خواب سے چونکی۔ یہ تو بہت مانوس سی دستک تھی۔ اس نے بغیر کچھ پوچھے دروازہ کھول دیا۔
"کیسی ہو؟" اس نے سوال کیا اور اس سوال کے جواب میں اسے کیا کہنا چاہیے تھا۔ جھوٹ بولنے کی اسے عادت نہیں تھی اور شاید کہ ان لوگوں سے یہ سوال پوچھنا بھی نہیں چاہیے' جن کا حال چہروں پر رقم ہو لیکن وہ پہلا سوال تھا اور آخری بھی۔
اس کے بعد خضر نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ امی سے ملاقات کی۔ کھانا کھایا اور جب وہ کافی لے کر اس کے کمرے میں گئی تو اس کا رخ کھلی کھڑکی سے باہر کی

طرف تھا۔
باہر اب بھی اندھیرا تھا اور بارش وقفے وقفے سے ہو رہی تھی۔ بجلی چمکتی تو بہتے پانیوں پر ایک عجیب سی روشنی پھوٹتی۔ اس نے باہر کا منظر بہت دل لگا کر دھیان سے دیکھا تھا اور کھڑکی میں کھڑے شخص کو نظر انداز کر دیا تھا۔
وہ بہت اچھا شخص تھا محبت کرنے والا اور مہربان لیکن پھر سب ہی کچھ بدل گیا۔ ایک سیاہ رات زندگی میں آئی اور اس نے یہ پوچھا بھی نہیں کہ ہوا کیا تھا۔ صرف وہ سنا' جو اسے بتایا گیا۔ اپنا سامان اٹھایا اور خاموشی سے چلا گیا۔
زندگی کبھی بھی آسانی نہیں دیتی۔ لیکن وہ اتنی مشکل ہو جائے گی۔ عبیر کے پاس اس کا کوئی تصور نہیں تھا۔ جب تک علیا کی شادی نہیں ہوئی۔ وہ اس سے اکثر ایک بات پوچھتی۔
"دیکھو! میں تو تمہاری بہن ہوں۔ مجھے بتا دو۔ اس رات تمہارے کمرے میں کون تھا جس سے تم باتیں کر رہی تھیں اور رو رہی تھیں۔"
اور وہ کبھی کوئی جواب نہیں دے سکی۔
دشمن چالاک ہے اور وہ ہمیشہ پیچھے سے وار کرتا ہے۔ مگر بہن کو کوئی کیسے دشمن مان لے۔
"عبیر!" خضر نے پکارا۔ وہ ابھی تک اندھیرے میں ہی باہر نہ جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا۔
"درخت بوڑھے نہیں ہوتے۔ جتنا میں انہیں دیکھ کر گیا تھا ابھی تک یہ اتنے ہی ہیں۔"
"دو سال اتنا لمبا عرصہ نہیں ہوتا کہ اس میں چیزیں بدل جائیں۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔
خضر نے اس کے تلخ لہجے پر اسے پلٹ کر دیکھا۔
"دل کے درد تلخی میں ڈھل جائیں' یہ بہتر ہے بجائے اس کے اسے دل میں رکھ کر اس کی پرورش کی جائے۔"
خضر کے کہنے پر اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ صرف خاموشی سے باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے۔
"کیا تھوڑی دیر رکو گی نہیں؟" خضر نے مڑ کر اسے دیکھے بغیر کہا۔
"کوئی کام ہے تو بتا دیجیے۔"
"کام تو بہت سارے ہیں' کیا کیا بتاؤں۔"
"آپ بتا دیں۔ میں کرنے کی کوشش کروں گی۔" اس کا لہجہ سادہ تھا۔ جو تلخی اس کے لہجے میں آ گئی تھی اب وہ اس نے چھپا لی تھی۔
"اچھا ایک کام کر لو پھر میری سوئیاں نکال دو۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ پھر ایک خاموشی کا وقفہ آ گیا۔ آخر خضر نے ہی اس سکوت کو توڑا۔
"اس طرح تو یہ پوری رات ختم ہو جائے گی۔"
"آپ کو ایک رات ختم ہونے کا ملال ہے اور پوری زندگی کا جواب کون دے گا۔" اس نے بہت ضبط سے جملہ مکمل کیا۔ اتنی سی بات کہنے میں بھی آنسوؤں کی چادر درمیان آ گئی تھی۔
"وہ زندگی جو پوری میری اپنی تھی اس کا کچھ حصہ نفرتوں نے کھا لیا اور باقی پر۔۔۔ ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ ہوا کیا تھا۔ چاہے میں دنیا میں کسی کو سچ نہیں بتاتی مگر آپ کو بتا دیتی۔"
"اور میں کیوں پوچھتا' پوچھا ان سے جاتا ہے جن کو آپ جانتے نہیں ہوں۔ اپنے آپ سے کون صفائی مانگتا ہے۔"
اس کے کہے ہوئے دو جملے تھے اور عمر بھر کا سفر تھا۔ وہ سفر جو محرومیوں سے شروع ہوتا ہے اور خوف میں کہیں گم ہو جاتا۔ ان محرومیوں کے پیچھے چھپ کر پناہ لیتے۔ اس خوف سے بھاگتے ہوئے زندگی کی ساری خوب صورتیاں کہیں کھو جاتی ہیں۔
"بچپن میں جب علیا اندھیرے کمرے میں بند کر دیتی تھی تو روشنی صرف ایک لفظ بن جاتا تھا۔ ایک ایسا لفظ جسے آپ نے کبھی دیکھا نہ ہو۔ یہ وہ دنیا تھی۔ جو اللہ نے میرے لیے تخلیق نہیں کی تھی۔ یہ میری بہن نے میرے لیے بنائی تھی۔ اس خوب صورت دنیا کو لوگ اتنا بدصورت بنا دیتے ہیں کہ پھر یہ رہنے کے قابل ہی نہیں رہتی۔
یہ سزا مجھے چار پانچ دفعہ ہی ملی ہو گی۔ امی کو پتا چلا تو

انہوں نے علیا کو بہت سختی سے ڈانٹا۔ زندگی میں پہلی دفعہ لیکن وہ اندھیرا اور اس اندھیرے کمرے کا خوف ساری عمر میرے ذہن سے نہیں نکل سکا' میرے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا اور دل میں کوئی خواہش سر اٹھاتی تھی کہ کوئی ہو۔ جسے میرا خیال ہو' جو میری باتوں پر توجہ دے۔ انہیں دھیان سے سنے مجھ سے باتیں کرے۔ خواہشیں بڑی بُری چیز ہوتی ہیں۔ ایک دفعہ دل میں جڑ پکڑ لیں تو پھر وہ پاؤں سے لپٹ جاتی ہیں۔ دل میں آکر بیٹھ جاتی ہیں۔ چھپی ہوئی خواہش جنون بن جاتی ہے اور جنون پتا ہی نہیں چلنے دیتا کہ کیا غلط ہے کیا صحیح۔

میں میٹرک میں تھی۔ جب ایک ڈرامہ بڑا مشہور ہوا۔ اس کے ہیرو کا نام سنی تھا۔ میں نے سنی سے دوستی کر لی شاید یہ دوستی ختم بھی ہو جاتی۔ اگر وہ واقعہ میری زندگی میں نہیں ہوا ہوتا۔"

آنسو اب اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ خضر نے نہ اسے ٹوکا' نہ ہی چپ کرایا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے خود ہی چہرہ صاف کر لیا۔

"ہمارے برابر والے گھر میں ریشم رہتی تھی۔ اس کی مجھ سے دوستی تھی وہ اچھی لڑکی نہیں تھی مگر اس عمر میں مجھے یہ بات کون سمجھاتا — جہاں مائیں چپ اور بے حسی کی چادر اوڑھ لیں وہاں' ہر رشتہ اپنی من مانی کرنے کو آزاد ہو جاتا ہے۔"

اب اس کی آواز میں تلخی تھی۔ آنسوؤں کے ساتھ۔

"ریشم نے جس رات گھر چھوڑا۔ کسی لڑکے کے لیے اس شام وہ مجھ سے ملنے آئی تھی۔ وہ مجھے کچھ بتانا چاہ رہی تھی مگر کچھ بتایا نہیں۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد چلی گئی اور اسی رات یہ حادثہ ہوا مگر اس رات اس نے گھر نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ علیا نے اتنے بہتان باندھے تھے' اتنا بدنام کیا کہ میں دوبارہ اپنے خول میں سمٹ گئی۔ سنی جسے میں بھول گئی تھی۔ وہ دوبارہ سے میری زندگی میں آ گیا۔

آپ کے آنے کے بعد میں تقریباً" اسے بھول گئی تھی۔ آپ کو پتا نہیں یاد ہے کہ نہیں' آپ نے کہانیاں لکھنے کو کہا تھا۔ جب میں لکھنے لگی تو مجھے اس کی اتنی ضرورت بھی نہیں رہی۔ اور اس رات بہت عرصے کے بعد میں نے اس سے بات کی تھی۔"

اس نے اپنی آنکھیں نیچے جھکاتے ہوئے آہستہ سے کہا لیکن خضر نے دیکھ لیا تھا۔ اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ سرخ ہو رہی تھیں۔

"میں کافی لے کر آ رہی تھی۔ جب آپ اور تائی جان کی باتیں میں نے سن لیں۔ مجھے یاد نہیں کہ اس سے پہلے میری زندگی میں خوشی کا کوئی ایسا لمحہ آیا ہو۔ دنیا میں کوئی ایسا بھی تھا' جس کے نزدیک میری اہمیت تھی۔ میرے وجود کی حیثیت تھی۔ میرے نزدیک یہ بات اہم نہیں تھی کہ آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ بس مجھے اتنا پتا تھا کہ میرے بے حیثیت وجود کی بھی کوئی اہمیت تھی۔

میں نے تائی جان کی اگلی بات بھی نہیں سنی۔ وہ آپ کو منع کر رہی تھیں نا۔ یا اسی طرح کی کوئی بات مگر میں وہ ساری باتیں سننے کے لیے رکی نہیں۔ مجھے رونا تھا۔ بہت سارا اور میں سنی کو ساری باتیں بتاتے ہوئے رو پڑی۔

میں اس سے بات کر رہی تھی اور رو رہی تھی اور مجھے نہیں پتا تھا۔ کہ تھوڑی دیر بعد مجھے ایک قیامت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لفظ کو کہہ دینا بڑا آسان ہوتا ہے لیکن جس پر گزرتی ہے' اسے کھڑے ہونے کے لیے زمین بھی نہیں ملتی۔ ایک گرتے رہنے کا عمل ہوتا ہے اور تنہا شخص ہوتا ہے' جسے اس وقت یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ اسے دنیا کے سامنے کھڑے ہونا ہے یا مرنا ہے۔

جب بہت دنوں بعد میں نے سانس لینا شروع کی۔ زندگی کو زندہ لوگوں کی طرح سوچنا شروع کیا تو کسی سوچ نے یا شاید غم کے ایک احساس نے دل میں ایک بات ڈالی۔ زندہ لوگوں کے بھی بڑے نخرے ہوتے ہیں۔"

اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی تلخی پھر آئی۔

اور اسے اب مشکل لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے کو دیکھنا اور دیکھنے سے ہوتا بھی کیا ہے۔ اس نے دو سال

ایک وعدے کی پاس داری میں گزار دیے اور پلٹ کر پوچھا بھی نہیں صرف اس لیے کہ اگر پھر اس کی آواز سن لی تو وعدہ نبھانا مشکل ہو جائے گا۔

"تمہارے دل میں ملال تھا نا کہ میں نے شاید علیا کی بات کا یقین کر لیا ہے یا میں تمہیں غلط سمجھا۔"

"چھوڑیں' جانے دیں۔ اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔" وہ اٹھی۔

"اچھا اب میں چلتی ہوں۔ علیا آج کل آئی ہوئی ہے۔ اس کے سر میں بہت درد رہنے لگا ہے۔ علاج کروا رہی ہے۔ اس کی دوا کا وقت ہو گیا ہے۔"

"جاتے جاتے ایک بات سن لیتا۔"

"نہیں اب کوئی بات نہیں' جو گزر گیا" وہ وقت واپس نہیں آسکتا۔ میرے لیے آپ سے شادی ضروری نہیں تھی۔ آپ میرا اعتبار کرتے۔ وہ میرے لیے اہم تھا۔ کوئی ایک ایسی چیز تو ہوتی میرے پاس جسے میں سوچتی تو مجھے لگتا کہ میرے لیے بھی دنیا میں کہیں روشنی ہے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔"

اس کا لہجہ ضدی تھا۔ "صبح کی جانب بڑھتی ہوئی اس اندھیری رات نے زندگی کے بہت سارے اسرار مجھ پر واضح کر دیے تھے۔ میں نے زندگی میں اب اپنے لیے خوشی کا کوئی حصہ نہیں رکھا۔"

اس کے نظر نہ آنے والے آنسوؤں نے جیسے کمرے میں اداسی کی ایک دھند سی بھر دی۔ خضر اس کے سامنے سے ہٹ کر پیچھے مڑ گیا۔

"مجھے بہت لمبی بات نہیں کرنی۔ صرف دو جملے تھے۔ میں نے تمہاری اتنی لمبی کہانی میں ایک دفعہ بھی یہ پوچھا کہ سنی کون تھا؟"

"تو پوچھ لیتے۔" وہ تلخ ہو گئی۔

"میں کیوں پوچھتا ایک خوابوں میں گم رہنے والی سوئی سوئی آنکھوں والی۔ شہزادی جسے اپنی خبر بھی مشکل سے ہو۔ اس کی زندگی میں کسی دوسرے مرد کی گنجائش ہی کہاں ہو سکتی ہے۔ وہ تمہارے کمرے کی کوئی بھی چیز ہو سکتی ہے اور شاید تمہیں اس کی بھی ضرورت نہ ہو۔ میں بہت اچھا سامع ہوں اور تمہاری باتیں تو میں ساری زندگی سن سکتا ہوں بغیر تھکے ہوئے۔ اب کے امی نے خود بھیجا ہے انہوں نے ہا[ر] مان لی۔ ورنہ ایک وعدہ تھا ان کا میرا۔

میرے لیے بھی تم سے شادی اہم نہیں تھی۔ تمہاری عزت زیادہ اہم تھی۔ میں نے امی سے کہا تھ[ا] کہ ابھی آپ نے جو کچھ دیکھا ہے' یہ ساری باتیں اس[ی] رات میں دفن کر دیجیے گا۔ آپ کی زبان پر کبھی کوئی لفظ نہ آئے۔ پھر آپ جو کہیں گی۔ وہ میں مان لوں گا۔

جو کچھ بھی کہا ہے۔ اس میں ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں اور مجھے نہیں پتا کہ تم نے سمجھا یا نہیں۔"

"سچ نظر آتا ہے۔ اسے سمجھنا نہیں پڑتا۔"

خضر کو لگا بہت عرصے بعد اس نے اتنی شفاف مسکراہٹ دیکھی ہے۔ وہ مسکراہٹ جو روشنی تھی اور جو منزلوں کا نشاں دیتی تھی۔

☆

نگہت عبداللہ

میرے خواب لوٹا دو

اجلال رازی اریبہ سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے۔ سارہ کو کھڑکی میں مگن کھڑے دیکھ کر شرارت سے ڈرا دیتا ہے۔ وہ اپنا توازن کھو کر گرنے لگتی ہے تو اجلال اسے بازوؤں میں تھام لیتا ہے۔
یاسمین اور شہباز درانی کی نامناسب گفتگو سن کر اریبہ غصے میں بائیک لے کر نکل جاتی ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ قمشیر علی بروقت اسپتال پہنچا کر اس کی جان بچا لیتا ہے۔ اسی اسپتال میں تاجور بھی داخل ہے۔ اسپتال میں اریبہ کے پاس ساجدہ بیگم ٹھہری ہوئی ہیں۔ اریبہ ہوش میں آنے کے بعد اپنے رویے اور سوچ پر نادم ہے۔ قمشیر علی، توصیف احمد کے آفس میں کام کرتا ہے۔ توصیف احمد نے اسے سیف سے ایک ضروری فائل نکال کر جیلانی صاحب کو دینے کے لیے کہا۔ بعد میں انہیں پتا چلا ہے کہ سیف میں سے فائل کے ساتھ ستر لاکھ روپے بھی غائب ہیں۔
وہ شمشیر پر رقم چوری کا الزام لگاتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ اریبہ ماں کی اصلیت جان کر بالکل بدل جاتی ہے۔ وہ سارہ کو صاف صاف بتا دیتی ہے کہ وہ اسے شہباز درانی کے ساتھ دیکھ چکی ہے۔
رازی اریبہ سے ملنے جاتا ہے تو اریبہ اس کی باتیں سن کر کچھ الجھ سی جاتی ہے۔
تاجور کو اسپتال سے باہر روتے دیکھ کر اریبہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آتی ہے۔

۹

نویں قسط

وقت نے یوں کروٹ بدلی تھی کہ اس کے سوچنے کا انداز ہی بدل گیا تھا وہ جو ہر بات کو تقدیر سے منسوب کر کے سرنگوں ہو جاتا تھا اور پھر مطمئن بھی' وہ اب صرف شاکی ہی نہیں متنفر بھی ہو گیا تھا۔ زیادہ اپنے آپ سے کہ وہ اتنا بزدل تو نہیں تھا' پھر کیسے ہر مقام پر ہتھیار ڈالتا آیا تھا۔ جبکہ کوئی مشکل نہیں تھی۔

اب اسے تاباں یاد آرہی تھی' جو خود چل کر اس کے پاس آئی تھی۔ اس کے اندر حوصلہ تھا۔ ساری کشتیاں جلا کر اس کے ساتھ چلنے کو تیار تھی لیکن اس نے منہ موڑ لیا تھا۔ اپنے دل پر پتھر رکھ کر اسے بھی مایوس کر آیا تھا۔ اسے لگا جیسے اسے اسی بات کی سزا ملی ہے۔ وہ دل توڑنے کا گناہ گار تھا۔

وہ دل جس نے جب دھڑکنا سیکھا تو اس کی ہر دھڑکن میں اس کے نام کی پکار تھی اور وہ کتنے آرام سے اسے قربان گاہ پر چھوڑ آیا تھا۔ گو کہ وہ خود بھی چین سے نہیں تھا۔ ہمیشہ کی طرح مقدر کا لکھا قبول کر کے بہت جلد اس کی بے قراریوں کو قرار آجائے گا اور شاید ایسا ہی ہوتا اگر جو تقدیر پر اس کا ایمان سلامت رہتا۔ وہ ڈگمگا گیا تھا' جب ہی سلامتی کا راستہ جس پر وہ ہمیشہ چلا تھا' اسے غلط قرار دے رہا تھا۔

"تاباں کو مایوس لوٹا کر میں نے اچھا نہیں کیا۔"

اور اس سے بڑی غلطی میں نے تاجور کو اپنے ساتھ لا کر کی۔ ابا کے گھر میں وہ کم از کم محفوظ تو تھی' وہاں خون تھوکتے تھوکتے مر بھی جاتی تو اس کے لیے وہی ٹھیک تھا۔ یہاں جانے اس کے ساتھ کیا ہو۔

اس آخری بات پر اس کی سانسیں رک گئی تھیں۔ ذہن نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ کتنی دیر ساکت بیٹھا رہا' پھر راہداری میں کوئی آواز گونجی تھی' جو اسے عدم سے وجود میں لے آئی۔ سینے سے گہری سانس کے ساتھ ایسا ابال اٹھا تھا' جس نے اس کی پوری ہستی کو ہلا ڈالا تھا۔

"مسٹر توصیف احمد! اگر میری بہن کو کچھ ہوا تو خدا کی قسم! میں تم پر زندگی تنگ کر دوں گا۔"

جوش انتقام نے اس کے اندر آگ لگا دی تھی اور اب اسے کسی پل چین نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ گہری نیند سے گھبرا کر اٹھی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سانسیں بھی ناہموار تھیں۔ فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے اور اسے کیا ہوا ہے۔ عجیب سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے اس نے بے اختیار پکارا تھا۔

"رازی۔۔۔!" اور یک لخت اسے یاد آیا' وہ کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔ ڈراؤنا خواب۔

وہ سر جھٹک کر خود کو اس کیفیت سے نکالنے کی سعی کرتے ہوئے اٹھ گئی۔ لیکن شاور لینے کے بعد بھی اس کا اندر بجھا بجھا سا تھا۔ کچھ دیر ڈرائننگ ٹیبل کے پاس وہ کشمکش میں کھڑی رہی' پھر کمرے سے نکل آئی۔

سارہ اور تاجور لان میں بیٹھی تھیں۔ وہ ان کے پاس آگئی۔

"کیا ہو رہا ہے؟"

"مزے مزے کی باتیں۔" سارہ نے کہا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ بڑے دنوں بعد سارہ اپنے سابقہ موڈ میں نظر آرہی تھی۔

"اس کا مطلب ہے تمہاری تاجور سے دوستی ہو گئی ہے۔" اس نے مسکرا کر تاجور کو دیکھا' وہ گلابی شام کا حصہ لگ رہی تھی۔

"دوستی سے بھی زیادہ۔" سارہ اس سے کہہ کر تاجور سے مخاطب ہو گئی۔ "کیوں تاجور! تم میری بہن ہو ناں۔ سگی بہن۔ اب بتاؤ' ہم کتنی بہنیں ہیں؟"

"تین۔ میں' آپ اور اریبہ باجی۔" تاجور نے جیسے رٹا یا ہوا سبق دہرایا تھا۔

"دیکھا۔۔۔!" سارہ نے اب اترا کر اسے دیکھا تو وہ مسکرا کر کہنے لگی۔

"اچھا تم اپنی چھوٹی بہن سے باتیں کرو' میں ذرا باہر جا رہی ہوں۔ یا باہر سے مطلب تائی امی کے پاس۔"

"تائی امی کے پاس؟" سارہ کی شوخی معنی خیز تھی۔

"ہاں' رازی سے بھی مل لوں گی۔" وہ بظاہر بے نیازی سے کہتے ہوئے پورچ کی طرف بڑھ گئی۔

بڑے دنوں بلکہ مہینوں بعد جب اس نے تایا ابو کے گھر میں قدم رکھا تو وہ متضاد کیفیات میں گھر گئی تھی۔ دل اگر خوشگوار احساس سے دھڑک رہا تھا تو خائف بھی تھا۔ گو کہ اسے یقین تھا ساجدہ بیگم خوشی سے اسے گلے لگائیں گی لیکن اس کے اپنے اندر ندامت تھی' جب ہی ان کے سامنے جھجک کر رک گئی تھی۔

"اریبہ! میری بچی! کیا حال ہے تمہارا؟" ساجدہ بیگم واقعی اسے دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ کھینچ کر اسے گلے لگایا' پھر پاس بٹھا کر بولیں۔ "بہت دل چاہ رہا تھا تمہیں دیکھنے کو۔ کتنی بار رازی سے کہا' مجھے تمہارے پاس لے جائے لیکن وہ روز آج کل پر ٹالے جا رہا ہے۔"

"ارے تائی امی! آپ مجھے ایک فون کر دیتیں' میں اسی وقت آجاتی۔ خیر! باقی سب کہاں ہیں۔ ثنا اور بلال!" اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

"ثنا کچن میں ہے اور بلال آج صبح اسلام آباد گیا ہے۔"

"اسلام آباد کس سلسلے میں؟"

"لو' تمہیں رازی نے نہیں بتایا۔ امریکا بھیج رہا ہے بلال کو کہتا ہے وہاں سے پڑھ آئے' پھر آکر کام سے لگے۔" ساجدہ بیگم نے بتایا تو وہ رازی کی تائید کرتے ہوئے بولی۔

"یہ تو اچھی بات ہے تائی امی! لائف بن جائے گی بلال کی۔"

"اللہ کرے۔ خیر تم دیکھو۔ ثنا کچن میں ہے' اس سے چائے کا کہہ دو اور ساتھ کچھ کھانے کو بھی۔ میں جب تک نماز پڑھ لوں۔" ساجدہ بیگم کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں تو وہ بھی اٹھ کر کچن میں آگئی۔

ثنا غالباً" رات کے کھانے کی تیاری میں لگی تھی۔ دونوں چولہے مصروف تھے۔ اس نے سلام کیا تو ثنا نہ صرف اچھلی بلکہ اسے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں یوں جیسے کوئی جن بھوت دیکھ لیا ہو۔

"کیا میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں یا تمہیں میرا آنا اچھا نہیں لگا؟" اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اگر میں کہوں' دوسری بات ٹھیک ہے تو کیا تم یہاں آنا چھوڑ دو گی؟" ثنا نے مروتاً" بھی بات بنانے کی کوشش نہیں کی اور اگر کرتی تب بھی وہ نادان نہیں تھی' جب ہی اندر ہی اندر جزبز ہوتے ہوئے بولی۔

"صرف تمہارے کہنے سے تو نہیں ہاں' اگر تائی امی کہیں تو میں۔"

"ارے تم تو سیریس ہو گئیں۔" ثنا اب ہنسی تھی۔

"اس لیے کہ تم مذاق نہیں کر رہی تھیں۔ خیر' تائی امی نے چائے کا کہا ہے۔ تم اگر مصروف ہو تو چائے میں بنا دیتی ہوں۔" اس نے بات بدلنے میں دیر نہیں کی۔

"نہیں نہیں تم اندر جاؤ' میں بنا لوں گی۔" ثنا جلدی سے بولی۔

"ساتھ کچھ کھانے کو بھی۔۔۔" وہ کہہ کر رکی نہیں فوراً" پلٹ کر ساجدہ بیگم کے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ لابی سے نکلتے رازی کو دیکھ کر بے اختیار اس کی طرف بڑھی۔

"رازی! تم ٹھیک تو ہو ناں؟"

"تم ہم کب آئیں؟" رازی اس کی آمد پر خوشگوار حیرت میں گھر گیا تھا۔
"کچھ دیر ہوئی۔ تم کیوں نہیں آتے۔ فون بھی نہیں کرتے۔ کیا بہت مصروف ہوگئے ہو؟" وہ پہلے کی طرح بات کر رہی تھی لیکن لہجے میں پہلے والی بے ساختگی نہیں تھی۔ اس کی طبیعت میں ٹھہراؤ آگیا تھا۔
"نہیں بس وہی آفس کی مصروفیت ہے۔"
"پھر...؟"
"پھر شاید میں انتظار کر رہا تھا کہ تم آؤ۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔
"مجھے بھی یہی لگا کہ تم انتظار میں ہو' خیر اب تو میں آگئی ہوں ناں۔" اس نے کہا تب ہی ثنا چائے لے کر آگئی اور ان دونوں کو کھڑے دیکھ کر پوچھنے لگی۔
"چائے کہاں رکھوں' یہاں یا ای کے کمرے میں؟"
"امی کے کمرے میں لیکن ٹھہرو!" رازی نے کہتے ہوئے بڑھ کر ٹرے میں سے دو مگ اٹھا لیے پھر اس سے بولا۔
"آؤ اریبہ! کمرے میں بیٹھتے ہیں۔" وہ ثنا کی ناگواری محسوس کرتے ہوئے رازی کے ساتھ اس کے کمرے میں آئی تو اسے شدت سے محسوس ہوا کہ وہ اپنے جذباتی پاگل پن کے باعث کیا کچھ کھو چکی ہے۔ وہ جو پورے استحقاق کے ساتھ اس کمرے میں آتی اور اس شخص سے اپنی ہر بات دھڑلے سے منواتی تھی' جانے اس کی نظروں میں دوبارہ وہ مقام' وہ مان حاصل کر بھی سکے گی کہ نہیں۔
"بیٹھو ناں...!" رازی شاید اس کی کیفیت محسوس کر گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھماتے ہوئے بہت پیار سے کہا تو وہ اپنے پیچھے کرسی دیکھ کر بیٹھ گئی۔
"بہت چینج ہوگئی ہو تم۔ نہ پہلے جیسی نہ اس کے بعد جیسی۔" رازی نے چائے کا گھونٹ لینے کے بعد اسے دیکھ کر کہا۔
"کیا مطلب؟" وہ سمجھ کر بھی نہیں سمجھی تھی۔
"مطلب یہ کہ ہماری زندگی اور محبت میں جو یہ درمیانی عرصہ بدگمانیوں کا آیا اسے بھول جاؤ۔ اپنی کتاب زندگی سے اس مختصر باب کو پھاڑ ڈالو اریبہ! یہ بہت ضروری ہے ورنہ نہ تم چین سے رہو گی نہ میں۔"
اس کی نظریں... بے کر چائے کے مگ پر ٹھہر گئیں۔
"دیکھو!" قدرے توقف سے وہ پھر گویا ہوا۔ "اپنے بارے میں میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میرے دل میں تمہاری محبت' چاہت' اول روز جیسی ہے بلکہ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس میں اضافہ ہی ہوا ہے کمی نہیں ذرہ برابر بھی کمی نہیں' نہ شائبہ۔ اس درمیانی مختصر عرصے میں تمہارے گریز اور تنفر سے بھی میں مایوس نہیں ہوا تھا کیونکہ مجھے اپنی محبت پر یقین اور بھروسا تھا کہ تمہارے دل پر حالات کی جمی ہوئی گرد چھٹنے میں دیر نہیں لگے گی۔"
اریبہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ ذرا سا مسکرایا۔
"محبت ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے پھر بھی۔" وہ جانے کیا کہنے جا رہا تھا کہ بات ادھوری چھوڑ کر وارڈ روب کھول کر کھڑا ہوگیا۔ پھر پلٹا تو اس کے ہاتھ میں سیاہ بریف کیس تھا۔
"یہ میں نے ایک مخصوص وقت کے لیے سنبھال رکھا تھا۔" وہ کہتے ہوئے واپس اسی جگہ آبیٹھا اور اپنے سامنے بریف کیس رکھ کر کھولا تو اریبہ کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ قدرے الجھن بھی سمٹ آئی تھی۔
بریف کیس مختلف اقسام کے پھولوں کی پتیوں اور کونپلوں سے بھرا ہوا تھا۔
"یہ دیکھ رہی ہو۔ دیار غیر میں ہر دن کے آغاز پر میں تمہیں یاد کرتا اور پھر تمہارے نام کی ایک کونپل یا ایک پتی محفوظ کر لیتا۔" وہ کہہ کر ——— مسکرایا' پھر سرخ گلاب کی ننھی سی کونپل اٹھا کر اس کے سامنے کرتے ہوئے

کہنے لگا۔
”یہ محض ایک کونپل نہیں ہے' اس کے ساتھ ایک پوری داستان ہے۔ میرے جذبوں اور احساسات کی ترجمانی کرتی ہوئی یہ رنگ برنگی کونپلیں' جب تم انہیں چھو کر دیکھو گی تو از خود جان جاؤ گی۔“
”رازی۔۔۔!“ وہ سراسیمہ سی اٹھ کر قریب چلی آئی اور بریف کیس میں ہاتھ ڈال کر مٹھی بھر کر کونپلیں اٹھالیں۔ اس کا دل مدھر تان پر دھڑکنے لگا تھا اور آنکھوں میں انوکھے خواب سج گئے تھے جن کا عکس اس کے چہرے پر جھلک رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

توصیف احمد کوئی تین ہفتے بعد اس طرف آئے تھے۔ سارہ ہمیشہ کی طرح انہیں دیکھتے ہی بھاگی آئی تھی۔ پھر شکوہ بھی کر ڈالا۔
”ڈیڈی! آپ اتنے دنوں بعد آئے ہیں؟“
”بس بیٹا! کچھ آفیشل مصروفیت تھی۔ آپ کیسی ہو؟“
”بالکل ٹھیک۔ چائے لاؤں آپ کے لیے؟“ سارہ نے جواب کے ساتھ پوچھا تو وہ لمحہ بھر توقف سے بولے۔
”ابھی نہیں میں پہلے شاور لوں گا اور ہاں! اریبہ اور حماد کہاں ہیں؟“
”حماد اکیڈمی گیا ہے اور اریبہ تائی امی کے پاس۔“ سارہ بتا کر ان کا چہرہ دیکھنے لگی جس پر ایک لحظہ کو خوشگوار حیرت ابھری تھی۔
”اچھی بات ہے۔ آپ چائے بناؤ میں شاور لے کر آتا ہوں۔“ وہ کہہ کر اپنے کمرے میں آگئے۔
یاسمین کھڑکی۔۔۔ کے قریب کھڑی تھی کسی گہری سوچ میں گم۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر بھی متوجہ نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے ایک نظر اسے دیکھا پھر قصداً ”ذرا سا کھانس کر وارڈ روب سے اپنا سوٹ نکالنے لگے اور جب شلوار سوٹ نکال کر پلٹے تو یاسمین انہیں دیکھ رہی تھی۔
”کیسی ہو۔۔۔؟“ سرسری انداز تھا۔ یاسمین نے جواب نہیں دیا اور غالباً ”انہیں بھی جواب سے غرض نہیں تھی۔ جب ہی سوٹ ہینگر سے نکال کر واش روم میں بند ہو گئے۔
تقریباً ”دس منٹ بعد جب وہ شاور لے کر نکلے تب یاسمین کو اپنا منتظر پایا۔ اس کے باوجود وہ نظر انداز کر کے کمرے سے نکلنا چاہتے تھے کہ اس نے پکار لیا۔
”سنو توصیف۔۔۔!“
وہ رک کے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔
”اگر جلدی میں نہیں ہو تو بیٹھ جاؤ۔ مجھے بات کرنی ہے۔“ خلاف عادت یاسمین نے آرام سے کہا تھا۔
”کیا بات۔۔۔؟“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھ گئے۔
”اریبہ کے بارے میں۔“ یاسمین اسی قدر کہہ کر قصداً ”خاموش ہو گئی۔ مقصد انہیں متوجہ کرنا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ وہ پورے دھیان سے دیکھنے لگے تھے۔
”اریبہ کے بارے میں؟“
”ہاں۔“ یاسمین سبک سبک قدم اٹھاتی بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔ ”میں سوچ رہی ہوں یہ مناسب وقت ہے ہمیں اریبہ کی شادی کر دینی چاہیے۔“
توصیف احمد کے چہرے پر حیرت پھیل گئی مگر بولے کچھ نہیں۔

”آپ کی حیرت میری سمجھ میں نہیں آرہی۔ آئی مین! میں نے کوئی انہونی بات تو نہیں کی۔“ یاسمین نے ان کی حیرت جتا کر کہا تو وہ چونک کر بولے تھے۔
”میں تمہاری بات پر نہیں بلکہ تمہارے منہ سے یہ بات سن کر حیران ہو رہا ہوں۔“
”کیا مطلب؟“ یاسمین کی پیشانی پر ہلکی سی لکیر ابھری تھی۔
”مطلب' پہلی بار تم نے ماں بن کر سوچا ہے۔“
”میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتی۔“ یاسمین فوراً ”بولی تھی۔ ”مجھے بتائیں کیا میں غلط سوچ رہی ہوں؟“
”نہیں میں خود یہی چاہتا ہوں لیکن پہلے ہمیں اریبہ سے پوچھنا پڑے گا یا تم اس سے بات کر چکی ہو؟“ توصیف احمد نے اچانک اس خیال سے یاسمین کو دیکھا تو وہ جز بز ہو کر بولی۔
”نہیں۔ اریبہ سے تو اس سلسلے میں میری بات نہیں ہوئی اور نہ میں کروں گی۔“ دوسری بات بلا ارادہ ہی اس کے منہ سے نکل گئی تھی۔
”کیوں؟“ توصیف احمد نے فوراً ”ٹوکا۔
”کیونکہ مجھے اس کا جواب پتا ہے۔“ یاسمین اب سنبھل کر اپنی بات سنبھال رہی تھی۔ ”وہ یہی کہے گی کہ ابھی اس کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی۔ پھر ہاؤس جاب کا بہانا کرے گی۔“
”بہانا کیوں' یہ تو اسے کرنا ہی ہے۔“ توصیف احمد کہہ کر سگار سلگانے لگے۔
”بالکل کرنا ہے۔ شادی کے بعد کر لے گی۔ میرا خیال ہے ادھر سے کوئی پابندی نہیں ہو گی۔“
”گویا تم اریبہ کی فوری شادی طے کر چکی ہو۔“ توصیف احمد سگار ہونٹوں سے نکال کر یاسمین کو دیکھنے لگے۔
”طے تو آپ کریں گے اور اریبہ سے بات بھی آپ کو کرنی ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ آپ کی بات کو وہ یونہی ہنسی میں نہیں اڑا دے گی۔ آپ سمجھ رہے ہیں ناں۔“
”ہوں!“ توصیف احمد نے پرسوچ انداز میں اثبات میں سر ہلایا پھر پوچھنے لگے۔
”اور سارہ کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟“
”سارہ کو ابھی دیر ہے۔ میرا مطلب ہے گریجویشن کر لے' پھر سوچیں گے۔“
”ٹھیک ہے۔“ توصیف احمد اٹھ کھڑے ہوئے۔
”چلو' سارہ چائے پر انتظار کر رہی ہو گی۔“
”سوری' میرا چائے کا موڈ نہیں ہے۔“ یاسمین کی معذرت پر وہ ذرا سے کندھے اچکا کر کمرے سے نکل آئے۔
لاؤنج میں سارہ کے ساتھ تاجور بھی موجود تھی اور اسے دیکھ کر ہی توصیف احمد فاصلے پر رک گئے تھے۔
”آجائیں ڈیڈی! چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ سارہ نے انہیں رکتے دیکھ کر کہا پھر فوراً ”تاجور کا تعارف کرانے لگی۔ ”یہ میری اور اریبہ کی مشترکہ دوست ہے اور اریبہ کی پیشنٹ بھی۔“
”پیشنٹ؟“ وہ سرسری نظر تاجور پر ڈال کر پھر سارہ کو دیکھنے لگے۔
”جی' بس ایسا ہے کہ اسے اکثر کوئی نہ کوئی تکلیف ہو جاتی ہے۔ کبھی سر میں درد' کبھی پیٹ میں اور کبھی معدے میں تو اس کے مستقل علاج کے لیے اریبہ اسے گھر لے آئی ہے۔ آئی مین! اس کے گھر والوں کی اجازت سے۔“
یہ پہلا موقع تھا کہ سارہ توصیف احمد کے سامنے غلط بیانی کر رہی تھی۔ صرف اس لیے کہ کہیں وہ تاجور کے یہاں رہنے پر اعتراض نہ کریں۔
”تو اریبہ کے علاج سے اسے کچھ فائدہ ہوا؟“ انہوں نے چائے کا گھونٹ لے کر پوچھا تو سارہ پرجوش ہو گئی۔

"بہت بہت زیادہ۔ اگر آپ دو ہفتے پہلے اسے دیکھتے تو یہ برسوں کی مریض لگ رہی تھی۔ اب دیکھیں! ایسی فریش لگ رہی ہے۔"

"ہوں۔" توصیف احمد بلا ارادہ تاجور کو دیکھنے لگے تھے۔ اصل میں ان کا ذہن یاسمین کے ساتھ ہونے والی گفتگو سوچ رہا تھا اور انہیں یک گونہ اطمینان محسوس ہو رہا تھا کہ یاسمین نے ایک ذمہ داری یا فرض کو محسوس کیا اور وہ اس فرض کی ادائیگی کے لیے سنجیدہ بھی تھی۔ اس لیے انہوں نے تاجور کے بارے میں زیادہ سوال جواب نہیں کیے اور چائے ختم ہوتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا بیٹا! میں ایک کام سے جا رہا ہوں۔"

"کیوں ڈیڈی! آپ رکیں گے نہیں؟" سارہ نے فوراً" پوچھا تو وہ مسکرا کر بولے۔

"یہیں آؤں گا۔ کچھ دیر ہو جائے گی۔ آپ کھانے پر انتظار مت کرنا۔"

"جی۔۔۔!" سارہ اپنی جلد بازی پر خجل سی ہو گئی تھی۔

✡ ✡ ✡
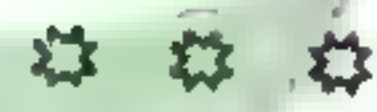
اس کی زندگی میں پھر وہ موڑ آگیا تھا' جہاں محبت بانہیں پھیلائے اس کی منتظر تھی اور وہ اجلال رازی کا ہاتھ تھام کر اس راہ پر چل پڑی تھی۔ رات جب وہ واپس آئی تو بہت مگن تھی۔ توصیف احمد کے پاس بس تھوڑی دیر بیٹھی' پھر اپنے کمرے میں آکر فوراً" سونے کی تیاری کرنے لگی تو سارہ نے حیرت سے ٹوک دیا۔

"اتنی جلدی سو رہی ہو؟"

"ہاں جلدی سوؤں گی تو جلدی اٹھوں گی۔" وہ کہتے ہوئے لیٹ بھی گئی۔

"شاید تم بھول رہی ہو' کل سنڈے ہے۔" سارہ الماری میں جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔

"نہیں' مجھے یاد ہے۔"

"پھر۔۔۔؟" سارہ الماری بند کر کے اسے دیکھنے لگی۔

"پھر یہ کہ لائٹ آف کر دو۔" اس نے کہا تو سارہ تیزی سے اس کے قریب آئی تھی۔

"زیادہ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو' میں کیا سننا چاہتی ہوں۔"

"سناؤں گی لیکن ابھی نہیں۔ ابھی بہت نیند آ رہی ہے۔ تمہیں پتا ہے مسی وڈو کی مست ہوا میں کیسا نشہ ہے۔"

اس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔

"مجھے تو یہ کوئی اور ہی نشہ لگ رہا ہے۔" سارہ خود سے کہتے ہوئے لائٹ بند کر کے کمرے سے نکل گئی تو وہ اس کی بات سوچتے ہوئے سو گئی تھی۔

پھر صبح معمول سے بہت پہلے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ ابھی اجالا پوری طرح نہیں پھیلا تھا اور چونکہ وہ بھرپور نیند لے چکی تھی' اس لیے دوبارہ سونے کی کوشش نہیں کی۔ اٹھ کر نماز پڑھی پھر لان میں نکل آئی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ سارے موسم ہمارے اپنے اندر ہوتے ہیں۔ اس کے دل میں پھر سے امنگیں جاگ اٹھی تھیں تو سب کچھ نیا اور اچھا لگ رہا تھا۔ لان کے دو چکر لگانے کے بعد وہ اندر جانے لگی تھی کہ توصیف احمد کو آتے دیکھ کر رک گئی۔ ان کے پیچھے بی بی چائے کی ٹرے لیے چلی آ رہی تھیں۔

"السلام علیکم!" توصیف احمد کے قریب آنے پر اس نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ آج آپ جلدی اٹھ گئیں۔" توصیف احمد نے خوش دلی سے جواب دینے کے ساتھ کہا۔

"رات سوئی بھی تو جلدی تھی۔" اس نے کہتے ہوئے بی بی کے ہاتھ سے ٹرے لے کر ٹیبل پر رکھی پھر کپ میں

چائے ڈالتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"ڈیڈی! اس غبن کیس کا کیا ہوا۔ رقم ملی کہ نہیں؟"

"نہیں بیٹا! رقم ملنا مشکل ہے بلکہ ناممکن۔ مجرم سزا قبول کر لیتا ہے لیکن چرایا ہوا پیسہ واپس نہیں کرتا۔"

"پھر آپ اس نقصان کو کیسے پورا کریں گے؟" وہ چائے کا کپ ان کے سامنے رکھ کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔

"دیکھو۔" توصیف احمد غالباً" صبح صبح نفع نقصان کی باتیں نہیں کرنا چاہتے تھے' جب ہی چائے کا گھونٹ لے کر دوسری طرف دیکھنے لگے۔ وہ سمجھ کر خاموش ہو گئی۔ پھر قدرے توقف سے انہیں مخاطب کر کے کہنے لگی۔

"ڈیڈی! میں چاہتی ہوں ایف ایس سی کے بعد حماد کو آپ باہر بھیج دیں۔"

"باہر؟" توصیف احمد وضاحت کے لیے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔

"میرا مطلب ہے ایجوکیشن کے لیے امریکہ یا کینیڈا اور اس کے لیے میرا خیال ہے' اسے ابھی سے کسی یونیورسٹی میں اپلائی کر دینا چاہیے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا! لیکن پھر سارہ اکیلی ہو جائے گی۔" توصیف احمد نے کہا تو وہ سمجھی نہیں۔

"سارہ اکیلی ہو جائے گی؟"

"ہوں آپ تو۔ آئی مین ہم آپ کی شادی کا سوچ رہے ہیں۔ رات آپ کی مما سیریس تھیں۔ کہہ رہی تھیں اب ہمیں آپ کی شادی کر دینی چاہیے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟" توصیف احمد نے بات کے اختتام پر اسے دیکھا تو وہ بہت ضبط سے گویا ہوئی۔

"نہیں ڈیڈی! میرا ایک سال ہے۔ یہ کمپلیٹ ہونے دیں۔ اس کے بعد جیسا آپ کہیں گے' مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ البتہ میں یہ ضرور چاہتی ہوں کہ پہلے سارہ کی شادی ہو جائے تو اچھا ہے۔"

"سارہ کی۔" توصیف احمد قدرے متعجب ہوئے۔ "سارہ کی پہلے کیسے ہو سکتی ہے۔ آئی مین وہ آپ سے چھوٹی ہے۔"

"تو کیا ہوا جب اسے کچھ بننا نہیں ہے تو بہتر ہے' اسے اس کے گھر کا کر دیں۔ یوں بھی اسے گھرداری کا بہت شوق ہے۔" اس نے قصداً" ہلکا پھلکا انداز اختیار کیا۔ توصیف احمد ذرا سا مسکرائے پھر جانے کیا سوچنے لگے تھے۔ اس نے چند لمحے ان کے بولنے کا انتظار کیا پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلیں ڈیڈی! میں ناشتا لگواتی ہوں۔"

"آں' ہاں آپ چلو میں پہلے شاور لوں گا۔" توصیف احمد نے چونک کر کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر اندر چلی آئی۔

پھر جب تک توصیف احمد رہے' اس نے اپنی کسی بات' کسی عمل سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اس کے اندر کیسا ابال اٹھ رہا ہے اور نکلنے کو بے تاب بھی ہے۔ بہت ضبط کیا تھا اس نے خود پر۔ پھر جب توصیف احمد چلے گئے تب وہ کسی طرح خود کو نہیں روک سکی اور اسی وقت یاسمین کے کمرے میں آکر دروازہ اندر سے لاک کرتے ہی جیسے پھنکاری تھی۔

"ڈیڈی کو میری شادی کا مشورہ آپ نے دیا ہے؟"

"ہاں۔ یہ مشورہ میرا ہی ہے۔ کیونکہ تم شادی کے قابل ہو گئی ہو۔" یاسمین نے اس کے تیوروں کا نوٹس لیے بغیر کہا تو وہ مزید تلملا گئی۔

"شادی کے قابل تو میں اس وقت بھی تھی جب آپ نے مجھے میرے منگیتر اور اس کے گھر والوں کے خلاف اکسایا تھا؟"

"میں نے حقیقت بیان کی تھی اور ابھی بھی وہی سچ ہے کہ وہ لوگ اس گھر کے خیر خواہ نہیں ہیں۔ تم محض میری ضد میں ان سے رشتہ جوڑنا چاہتی ہو بلکہ جوڑ چکی ہو پھر شادی پر کیا اعتراض ہے تمہیں۔" یاسمین نے ہنوز ٹھنڈے ٹھنڈے بات کی تھی۔

"میں نے شادی پر نہیں بلکہ فوری شادی پر اعتراض کیا ہے۔ کیونکہ میں آپ کا مقصد جانتی ہوں۔ مجھے اپنی راہ کا کانٹا سمجھ رہی ہیں نا آپ اور نکال پھینکنا چاہتی ہیں تو مما! یہ آپ کی بھول ہے۔ جب تک آپ کا فیصلہ نہیں ہو جاتا میں اس گھر سے رخصت نہیں ہوں گی۔" وہ چبا چبا کر اور جتا کر بولی تھی۔

"کیسا فیصلہ...؟" یاسمین نے دھڑلے سے خود کو انجان پوز کیا تھا۔

"آپ بہت اچھی طرح جانتی ہیں۔ مجھے بار بار آپ کی داستان دہرانے کا شوق نہیں ہے بلکہ شرم آتی ہے مجھے اور آپ سن لیں، مجھے آپ پر بالکل بھروسا نہیں ہے۔ اس لیے میں نے ڈیڈی سے کہہ دیا ہے کہ وہ پہلے سارہ کی شادی کا سوچیں۔ جب تک سارہ عزت و آبرو کے ساتھ اپنے گھر کی نہیں ہو جاتی میں اس گھر سے نہیں جاؤں گی۔" اس نے نا چاہتے ہوئے بھی پھر یاسمین کو آئینہ دکھا دیا تھا۔

"تم!" یاسمین پھٹ پڑنے کو تیار تھی لیکن وہ رکی نہیں تیزی سے اس کے کمرے سے نکل آئی تھی۔

✡ ✡ ✡

تاجور کو یہاں آئے چار مہینے ہو گئے تھے۔ مستقل علاج کے ساتھ اچھی غذا اور پرسکون ماحول نے بظاہر اس کی صحت پر بہت اچھا اثر ڈالا تھا۔ اریبہ نے ہر مہینے اس کے ٹیسٹ کروائے تھے اور اب اس کی رپورٹس بھی اسے صحت مند قرار دے رہی تھیں۔ لیکن اس کا دل اپنوں سے بچھڑنے کا دکھ نہیں سہار پا رہا تھا۔ کوئی دن ایسا نہیں تھا جب وہ اپنوں کو یاد کر کے روئی نہ ہو اور اس کا رونا بھی رات کی تنہائیوں میں ہوتا تھا۔ اریبہ اور سارہ کے سامنے وہ آنسو نہیں بہاتی تھی کیونکہ جس طرح وہ دونوں بہنیں اس کی دل جوئی کے جتن کرتی تھیں تو اسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ آنسو بہا کر انہیں پریشان کرے۔ ان کے سامنے وہ پرسکون ہی رہتی تھی البتہ ہر دوسرے دن اپنے بھائی کا ضرور پوچھتی تھی کہ اس کا پتا چلا کہ نہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اس کا بھائی کہاں چلا گیا۔ وہ جو اس کے لیے ابا سے لڑ گیا تھا، وہ اسے کیسے چھوڑ گیا۔

اس وقت وہ بہت دل گرفتہ بیٹھی تھی۔ بھائی کے ساتھ اسے اپنا گھر اور گھر والے یاد آ رہے تھے۔ ابا چھوٹا بھائی اور منی جو سارا وقت اس کی گود میں رہتی تھی۔ اماں کے ظالمانہ سلوک کے باوجود وہ منی کو خود سے دور نہیں کر سکی تھی۔ اس کی معصوم حرکتوں پر ہی تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی تھی ورنہ تو اس کی زندگی میں کوئی خوشی نہیں تھی۔ اس کا دل چاہا، وہ ابھی اڑ کر گھر پہنچ جائے۔ اچانک اس کے اندر ایسی بے چینی پھیلی کہ وہ گھبرا کر کمرے سے نکل آئی۔ سامنے سے اریبہ آ رہی تھی، وہ بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔

"باجی! میں گھر جاؤں گی۔ اپنے گھر ابا کے پاس۔ منی کے پاس۔" بے قراری سے کہتے ہوئے اس کے آنسو بھی روانی سے چھلک گئے تھے۔

"ارے تو روتی کیوں ہو چلی جانا۔" اریبہ نے اسے بازوؤں میں بھینچ کر تسلی دی۔

"کیسے جاؤں گی۔ مجھے تو پتا بھی نہیں ہے میرا گھر۔" وہ اور شدت سے رونے لگی۔

"میں پتا کر لوں گی۔ تم رو مت۔ آؤ ادھر میرے کمرے میں چلو۔" اریبہ اسے اپنے ساتھ لگائے ہوئے کمرے میں لے آئی اور سارہ سے بولی۔

"سارہ! اس کے لیے پانی لے آؤ۔"

"کیوں؟ اسے کیا ہوا ہے؟" سارہ تاجور کے آنسو دیکھ کر فوراً کھڑی ہو گئی لیکن جواب کا انتظار نہیں کیا۔ اسی طرح فوراً جا کر پانی لے آئی اور گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا کر اریبہ کو دیکھا تو وہ اسی قدر بولی تھی۔

"گھر یاد آ رہا ہے۔"

"بے وقوف ہو تم، یہ گھر نہیں ہے کیا۔ وہاں جا کر کیا کرو گی۔ اماں کی مار ہی کھاؤ گی۔" سارہ پیار سے تاجور کو ڈانٹنے لگی تھی۔

"مجھے ابا یاد آتے ہیں اور منی بھی۔ بھائی نے کہا تھا میں ٹھیک ہو جاؤں گی تو وہ مجھے ابا کے پاس لے جائیں گے۔ اب تو میں ٹھیک ہو گئی ہوں نا باجی۔" وہ آنسو صاف کر کے اریبہ کو دیکھنے لگی۔

"ہاں لیکن ابھی تمہیں بہت احتیاط کی ضرورت ہے اور تمہارا پرہیز بھی ختم نہیں ہوا۔ تم ابھی کچھ دن صبر کرو۔ مجھے تمہاری طرف سے پورا اطمینان ہو جائے گا تب میں خود تمہیں تمہارے ابا کے پاس چھوڑ آؤں گی۔" اریبہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

"میں بھی ساتھ چلوں گی۔ مجھے گاؤں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔" سارہ اشتیاق سے بولی تھی۔

"پر مجھے تو راستہ نہیں آتا۔" اس کے چہرے پر بے بسی اور لہجے میں مایوسی تھی۔

"راستہ بھی مل جائے گا۔ کیوں اریبہ؟" سارہ نے کہتے ہوئے اریبہ کو دیکھا۔ وہ جانے کیا سوچنے لگی تھی۔ چونک کر اثبات میں سر ہلایا پھر تاجور سے پوچھنے لگی۔

"تم نے اپنے بھائی کا کیا نام بتایا تھا؟"

"شمشیر علی...!" تاجور پوری جان سے متوجہ ہو گئی تھی۔

"شمشیر علی؟" اریبہ پرسوچ انداز میں دہرا کر بولی۔ "میرا خیال ہے سارہ! ہسپتال سے اس کے بھائی کا ایڈریس مل سکتا ہے۔"

"ہسپتال سے...؟"

"ہاں! اسے ایڈمٹ کراتے وقت ظاہر ہے اس نے فارم فل کیا ہو گا تو اس میں ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ سب ہو گا۔"

"اگر ایسا ہے تو تم فوراً پتا کرو۔" سارہ نے کہا تو تاجور جو باری باری دونوں کو دیکھ رہی تھی پوچھنے لگی۔

"آپ کیا کہہ رہی ہو باجی...؟"

"میں کہہ رہی ہوں۔ تمہارے بھائی کا پتا کرتے ہیں۔ چلو سارہ! ابھی چلتے ہیں۔" اریبہ کہنے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی تو تاجور فوراً بولی۔

"میں بھی چلوں باجی...؟"

"ہاں چلو، ذرا آؤٹنگ بھی ہو جائے گی۔ سارہ تم اماں سے آؤٹنگ ہی کا کہہ آؤ۔" اریبہ نے کہا پھر تاجور کو لے کر باہر نکل آئی اور جب تک اس نے گاڑی نکالی، سارہ بھی آ گئی تھی۔

پھر ہسپتال سے تاجور کا فارم نکلوانے میں گو کہ کافی وقت لگ گیا تھا۔ شام اتر آئی تھی پھر بھی اس نے باقی کارروائی آئندہ پر نہیں ٹالی کیونکہ تاجور بہت بے چین ہو رہی تھی۔ ہسپتال دیکھ کر ہی بے قراری سے چلائی تھی۔

"ہاں۔ یہی ہے۔ بھائی مجھے یہیں چھوڑ گئے تھے۔ وہ مجھے یہیں دیکھنے آتے ہوں گے۔" اور اسی طرح جب وہ مطلوبہ ایڈریس پر پہنچی تب تاجور خوشی سے بے قابو ہو گئی تھی۔

"یہی ہے باجی! بھائی کا گھر ادھر ہی ہے۔ وہ سامنے اوپر۔"

"اچھا تم دونوں یہیں رکو۔ میں پتا کر کے آتی ہوں۔" اس نے کہتے ہوئے سارہ کو دیکھا اور اس کی خائف

نظروں سے بہت کچھ سمجھ کر گاڑی سے اتر کر اپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"ہم بھی چلتے ہیں نا باجی! بھائی مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔" تاجور نے سارہ کا بازو ہلا کر کہا۔

"صبر کرو اریبہ آجائے پھر۔" سارہ نے بے دھیانی میں اسے ٹوکا پھر ایک دم احساس ہونے پر نرمی سے کہنے لگی۔ "دعا کرو تمہارا بھائی یہیں ہو۔ اگر وہ کہیں اور چلا گیا ہو گا تب تو تم ابھی اس سے نہیں مل سکو گی۔"

"پھر 'پھر کب ملوں گی؟" وہ پھر بے چین ہو گئی۔

"پھر جب ہم اس کا نیا گھر تلاش کرلیں گے۔ تم فکر مت کرو' ایسے ہی جیسے ہم یہاں تک پہنچ گئے ہیں نئے گھر تک بھی پہنچ جائیں گے۔"

"ابھی۔" اس کی بے صبری پر سارہ مشکل میں پڑ گئی۔

"ابھی نہیں بابا! خیر اریبہ کو تو آنے دو 'کہاں رہ گئی۔" سارہ رخ موڑ کر اس طرف دیکھنے لگی جدھر اریبہ گئی تھی۔ لیکن اس کا دھیان تاجور کی طرف تھا جس کا بس نہیں چل رہا تھا بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ جائے۔

"الٰہی! تو اس لڑکی پر رحم کر۔" سارہ نے دل سے دعا کی پھر اریبہ کو آتے دیکھ کر سیدھی ہو بیٹھی اور کن اکھیوں سے تاجور کو دیکھنے لگی۔ جس نے اریبہ کے گاڑی میں بیٹھنے تک بمشکل صبر کیا تھا۔

"کیا ہوا باجی! میرا بھائی۔"

"وہ یہاں نہیں ہے۔" اریبہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔ "کہیں اور چلا گیا ہے۔ اس کے سامنے والے بتا رہے تھے 'شاید کسی اور شہر۔"

"اور شہر۔ مجھے چھوڑ کر؟" وہ جیسے ٹوٹ گئی تھی۔

"نہیں۔ تمہیں کیوں چھوڑے گا۔ وہاں گھر کا انتظام کرے گا پھر آکر تمہیں لے جائے گا۔" اریبہ نے کہتے ہوئے سارہ کو اشارہ کیا تو وہ شروع ہو گئی۔

"ہاں۔ شہروں میں گھر آرام سے نہیں مل جاتے۔ بہت مشکل ہوتی ہے۔ اسی لیے اسے اتنے دن لگ گئے۔ تم پریشان مت ہو 'بلکہ دعا کرو اللہ تعالیٰ تمہارے بھائی کی مدد کرے۔"

"میں تو ہر وقت دعا کرتی ہوں۔" وہ روہانسی آواز میں بولی تھی۔

"اچھی بات ہے 'نماز بھی پڑھا کرو۔"

"مجھے قرآن شریف پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ ادھر گاؤں میں میں نے پہلا پارہ پڑھا تھا۔ پھر اماں نے اٹھا دیا۔"

"تو تو پہلے بتانا تھا۔ میں ابھی جا کر بی بی سے کہوں گی۔ وہ تمہیں قرآن شریف پڑھا دیں گی۔ مجھے اور اریبہ کو بھی انہوں نے ہی پڑھایا ہے۔" سارہ نے کہا تو وہ خوش ہو گئی۔

"سچ باجی! اب تو میں جلدی قرآن شریف ختم کرلوں گی۔ بھائی کے آنے سے پہلے ہی۔" اس کا دھیان بٹ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

یاسمین کے لیے اپنی روش بدلنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا 'کیونکہ وہ شروع سے خود سر اور خود پسند تھی۔ وہ ان لوگوں میں تھی جن کے لیے صرف اپنا آپ اہم ہوتا ہے۔ باقی رشتے ناتوں کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ اپنی ہر جائز ناجائز منوانا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ لیکن دوسروں کی جائز بھی نہیں مانتے۔ یہی اس کی فطرت تھی۔ جب ہی وہ گھر 'شوہر اور بچوں کو صرف اپنا ماتحت سمجھتی تھی لیکن ان کی بننے پر تیار نہیں تھی۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ کائنات کا سارا نظام دو اور لو کے اصول پر چل رہا ہے۔ اور شاید سب جانتے ہیں اس لیے وہ لوگ،

صرف لینا چاہتے ہیں وہ راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ ان کا ذہن سازشی ہو جاتا ہے کہ وہ جو مرضی کرتے رہیں کوئی اعتراض بھی نہ کر سکے۔

یاسمین نے بھی یہی کیا تھا۔ پہلے اریبہ کو استعمال کیا اور جب اریبہ پر اس حقیقت کھل گئی تو بجائے نادم ہونے کے اریبہ کو جلد سے جلد اس گھر سے رخصت کرنے کا سوچنے لگی تھی۔ لیکن اب اریبہ نادان نہیں رہی تھی۔ اس وقت جب تینوں لڑکیاں آؤٹنگ کا کہہ کر نکلی تھیں تو وہ شہباز درانی کے پاس آگئی تھی اور اس کے سامنے یہی رونا رو رہی تھی۔

"اس لڑکی کا میں کیا کروں شیبی! وہ تو مجھ پر یوں نظر رکھنے لگی ہے۔ جیسے وہ میری اماں ہو۔ اتنی بندشیں تو میں نے اپنی اماں کی برداشت نہیں کی تھیں۔ میری ہی غلطی ہے' بہت سر چڑھا لیا تھا میں نے اسے۔ کنٹرول میں رکھتی تو اب وہ میرے مقابل کھڑی ہونے کی جرات نہ کرتی۔"

"کم آن یاسمین! جو ہو گیا اس پر بیٹھ کر مت پچھتاؤ۔ آگے کی سوچو۔" شہباز نے ٹوک کر کہا پھر جیسے یاد آنے پر پوچھنے لگے۔ "اور ہاں شادی کی بات نہیں کی تم نے؟"

"کی تھی' خلاف توقع توصیف تو خوش ہو گئے لیکن اس نے منع کر دیا۔" یاسمین نے مایوسی کا اظہار کیا۔

"کیا کہتی ہے؟" شہباز درانی چائے کا کپ رکھ کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔

"بہت تیز ہو گئی ہے۔ سمجھ گئی کہ میں اسے گھر سے کیوں رخصت کرنا چاہتی ہوں۔" یاسمین ایک ہی جگہ نظریں مرکوز کیے بول رہی تھی کیونکہ اس کے ذہن میں مختلف سوچیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

"واقعی!" شہباز درانی کو یقین نہیں آیا۔ "وہ تو خاصی بے وقوف لڑکی تھی۔ خیر تم اتنی جلدی مایوس کیوں ہو رہی ہو۔ اس بات کو مزید آگے بڑھاؤ۔"

"کون سی بات کو؟" یاسمین نے چونک کر پوچھا تھا۔

"اریبہ کی شادی والی بات کو۔"

"کیسے' کیسے آگے بڑھاؤں۔ جب وہ منع کر چکی ہے۔" یاسمین جھنجلائی تھی۔

"تمہیں منع کیا ہے نا۔ ہو سکتا ہے کسی اور کو منع نہ کرے۔ اس لیے خود بات کرنے کے بجائے کسی اور سے کہلواؤ بلکہ منواؤ بھی۔" شہباز درانی نے آخری بات پر زور دیا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن اور کون؟" یاسمین سوچ میں پڑ گئی پھر جیسے کوئی سرا اس کے ہاتھ آگیا تھا۔ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے شہباز درانی کو دیکھ کر مسکرائی تھی۔

☆ ☆ ☆

اریبہ نے سارہ اور تاجور کو خوب گھمایا پھرایا۔ فوڈ میلہ میں کھانا بھی کھلایا۔ تینوں نے کافی انجوائے کیا تھا۔ اور جب گھر آئیں تو رات کے دس بج رہے تھے۔ سارہ اور تاجور تو سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئیں' لیکن وہ لاؤنج ہی میں رک گئی۔ کیونکہ اس نے دیکھ لیا تھا پورچ میں یاسمین کی گاڑی موجود نہیں تھی۔ پھر بھی پہلے اس نے یاسمین کے کمرے میں جا کر چیک کیا پھر اس کے سیل فون پر کال ملائی تھی۔

"ہیلو!" یاسمین کی آواز کے ساتھ اسے ماحول میں کچھ گھما گھمی محسوس ہوئی تھی۔

"کہاں ہیں آپ؟" اس نے فوراً" پوچھا تو یاسمین بڑے پیار سے بولی۔

"بیٹا! میں تمہاری تائی امی کے پاس ہوں۔"

"تائی امی کے پاس۔" وہ دہشت حیرت میں کھو گئی۔

"ہاں! بس میں آہی رہی تھی' لیکن تمہاری تائی امی نے کھانے پر روک لیا۔ تم لوگ کھانے پر میرا انتظار مت کرنا۔ اوکے۔"

یاسمین نے اپنی بات ختم کر کے فون بند کر دیا۔ اس کے بعد بھی کتنی دیر وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یاسمین وہاں کیسے پہنچ گئی۔

"نہیں! مما وہاں نہیں جا سکتیں۔ انہوں نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے۔" وہ سوچتے ہوئے کمرے میں آئی تو سارہ منتظر تھی۔ دیکھتے ہی پوچھنے لگی۔

"تم کہاں تھیں؟"

"وہ مما۔ مما گھر پر نہیں ہیں۔" اس کا ذہن ابھی بھی الجھا ہوا تھا۔

"ہاں تو اکیلی وہ گھر پر کیا کرتیں' کلب چلی گئی ہوں گی۔" سارہ نے لاپروائی سے کہا تو وہ یکدم چیخ گئی۔ وانت پیس کر بولی۔

"کلب' کیوں جاتی ہیں وہ کلب' جب ڈیڈی کو پسند نہیں ہے۔"

"یہ تم سے کس نے کہا؟ میرا مطلب ہے ڈیڈی نے تو کبھی اعتراض نہیں کیا۔" سارہ کا انداز ہنوز تھا۔ وہ مزید چڑ گئی۔

"تمہیں کیا پتا۔"

"سب پتا ہے مجھے۔ خیر! تم ان باتوں کو چھوڑو اور مجھے تاجور کے بھائی کا بتاؤ۔ کیا بتایا اس کے آس پاس کے لوگوں نے؟" سارہ یہی جاننے کے لیے اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

"اف! ایک تو تم۔" وہ سر پیٹ کر جانے لگی تھی کہ سارہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔

"ہاں میں جانے بغیر سو نہیں سکوں گی۔ بتاؤ! کیا ہوا ہے اس کے بھائی کے ساتھ؟"

"کچھ نہیں ہوا۔" وہ زچ ہو گئی۔ "وہاں فلیٹ والے بھی اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ ایک نے بتایا کہ وہ صبح نکلتا تھا اور رات میں واپس آتا تھا۔ دیکھنے میں پڑھا لکھا شریف آدمی نظر آتا تھا۔ لیکن پھر ایک دن اس کی غیر موجودگی میں پولیس آئی اور اس کے فلیٹ کی تلاشی لی۔ اب پتا نہیں انہیں کس چیز کی تلاش تھی۔ بہرحال! اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ یا تو روپوش ہے یا پھر حوالات میں۔ بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتی' سمجھیں۔"

"میں تو سمجھ گئی' لیکن تاجور کو کیسے سمجھائیں گے؟" سارہ کی سنجیدگی اسے خائف ظاہر کر رہی تھی۔

"فی الحال اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے اور دیکھو! ابھی ہم بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ تمہیں میں خاص طور سے یہ باور کروا رہی ہوں کہ کسی کے سامنے تاجور کے بھائی کا نام مت لینا۔ کیونکہ اگر وہ واقعی مجرم ہوا تو پھر ہم بھی مشتبہ ٹھہریں گے۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا۔" اس نے زور دے کر کہا تو سارہ تائید کرتے ہوئے بولی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو اریبہ! لیکن مسئلہ تو پھر وہیں کا وہیں ہے۔ ہم تاجور کو کب تک اپنے پاس رکھیں گے۔ مما روز اس کے بارے میں سوال کرتی ہیں اور اب تو ڈیڈی نے بھی اسے دیکھ لیا ہے۔"

"ہاں! اس کے لیے سوچنا پڑے گا۔ میرا خیال ہے کہ رازی سے بات کروں' ہو سکتا ہے وہ اس بات پر آمادہ ہو جائے کہ ہم تاجور کو اس کے گاؤں چھوڑ آئیں۔" اس نے اپنا خیال ظاہر کیا تو سارہ پُرسوچ انداز میں اثبات میں سر ہلانے لگی۔ تب ہی یاسمین کی اونچی ہیل کی ٹک ٹک سنائی دی۔ وہ سارہ کا ہاتھ دبا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اگلے پل یاسمین نے دروازہ کھولا۔ اس کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ تھی جو اس سے پہلے اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے؟" یاسمین کا موڈ خوشگوار اور انداز دوستانہ تھا۔

"کچھ نہیں مما! آیئے بیٹھیں۔" سارہ نے کہا۔ وہ یاسمین کو بیٹھنے پر آمادہ دیکھ کر اپنا موبائل اٹھا کر کمرے سے نکل آئی۔ ڈرائنگ روم تک آتے آتے اس کا موبائل بجنے لگا۔
"رازی.....!" اسکرین پر نام دیکھ کر اس نے ایک پل میں کیا سوچ ڈالا۔ پھر موبائل کان سے لگا لیا' لیکن بولی کچھ نہیں تھی۔
"ہیلو.... اریبہ!" رازی نے پکارا۔ تب وہ چونک کر بولی۔
"ہاں.... کیسے ہو؟"
"اچھا ہوں.... خوش ہوں' تم کیسی ہو؟" رازی کے لہجے میں ہلکی سی شوخی تھی۔ جیسے چھیڑنے پر آمادہ ہو۔
"میں بھی' میرا مطلب ہے' اچھی ہوں۔" وہ اس کے لہجے پر غور کرنے لگی۔
"اور؟" وہ جانے کیا جاننا چاہ رہا تھا۔
"اور کیا' کوئی خاص بات ہے کیا؟"
"بالکل خاص ہے۔ تمہارے لیے نہیں ہے کیا؟" رازی نے جس یقین سے کہا۔ اس سے وہ سمجھ کر پوچھنے لگی۔
"مما تمہارے گھر آئی تھیں؟"
"ہاں' اور اب تم بوریا بستر سمیٹ لو' کیونکہ امی اور یاسمین آنٹی تو لگ رہا تھا۔ آج کی نشست میں شادی کی تاریخ طے کرکے اٹھیں گی۔"
"ایسے کیسے؟" اس کا ذہن چیخا تھا۔
"کیا مطلب؟" رازی نے فوراً ٹوکا۔
"مطلب یہ کہ ابھی میرے امتحان دور ہیں۔ اس سے پہلے ایسا کوئی سلسلہ شروع نہیں ہو سکتا۔" اس نے سنبھل کر وضاحت کی۔
"یہ تم نے سوچ لیا ہے؟" وہ اب سنجیدہ ہو گیا تھا۔
"ہاں.... میں نے ڈیڈی سے کہہ دیا تھا اور تم تائی امی کو بھی سمجھا دو۔ جلدی مچانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ امتحانوں سے پہلے میں اس موضوع پر نہ بات کروں گی' نہ سنوں گی۔" اس کے دو ٹوک انداز پر رازی خاموش ہو گیا۔
"سنو.... میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کی۔ بس یہ کچھ مہینے ہیں۔ نہیں تو میری اتنے سالوں کی محنت پر پانی پھر جائے گا۔" اس نے رازی کی خاموشی محسوس کرکے کہا تو ادھر اس نے پہلے گہری سانس کھینچی' پھر بولا۔
"اچھا' یہ بتاؤ' کب مل رہی ہو۔"
"یہ کیا بات کی تم نے؟ ہمیں ملنے کے لیے کبھی باقاعدہ پلاننگ کی ضرورت تو نہیں پڑی۔ جب چاہے آجاؤ۔"
"اوکے' جلدی آؤں گا۔"
"میں انتظار کروں گی۔" وہ مسکرائی' پھر سیل آف کرکے یاسمین کی پلاننگ سوچنے لگی۔

☆ ☆ ☆

شہر میں ہڑتال کے باعث آج سارہ کالج نہیں جا سکی تھی۔ وہ ناشتے کے بعد سے ہی گھر کی صفائی ستھرائی میں لگ گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ اس معاملے میں خاصی جنونی ہو جایا کرتی تھی۔ آج بھی اس پر ایسا ہی دورہ پڑا تھا۔ اپنے کمرے سے شروع ہوئی۔ پھر لیونگ روم' ٹی وی لاؤنج اور ڈرائنگ روم کے پردے' کشن تک بدل ڈالے۔ آخر میں

برآمدے سے پورچ تک دھو ڈالا۔ اس کے بعد نہا کر نکلی تو "بھوک بھوک" چلاتی ہوئی کچن میں آگئی۔
"بس بی بی! جو کچھ کھانے کو ہے' جلدی سے دے دیں۔" اس نے وہیں چیئر کھینچ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ پھر تاجور پر نظر پڑی تو اس سے پوچھنے لگی۔
"تمہیں بھی بھوک لگی ہے؟"
"نہیں! میں روٹی پکا رہی تھی۔" تاجور نے بتایا تو وہ حیران ہوئی۔
"ہائیں! تمہیں روٹی پکانی آتی ہے؟"
"ہاں! میں سالن بھی پکا لیتی ہوں' اور بھی سارے کام آتے ہیں۔ اپنے گھر میں' میں ہی تو کرتی تھی۔ یہاں بی بی منع کرتی ہیں۔ کہتی ہیں تم مہمان ہو۔ میں مہمان ہوں باجی؟" تاجور نے تفصیلی جواب کے بعد آخر میں معصومیت سے پوچھا تو وہ بے ساختہ مسکرائی۔
"نہیں۔"
"پھر آپ بی بی سے کہیں نا' مجھے منع نہ کیا کریں۔ میں ایسے ہی بیٹھے بیٹھے تھک جاتی ہوں۔"
"اچھا! ٹھیک ہے۔ ہلکے پھلکے کام کر لیا کرو' لیکن خود کو تھکانا مت۔ اب آؤ! کھانا کھاؤ۔" اس نے بی بی کے ہاتھ سے سالن کی ڈش لیتے ہوئے کہا۔
"آپ نے بھی تو آج اتنا کام کیا ہے۔" تاجور اس کے سامنے بیٹھ گئی۔
"کبھی کبھی کرتی ہوں۔ بڑا مزا آیا۔ تھک کر چور ہو گئی ہوں۔ اب لمبی تان کر سوؤں گی۔" سارہ جلدی جلدی نوالے لینے لگی۔
"آپ کی امی دوپہر میں کھانا نہیں کھاتیں؟" تاجور نے پوچھا۔
"نہیں.... وہ ناشتا دیر سے کرتی ہیں نا' اس لیے دوپہر کا کھانا گول کر جاتی ہیں۔" وہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر وہیں سنک پر ہاتھ دھو کر پلٹی تو پوچھنے لگی۔
"تم اب کیا کرو گی؟"
"میں بی بی کے ساتھ نماز پڑھوں گی۔ پھر قرآن شریف کا سبق لوں گی۔"
"اچھی بات ہے۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کچن سے نکلی تو سامنے سمیر آرہا تھا۔ جسے دیکھتے ہی اس نے برا سا منہ بنایا' کیونکہ اس وقت وہ کسی سے بھی بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی' صرف سونا چاہتی تھی۔
"مانا کہ بے وقت آگیا ہوں' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم بری بری شکلیں بناؤ۔" سمیر نے اس کی بری شکل دیکھتے ہی ٹوک دیا۔
"میری شکل ہی ایسی ہے۔" وہ کہتے ہوئے اپنے کمرے میں آگئی۔
سمیر تیزی سے اس کے پیچھے آیا اور غالباً گھر کی دھلائی دیکھ کر پوچھنے لگا۔
"کوئی آرہا ہے کیا؟"
"تم آتو گئے ہو۔"
"اچھا! تو میرے آنے کی خوشی میں یہ اتنا اہتمام ہوا ہے۔ یعنی صفائی' ستھرائی' دھلائی' سجاوٹ' ویسے تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں آرہا ہوں۔" وہ ایک سانس میں بولے گیا۔
"میرا دل کہہ رہا تھا۔" سارہ نے شرمانے کی ایکٹنگ کی۔
"سچ!" سمیر خوش ہو گیا۔
"بس.... زیادہ آپے سے باہر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بتاؤ! اس تپتی دوپہر میں کہاں آوارہ گردی کرتے پھر

رہے ہو۔" وہ فوراً" اپنی جون میں آگئی۔
"آوارہ گردی۔" سمیر ایک لمحہ کو پھیکا پڑا تھا۔ پھر اسے دیکھ کر کہنے لگا۔ "تم کہہ سکتی ہو' ورنہ سچ یہ ہے' تمہیں دیکھنے کو' تم سے باتیں کرنے کو دل بے تاب ہوا اور میں چلا آیا اور اس سے بڑا سچ یہ ہے کہ مجھے یہ امید یا خوش فہمی بھی نہیں تھی کہ تم مجھے دیکھ کر خوش ہو جاؤ گی۔"
"کافی حقیقت پسند ہو گئے ہو؟" وہ کوشش سے ہنسی تھی۔
"ہاں۔ اب ہو گیا ہوں۔"
"تو پھر اپنے دل کو بھی سمجھا لو۔ کیوں اس کے کہنے میں آتے ہو؟" وہ اپنے ناخن دیکھنے لگی۔
"بس یہ اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ اس معاملے میں تم بہت اسٹرانگ ہو۔ بلکہ شاید تم دنیا کی واحد لڑکی ہو جس کا دل اس کے بس میں ہے۔" سمیر نے کہا تو وہ بے اختیار نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔
"میں نے غلط تو نہیں کہا۔"
"نہیں۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرا محبت پر' جذبوں پر یقین نہیں ہے۔ میں مانتی ہوں محبت ہو جاتی ہے۔ مجھے بھی ضرور ہو گی' بلکہ میں منتظر ہوں اس لمحے کی۔ جانے کب آئے گا اور جانے کون ہو گا' جس کے سامنے میں بے بس ہو جاؤں گی۔" وہ جانے کہاں کھوئی تھی۔ سمیر ٹھٹک کر اس کے قریب آگیا۔
"کون ہو گا۔ کیا تم نے کوئی خیالی پیکر تراش رکھا ہے؟ کیسا ہے؟ مجھے بتاؤ سارہ! کیا سوچتی ہو تم؟ کیا چاہتی ہو؟"
"میں کیا چاہتی ہوں۔" وہ ہنوز کھوئی ہوئی تھی۔ "میں تو بس اتنا چاہتی ہوں کہ وہ مجھے میری تمام خامیوں اور غلطیوں سمیت دل سے قبول کرے۔"
"تو کیا میں ایسا نہیں کر سکتا؟" وہ اسے جھنجوڑنا چاہتا تھا' لیکن بہت ضبط سے کھڑا تھا۔
"تم۔ تم میں اتنا حوصلہ ہے۔ میں اگر تم سے جھوٹ بولوں۔"
"میں تمہارا یقین کروں گا۔" وہ فوراً" بولا۔
"اور اگر سچائی سامنے آگئی؟"
"جھٹلا دوں گا۔"
وہ بے حد خاموش نظروں سے اسے دیکھے گئی۔
"اور۔ اور بتاؤ؟" وہ جانے کیسے اتنا سنجیدہ ہو گیا تھا۔
"اور یہ کہ مجھے پستیوں میں اترنے کا شوق ہے۔ میرا دل چاہتا ہے میں کوئی ایسا کام کروں کہ سب مجھ سے نفرت کرنے لگیں۔ اگر ایسا ہو گیا' تب تم کیا کرو گے؟" اس نے کہا تو سمیر بری طرح جھنجلا گیا۔
"تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا؟ فضول بکواس کیے جا رہی ہو۔"
"ہاہا!" وہ زور سے ہنسی' پھر ہنستی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ سمیر مذاق سمجھ کر تلملا رہا تھا۔ پھر ایک دم اس کا بازو پکڑ کر جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا تو اس کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔
"جانتی ہو پستیوں میں اترنا کسے کہتے ہیں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔
وہ ان سنی کر کے دوسرے ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھوں سے بہتا پانی صاف کرنے لگی۔
"کبھی خواب میں بھی مت سوچنا۔" وہ اسی طرح جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔
"میں مذاق نہیں کر رہی تھی۔" وہ دبے لہجے میں پھٹ پڑی۔ "میں نے ایسا ہی ایک خواب دیکھا تھا۔ بہت مینہ برس رہا تھا اور میں کہیں پاتال میں اتر گئی تھی۔ بہت کیچڑ تھا۔ میرا پورا وجود کیچڑ میں لتھڑ گیا تھا۔ منہ' سر' سب کچھ۔ کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں انتظار کرتی رہی۔ کوئی مجھے کیچڑ سے نکالے۔ کوئی نہیں آیا۔ تم بھی نہیں۔ پھر تم اتنے بڑے دعوے کیوں کرتے ہو؟"
"مائی گاڈ! تم خواب کو اتنا سیریس لے رہی ہو۔" سمیر نے زچ انداز میں ٹوکا تو وہ آزردگی سے بولی۔
"خواب سچ بھی تو ہو جاتے ہیں۔"
"نہیں! ایسے فضول خوابوں کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ چلو جاؤ! منہ دھو کر آؤ' پھر کھانا کھاتے ہیں۔"
"میں کھا چکی ہوں۔ تم بی بی سے کہو' وہ کھانا نکال دیں گی۔" وہ کہہ کر واش روم میں بند ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

اس وقت توصیف احمد' ساجدہ بیگم کے بلانے پر ان ہی کی طرف جا رہے تھے اور ابھی تھوڑا فاصلہ ہی طے ہوا تھا کہ ایک آدمی دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے گاڑی کے سامنے آگیا۔ گویا رکنے کا اشارہ تھا۔ توصیف احمد نے گاڑی کنارے پر لے جا کر روک دی تو وہ آدمی تیزی سے قریب آکر کہنے لگا۔
"سر! میں الیاس ہوں۔ آپ کے آفس میں چوکیدار تھا۔"
"ہوں!" توصیف احمد اسے پہچان کر اثبات میں سر ہلانے لگے۔
"سر! مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" الیاس نے کہا تو وہ رسمی انداز میں بولے تھے۔
"ٹھیک ہے! کل آفس آجانا۔"
"آفس نہیں سر! وہاں سے تو مجھے نکال دیا گیا تھا اور وارننگ بھی دی گئی تھی کہ میں کبھی ادھر سے نہ گزروں۔"
"کون؟ آئی مین کس نے ایسا کہا؟" ان کی پیشانی پر لکیریں ابھر آئیں۔
"میں سب بتاؤں گا سر! آپ مجھے تھوڑا سا وقت دیں۔ نہیں تو آپ کبھی اصل مجرم تک نہیں پہنچ سکیں گے۔" الیاس نے کہہ کر ادھر ادھر یوں دیکھا' جیسے اسے خطرہ ہو کہ کوئی اس کی بات سن نہ لے۔
"مجرم۔!" توصیف احمد ٹھٹکے۔
"جی سر! جس نے آپ کی تجوری سے پیسہ نکالا تھا' میں اس کی بات کر رہا ہوں۔ یہ کام شمشیر علی نے نہیں کیا سر! وہ تو بہت بھلا لڑکا ہے۔ آپ نے اسے کیوں حوالات میں بند کروا دیا؟ وہ بے چارا تو۔"
"الیاس۔" وہ شمشیر علی کی تعریف میں جانے کہاں تک جاتا کہ انہوں نے ٹوک دیا۔
"چلو! گاڑی میں بیٹھو۔"
"جی سر۔!" الیاس فوراً" گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔
توصیف احمد نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

امت العزیز شہزاد

آنکھ اور منظر

سہ پہر تین بجے کا عمل تھا۔

شاپنگ مال میں رش تقریباً "نہ ہونے کے برابر تھا۔

تب ہی تو میں اپنی شاپنگ معمول کے وقت سے بھی پہلے نمٹا چکی تھی۔ عموماً" مجھے شاپنگ کرنے میں محض گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہی لگا کرتا تھا کہ میری قوت فیصلہ غضب کی تھی۔ جھٹ کوئی چیز پسند آئی اور پٹ خرید ڈالی۔ اب یہ الگ بات کہ بعد میں امی' بہنوں حتیٰ کہ دیگر کزنز سے بھی خوب جھاڑ پڑتی۔ انہیں میرے یوں فاسٹ شاپنگ نمٹانے پر سخت اعتراض تھا۔ ان سب کا خیال تھا کہ یا تو میرے اندر "حس جمال" سرے سے موجود ہی نہیں تھی یا اگر وہ اپنی جگہ پر موجود تھی بھی تو اس کی کارکردگی مشتبہ ہی تھی۔ بقول ان خواتین کے "کہ بھلا ایسی شاپنگ میں بھی کوئی مزا ہے؟ نہ کپڑے کی کوالٹی پر شکوک و شبہات کا اظہار' نہ جوتوں کی بناوٹ پر تنقید' نہ کاسمیٹکس کو چیک کر کر کے ردی کرنا' نہ جوڑیوں کی میچنگ کے لیے اتاؤلا پن اور نہ ہی جیولری کا کوئی ایک آدھ نگ "جھولا" سے پیشتر نکل جانے پر جیولری منہ پر دے مارنے کی دھمکی۔

انہیں تو اس بات کا بھی شدید قلق تھا کہ میں نے آج تک کسی دکان دار سے کمر پر ہاتھ ٹکا کر جھگڑا تک تو کیا نہیں تھا۔

خیر' ان ہی وجوہات کی بنا پر وہ سب میرے سنگ اور خاص طور میری نجی شاپنگ کے سلسلے میں جانے سے شدید انکاری ہی رہا کرتی تھیں۔ (ابھی بتایا نا آپ کو کہ ان کی دانست میں میرے اندر حس جمال کی شدید کمی تھی۔ اب پتا نہیں وہ کون سی "حس" تھی جو ان اوٹ پٹانگ حرکتوں سے "لطف" اٹھاتی تھی بہرحال) آج بھی یہی ہوا تھا سب ہی نے میرے ساتھ آنے سے انکار کر دیا تھا۔

سو میں اکیلی ہی چلی آئی۔ شاپنگ جلدی مکمل ہو گئی۔ ساری دیر تو اپنی مطلوبہ کتاب کی تلاش میں ہی لگی۔ میں جس وقت بک پوائنٹ میں گھسی' اس وقت پونے دو بجے تھے اور شاپ سے نکلتے وقت میں نے رسٹ واچ پہ نظر ڈالی۔

"اف۔۔۔!" ساڑھے تین ہو رہے تھے۔ بہرحال میں خوش تھی کہ مطلوبہ کتاب مل ہی گئی تھی۔

میں نے سوچا کہ چلو پیٹ پوجا کی جائے ویسے بھی مجھے شاپنگ مال میں بنے فوڈ کورٹ کا زنگر بے حد مرغوب تھا۔ میں نے اندر قدم رکھا۔ یہاں بھی اکا دکا ہی لوگ تھے ٹیبلوں پر۔۔۔

میں نے نسبتاً" کارنر کی ٹیبل منتخب کی اور براجمان ہو گئی۔ شاپر اپنے ساتھ جبکہ کتابیں ٹیبل پر ہی ایک طرف کر کے رکھ دیں۔

"جی میڈم۔۔۔" ویٹر فوراً" ہی چلا آیا۔

"ایک زنگر ود چیز اور کوک۔" میں نے آرڈر نوٹ کروایا۔ میں جانتی تھی آرڈر آنے میں تھوڑا وقت لگے گا۔ سو اسی لیے مزے سے نئی نویلی کتاب کھول کر اس کا ابتدائیہ پڑھنے لگی۔

تب ہی سامنے سے دو آدمی اور ایک لڑکی آتے دکھائی دیے۔ انہوں نے ٹھیک میرے سامنے والی میز کا انتخاب کیا۔

لڑکی بدرنگ سیاہ عبایا اور سرمئی نقاب میں تھی۔ دبلی پتلی' نقاب سے جھانکتی اس کی آنکھیں مدقوق سی تھیں۔ جبکہ اس کے ساتھ براجمان آدمی نے کالی بدرنگی پتلون کہ جس کے پائنچے خاصے گھسے ہوئے تھے اور ملگجی سی نیلی شرٹ پہن رکھی تھی۔ تیسرا آدمی بے حد ناگوار حلیے میں تھا۔ پکا سانولا رنگ' پیلی پیلی سی آنکھیں کندھے سے گرتی قمیص۔۔۔

مگر ان کے پاس کافی سارے شاپنگ بیگز تھے جو کہ اس آدمی نے اپنے ساتھ ہی رکھ لیے تھے۔ مجھے قدرے حیرت ہوئی۔ ان کے حلیے ارد گرد کے ماحول سے قطعی میل نہ کھاتے تھے کہ اگر اس شاپنگ مال کی بات کی جائے تو اس کا شمار شہر کراچی کے اچھے بڑے اور مہنگے شاپنگ سینٹرز میں ہوتا تھا اور ظاہر ہے ایسی جگہ پر عموماً" اس حلیے کے لوگ شاپنگ نہیں کیا کرتے۔

"بتا کیا کھائے گی؟" لڑکی کے ساتھ بیٹھے شخص نے پوچھا۔

"اوں۔۔۔ ہوں' ایسی جلدی بھی کیا ہے' پہلے بات

تو کرو۔" وہ لھنکی۔

"نہیں! پہلے بتا دے۔ یہ لوگ بنانے میں کافی دیر لگاتے ہیں' اپنے علاقے جیسا حساب نہیں ہے جہاں سب ہی کچھ پہلے سے تیار رکھا مل جاتا ہے۔"

اس نے کہا۔ گو کہ وہ اپنے لحاظ سے دھیمی آواز ہی میں گفتگو کر رہے تھے لیکن چونکہ میری ٹیبل ان سے نزدیک تھی اور کچھ یہاں کا ماحول بھی خاصا پر سکون سا تھا اسی لیے ان کی آواز گونج رہی تھی۔

"تکہ مل جائے گا؟"

"ہاں..."

"تو پھر منگوالو۔"

"اچھا اور میں کیا کھاؤں؟" اس آدمی نے شرارت سے پوچھا۔

"تمہارے لیے تو میں لائی ہوں کڑھائی پکا کر۔"

اس نے فخریہ بتایا۔

بہرحال انہوں نے آرڈر دیا۔

میں بڑے غور سے ان تینوں کو دیکھ رہی تھی۔ سچی بات ہے کہ نجانے کیوں ان کے انداز و اطوار مجھے مشکوک سے ہی لگے تھے۔

لڑکی... جس نے ابھی تک چہرے سے نقاب نہیں ہٹایا تھا۔ آواز سے کافی چھوٹی بلکہ نو عمر ہی لگ رہی تھی۔

"میم اور کچھ..." میرا آرڈر ٹیبل پر سجاتے ویٹر نے پوچھا۔

"نو تھینکس..." میری نظریں اب بھی وہیں تھیں۔

"گھر سے کیا بول کر لایا ہے تو۔" پینٹ شرٹ والے نے شلوار قمیص والے سے استفسار کیا۔ وہ جواباً" دائیں آنکھ دبا کر ہنسا۔

"اپنے ساتھ لایا ہوں اور کیا کہتا۔"

"اس کی ماں نے اعتراض نہیں کیا؟"

"کرے بھی کیسے' مجھ پر اعتبار کرتی ہے۔" وہ پھر ہنسا' اس بار لڑکی نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

اتنے میں ان کے سیدھے ہاتھ کی ٹیبل پہ دو بھاری بھرکم خواتین شاپنگ بیگز سے لدی پھندی آکر ڈھیر ہو گئیں۔ ان کی سانسیں اتھل پتھل تھیں۔ ویٹر ان کے پاس دوڑا آیا۔

"دو لیمونیڈ لاؤ فوراً" آرڈر بعد میں دیں گے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ ویٹر تعمیل کو دوڑ گیا۔

"وہ سوٹ دکھاؤ جو ابھی ہم نے لیا ہے۔" لڑکی بولی۔ سامنے بیٹھے آدمی نے ایک شاپر میں سے جھلملاتا ملٹی شیڈ کا ایک سوٹ نکالا۔ لڑکی اسے اپنے اوپر رکھ کر دیکھنے لگی۔

"قربان جاؤں' بہت پیاری لگے گی تو اس میں۔" پینٹ شرٹ والا اس پر جھکا کہہ رہا تھا۔

"چھوڑو جی' مجھے تو وہ جامنی والا ہی بھایا تھا پر تم نے یہ لے دیا۔" وہ نخرے سے بولی۔ شلوار قمیص والا مسلسل پیلے دانت نکالے بیٹھا تھا۔

"چاند! وہ بھی لے دوں گا' ابھی تو دو دفعہ کا پھیرا اور باقی ہے۔ ابھی کہاں تیری خریداری مکمل ہوئی ہے۔"

وہ بڑے پیار سے بولا اور پیار سے اس کا کندھا تھپکا لڑکی نے ہاتھ نہیں چھڑایا۔ دونوں بھاری بھرکم خواتین کی چنی منی آنکھیں حیرت سے گویا پھٹ سی گئی تھیں ان کو دیکھ کر۔

"نقاب تو اتار دو۔" وہ بولا۔

"نہ بھئی' اگر جو کہیں اماں کا کوئی جاسوس ہوا تو؟" وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ہر وقت تیرے سر پہ تیری ماں کا ہوا سوار رہتا ہے۔ اتنا ڈرتی ہے اس سے تو مت آیا کر میرے پاس۔" وہ غصے سے نتھنے پھلا کر بولا۔

"ڈرتی میں اس سے نہیں' اس کے خصم سے ہوں... شکایت لگا کر مجھے گھر میں بند کروا دے گی۔" وہ روہانسی لہجے میں بولی تو وہ یک لخت نرم پڑ گیا بولا۔

"تجھے کیوں اتنی نظر رکھتی ہے وہ عورت۔ اپنی باری میں تو طلاق لے کر اپنے یار کا گھر آباد کرنے چل دی۔ تب اسے کوئی خیال نہیں آیا۔"

"اسے میرا نہیں' تیرا خیال ہے۔"

"ہاں' یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" سامنے بیٹھے شخص

نے اپنے پیلے دانت اندر کر کے کہا۔ "بڑا گھبراتی ہے وہ اس بات سے کہ کہیں یہ تجھ سے نہ مل جائے اور پھر اس کا اپنے خصم کے بھتیجے سے اس کا نکاح کروانے کا جو ارادہ ہے نا' وہ تیری وجہ ہی سے تو خاک میں مل سکتا ہے۔" وہ مزے لے لے کر بولا۔

میں ابھی تک ان میں کھوئی ہوئی تھی۔ نجانے کیا قصہ تھا یہ...

"اور میں نے بھی قسم کھائی ہے' اس کا منصوبہ خاک میں نہ ملایا تو میرا نام بھی رشید علی نہیں۔" وہ بولا۔

اتنے میں ان کا آرڈر آگیا۔ لڑکی نے اپنے پرانے سے ہینڈ بیگ سے کوئی برتن نما چیز نکالی اور خالی پلیٹ پر اوندھا دی۔ لڑکی تکہ کھانے لگی۔ کھاتے وقت بھی اس نے نقاب نہیں اتارا تھا بلکہ ہاتھ نقاب کے اندر لے جا کر کھا رہی تھی۔

وہ دونوں عورتیں اب بھی انہیں دیکھ کر طرح طرح کے منہ بنا رہی تھیں۔ معنی خیز اشارے' آنکھوں کی حرکت... مجھے بھی حقیقتاً" انہیں دیکھ کر کچھ عجیب ہی سا احساس ہو رہا تھا۔

"کیسا ہے؟" لڑکی نے غالباً" سالن کے متعلق استفسار کیا تھا۔

"زبردست! تیرے ہاتھ میں بڑا ذائقہ ہے۔" اس نے لڑکی کے ہاتھ اٹھا کر چوم لیے۔ عورتوں کے حیرت سے منہ کھل گئے۔

میں نے بھی ناگواری محسوس کی۔ اس وقت فوڈ کورٹ میں ہم تینوں یعنی میرے' ان تینوں اور ان دونوں خواتین کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

"پندرہ دن ہیں تیرے پاس۔ رو لے اس عورت کے ساتھ۔ پندرہ دن کے بعد کا ٹکٹ کٹواؤں گا۔ یہاں سے چلے چلیں گے لاہور۔ وہاں میرے چاچے کا لڑکا رہتا ہے۔ اسے بتا دیا ہے سب کچھ۔ وہ انتظام رکھے گا ساری چیزوں کا بس ایک بار یہاں سے نکل لے..." وہ ابھی اور کچھ کہنا چاہتا تھا کہ شلوار قمیص میں ملبوس شخص اچانک اچھلا۔ غالباً" اس کی جیب میں پڑا موبائل گنگنایا تھا۔

"تیری میری' میری تیری پریم کہانی ہے مشکل۔"

"مر گئے رشید... اس کی ماں کا فون ہے۔" وہ گھبرا کر بولا۔

"سن تو سہی' کیا کہہ رہی ہے؟" وہ ناگواری سے بولا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

"ہاں' ہاں اچھا فکر نہ کر۔ آتے ہیں۔" اس نے فون رکھا اور بولا۔

"فوراً" جانا ہو گا۔ اس کے سسرال والے آئے بیٹھے ہیں ناپ شاپ لینے۔" وہ بھی بہت اپنی کوک ختم کر کے بولا۔

"اٹھ جا تو بھی۔" لڑکی تو پہلے ہی کھڑی ہو گئی تھی۔

"اچھا! ابھی تو یہ سامان اپنے ساتھ لے جا۔" وہ لڑکی رشید نامی آدمی سے بولی۔

"ظلم ہے... یہ سامان تیرے لیے اتنے پیار سے خریدا تھا۔" وہ متاسف لہجے میں بولا۔

"غم نہ کر شاباش! جہاں اتنا صبر کیا ہے وہاں چند دن اور سہی' پھر اب تو پندرہ دن کی ہی بات ہے۔" شلوار قمیص والے نے گویا اسے دلاسا دیا۔ وہ جلدی سے بل دے کر کے اٹھے اور فوڈ کورٹ سے نکلتے چلے گئے۔

"توبہ توبہ! قیامت کی ساری نشانیاں نظر آ رہی ہیں حرافہ کیسے دیدہ دلیری سے بیٹھی بڈھے کے ساتھ بھاگنے کا پروگرام بنا رہی تھی۔" ان کے جانے کے بعد ان میں سے کونے والی نے کلیجے پیٹے۔

"تو اور کیا... اور لکھ لو میری بات۔ ٹھیک آدمی نہیں تھا وہ جو اسے لیے پھر رہا تھا۔ کیا پتا بردہ فروش ہو؟" دوسری والی نے لب کشائی کی۔

"ہاں تو اور کیا... دیکھا نہیں تھا کیا میسنے پن سے بیٹھا ان دونوں کم بختوں کو کھل مل کے باتیں کرنے کا موقع فراہم کر رہا تھا۔"

"دیدوں کا پانی مر گیا ہے۔ کم بخت کیسے بن بن کے بول رہی تھی۔ زرا حیا نہیں ہے۔"

"جی میڈم جی... سئی (صحیح) کہہ رہی ہیں جی آپ مجھے بھی لگ رہے تھے وہ دو نمبر۔" ان کی ٹیبل صاف

کرتے ویٹر نے کہنا ضروری سمجھا۔ اب ان دونوں خواتین نے میری طرف یوں دیکھا گویا میں بھی اس "ذکر خیر" میں اپنا حصہ ڈالوں گی مگر میں کیا کہتی۔۔۔ سب اپنے اعمال کے خود جواب دہ ہیں۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی اور بل دے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

معاً" میری نظر اس سوٹ کے شاپر پر پڑی جسے وہ لڑکی دیکھ رہی تھی اور جو یقیناً" غلطی سے یہیں رہ گیا تھا۔

ویسے تو مجھے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے تھا مگر ایسا ہے کہ میرے اندر خدمت خلق کے جراثیم بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ سو جلدی سے شاپر اٹھایا اور گویا بھاگتی ہوئی میں فوڈ کورٹ سے باہر آئی۔ ادھر ادھر انہیں تلاش کیا مگر ناکامی۔ تھوڑی اور آگے بڑھی تو مین روڈ پر وہ ٹیکسی روکتے دکھائی دیے۔۔۔ میں تقریباً" دوڑتی ہوئی ان تک پہنچی۔

لڑکی اور شلوار قمیص والا ٹیکسی میں بیٹھ چکے تھے اور وہ کھڑکی میں جھکا کھڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے نفرت سی محسوس ہوئی۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو معاشرے میں بے راہ روی کا باعث بن رہے ہیں مگر میرے پاس امانت تھی سو مجھے اسے مخاطب کرنا ہی تھا۔ میں ان کے قریب آئی۔ لڑکی رو رہی تھی ہچکیوں کے ساتھ۔

"کچھ کرو جلدی۔ ماں کو تمہاری طرف سے دھڑکا ہے ایسا نہ ہو وہ کل ہی میرا نکاح اپنے شوہر کے عیاش بھتیجے سے کر دے۔ اس عورت کو تو دولت کے آگے کچھ دکھائی نہیں دے رہا مجھے تمہارا ہی سہارا ہے۔"

"غم نہ کر رانی۔۔۔ کچھ نہیں کر سکے گی وہ ایسا کرتے ہیں۔ میں پرسوں ہی تجھے لے چلتا ہوں یہاں سے۔ ابھی گھر جا چل اپنا ضروری سامان سمیٹ۔ میں کل رات کے ٹکٹ کٹانے کی کوشش کرتا ہوں۔ جا رانی! فکر نہ کر۔ میں غریب سہی پر لنتا بے بس نہیں ہوں کہ تیرے لیے کچھ نہ کر سکوں۔ بس اب مت رو۔ چپ کر جا نہیں تو تیری ماں کو پتا لگ جائے گا۔ جا گھر جا۔"

وہ آدمی گلوگیر لہجے میں اسے دم دلاسے دے دلا کر ٹیکسی کو رخصت کر کے آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ میں یک لخت ہوش میں آئی اور جھجکتے ہوئے اسے پکارا۔

"ایکسکیوزمی بھائی صاحب! ذرا سنیے۔"

"مجھ سے کچھ کہا ہے آپ نے؟" وہ مڑ کر تحیر آمیز لہجے میں بولا۔

"جی جی۔ یہ آپ کا شاپر وہاں رہ گیا تھا۔" میں نے جلدی سے ہاتھ میں موجود اکلوتا شاپر اس کی طرف بڑھایا گیا۔ میں نے اپنا سامان دوسرے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔

"ارے۔۔۔ یہ کہاں رہ گیا تھا۔" اس آدمی نے گویا جھپٹ کر مجھ سے شاپر لیا۔

"جہاں آپ کھانا کھا رہے تھے اس لڑکی اور اس آدمی کے ساتھ یہ وہاں رہ گیا تھا۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔

"بڑی مہربانی جی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ یہ سوٹ کھو جاتا تو بڑا ہی دکھ ہوتا جی مجھے۔ پورے پانچ ہزار پونے دو سو کا سوٹ ہے۔ مگر آنکھوں میں کھب گیا تھا۔ اس لیے خرید ڈالا۔ اپنی رانی پر یہ رنگ کتنا جچے گا اس کے آگے اس سوٹ کی قیمت کچھ بھی نہیں۔ ارے میں بھی سالا پاگل ہوں۔ آپ کو کیا پتا' رانی کون ہے۔"

وہ اپنے سر پر ہاتھ مار کر ہنسا۔ میرے جی میں آئی کہ اسے خوب سناؤں 'کیسے ہنس ہنس کر اپنی محبوبہ کا ذکر کر رہا تھا۔

"رانی میری رانی بیٹی ہے میڈم جی۔۔۔ اپنے چاچے کے لڑکے سے اس کی شادی کروا رہا ہوں نا۔ وہاں لاہور میں ہوتا ہے وہ 'وہاں شوگر کی مل میں بڑی اچھی تنخواہ پر کام کرتا ہے جی۔ اچھا جی اجازت۔ میری بس آ گئی اور ایک بار پھر آپ کی مہربانی۔ پانچ ہزار کی چپت لگ جانی تھی نہیں تو۔" وہ اپنی ہی کسی کیفیت کے زیر اثر خوشی خوشی اور سرشاری سے بھرپور لہجے میں کہہ کر چلتا بنا۔

میں وہیں کھڑی تھی۔ اس سے کچھ اور کہہ ہی نہ سکی اور میرے پاس ویسے بھی کہنے کے لیے تھا ہی کیا۔ اس لیے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اپنی گاڑی کی تلاش میں پارکنگ ایریا کی جانب چل دی۔

☆

غدار

تم کو تو ہمارے مستقبل کا خواب بننا تھا
تاکہ تم وہ سب کچھ فراہم کر سکو
جو ہم پر حرام کر دیا گیا ہے
تم کو تو ہمارے زخموں پر مرہم رکھنا تھا
تاکہ تم شکستہ استخوانوں کو جوڑ سکو
لیکن
تم نے غداری کی
تم نے ہمارے دشمن کو اپنا چاہنے والا منتخب کیا
تم اس کے ہمراہ
ہمارے سامنے سے ایک گناہ کی طرح گزرتے رہے
تم اپنے آبا کے قاتلوں سے بغل گیر ہوئے
تم اپنے قبیلے کے لوگوں کو تختۂ دار تک لے گئے
تم نے اپنے باپ دادا کی روحوں کا مذاق اڑایا
تم نے ہمارے بھید کمینے اجنبیوں پر ظاہر کیے
تم نے ہمارے بزرگوں کے سروں کی تضحیک کی
اور ان کے سفید بالوں کا سودا ان کے بچوں کے سامنے کیا
وہ ہونٹ جو قدیم صداقتوں کے امین تھے
ان پر مہریں لگا دیں
اور پھر ان کی دشمنی ہوئی آنکھوں نے تمہیں بددعا دی
"تم سمندر کا لقمہ بنو"

احمد فراز

گھوم پھر کر اسی کوچے کی طرف آئیں گے
دل سے نکلے بھی اگر ہم تو کہاں جائیں گے

ہم کو معلوم تھا یہ وقت بھی آ جائے گا
ہاں مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ پچھتائیں گے

یہ بھی طے ہے کہ جو بوئیں گے وہ کاٹیں گے یہاں
اور یہ بھی کہ جو کھوئیں گے، وہیں پائیں گے

کبھی فرصت سے ملو تو تمہیں تفصیل کے ساتھ
امتیازِ ہوس و عشق بھی سمجھائیں گے

کہہ چکے ہم، ہمیں اتنا ہی فقط کہنا تھا
آپ فرمائیے، کچھ آپ بھی فرمائیں گے

ایک دن خود کو نظر آئیں گے ہم بھی اجمل
ایک دن اپنی ہی آواز سے ٹکرائیں گے

اجمل سراج

اتنی سی زندگی میں ریاضت نہ ہو سکی
اک غم کو بھول جانے کی عادت نہ ہو سکی

سوچو تو پور پور ہے تھکن سے چور چور
دیکھو تو طے ذرا سی مسافت نہ ہو سکی

کچھ دیر جلتا رہتا ہواؤں کے روبرو
گھر کے دیے سے اتنی مروت نہ ہو سکی

سب کچھ اسی کے دم سے تھا محمود اس کے بعد
کار جہان تازہ سے رغبت نہ ہو سکی

محمود غزنوی

تمام رات ستاروں سے دو بدو ہوا ہوں
کرن کرن کو سمیٹا ہے باوضو ہوا ہوں

اے رہگزار طلب اور کتنی دور چلوں
میں خواہشوں کے سفر میں لہو لہو ہوا ہوں

شب فراق مجھے گھونٹ گھونٹ کرکے نہ پی
تمہاری پیاس بجھانے کو آبجو ہوا ہوں

مرا لہو ہی چراغوں کو روشنی دے گا
مقام شکر ہے، مقتل کی آرزو ہوا ہوں

میں حرف حرف صحیفوں میں بٹ گیا امجد
سخن طراز ہوا ہوں، تو کو بہ کو ہوا ہوں

امجد بخاری

شگفتہ جاہ

رنگ رنگ پھول

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کھڑے ہو کر اللہ کی حمد و ثنا بیان کی پھر فرمایا۔
"اے لوگو! تم یہ آیت پڑھتے ہو۔"
ترجمہ: "اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو سیدھا رکھو جب تم ہدایت پر ہو تو گمراہ لوگ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکیں گے" اور ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔
• لوگ جب برائی کو دیکھیں اور اسے ختم نہ کریں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو عذاب کی لپیٹ میں لے لے۔"

حرف دانش،

- جب تم بری بات سنو اس کا جواب نہ دو کیونکہ اس کے پاس اور بھی ایسی باتیں ہیں جو وہ جواب میں تمہیں کہے گا۔ (حضرت علیؓ)
- ماضی کی یاد میں یا مستقبل کے خوابوں میں کھوئے رہنے سے کہیں بہتر ہے کہ اپنے حال کو تعمیر کرو۔ (بیکارڈ)
- کل وہی اچھی ماں بن سکتی ہے جو آج اچھی بیٹی ہے۔ (ہوبلس)

واقیہ بلوچ۔ گھوٹکی

مردانگی،

کسی شاعر نے اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔
"اس کے سر پر تاج سجا ہوتا ہے اور وہ اس کی سنہری جبیں پر چمک رہا ہوتا ہے۔"
تو خلیفہ نے شاعر کو ملامت کرتے ہوئے کہا۔
• "تم نے تو میری اس طرح تعریف کی ہے جیسے خوبصورت اور نرم و نازک لڑکیوں کی کی جاتی ہے۔ تم نے میری اس طرح تعریف کیوں نہ کی جس طرح کسی شاعر نے معصب بن زبیر کی تعریف کی تھی۔ اس نے کہا تھا۔
• معصب تو اللہ کے ستاروں میں سے ایک ستارا ہے جس کی روشنی سے اندھیرے چھٹ گئے ہیں۔ اس کا فیصلہ قوت کا فیصلہ ہے مگر اس میں کوئی تکبر اور جبروت نہیں ہے۔"
مردوں کے جانچنے کا معیار ان کا علم، ان کا ایمان اور ان کا حسن عمل ہوتا ہے نہ کہ ان کی ظاہری خوبصورتی۔

سکندر کون،

کھیل بہت سے لوگ کھیلتے ہیں۔ میدان میں بہت سے اترتے ہیں۔ سکندر وہی ہے جس کا مقدر اس کے ساتھ ہے۔ بہت سوں میں صرف تین لوگ جیتتے ہیں۔
1۔ محبت کرنے والے۔
2۔ ثابت قدم۔
3۔ خوش قسمت۔

مدیحہ شہزاد۔ لیہ

کسی نے کہا،

- بچے کتوں کی مانند بہت تیز قوت شامہ کے مالک ہوتے ہیں اور ہر چیز کا کھوج لگا لیتے ہیں۔ خصوصاً بری چیزوں پر ان کی نگاہ پہلے پڑتی ہے۔
- ہر شخص ایک ضخیم کتاب ہے بشرطیکہ آپ کو پڑھنا آتا ہو۔
- دل اگر سیاہ ہو تو چمکتی آنکھیں بھی کچھ نہیں کر سکتیں۔

وہ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرو تاکہ تدبیر سے تقدیر مسکرا اٹھے۔

شمیم شمشاد احمد۔ شکار پور

مسئلہ کس کو؟

ایک صاحب جنہوں نے نپولین بونا پارٹ کا لباس زیب تن کر رکھا تھا، ایک نفسیاتی معالج کے پاس تشریف لائے۔ نفسیاتی معالج نے پوچھا۔

"آپ کا مسئلہ کیا ہے؟"

"جناب! میرا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میرے پاس ایک عظیم الشان فوج ہے۔ دنیا کے مشہور عالم نوادرات میں نے جمع کر رکھے ہیں۔ اور برطانیہ اور روس میری وجہ سے مسائل میں مبتلا ہیں۔"

"بھئی جب آپ کا کوئی مسئلہ ہی نہیں تو آپ یہاں کیوں تشریف لائے ہیں؟" معالج نے پوچھا۔

"آپ سے اپنی بیگم کے بارے میں مشورہ کرنا ہے، مسئلہ ہے اسی کا، دراصل پتا نہیں کیوں وہ خود کو بیگم سلمان احمد سمجھتی ہے۔"

ندا، فضہ۔ کراچی

غصہ

ایک صاحب نوکری سے چھٹی لے کر وقت سے پہلے گھر پہنچے۔ خلاف توقع گھر کا دروازہ مقفل پایا۔ ان کی بیوی کسی کام سے باہر گئی ہوئی تھیں۔ وہ مجبوراً دروازے سے ٹیک لگا کر بیوی کا انتظار کرنے لگے۔

ایک پڑوسی نے ازراہ مروت پیش کش کی۔

"جب تک آپ کی اہلیہ نہیں آجاتیں، آپ ہمارے ڈرائنگ روم میں تشریف رکھیے۔"

ان صاحب نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"اس طرح میرا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ بہتر ہے مجھے یہیں رہنے دیں۔"

صائمہ سلیم۔ کراچی

سنہری باتیں

* حسد کرنے والے کے لیے یہی سزا کافی ہے کہ جب تم خوش ہوتے ہو تو وہ اداس ہو جاتا ہے۔
* بعض اوقات وہ کام جو ہمارا دشمن انجام نہیں دیتا، اس کو ہم خود اپنے ہاتھوں سے انجام دے کر پایۂ تکمیل تک پہنچا دیتے ہیں۔

سیدہ فرزانہ عرفان۔ حجرہ شاہ مقیم

محبت

محبت ایک تاریک جنگل کی طرح ہوتی ہے۔ ایک بار اس کے اندر چلے جاؤ، پھر باہر آنے نہیں دیتی۔ باہر آ بھی جاؤ تو آنکھیں تاریکی کی اتنی عادی ہو چکی ہوتی ہیں کہ روشنی میں بھی کچھ نہیں دیکھ سکتیں، وہ بھی نہیں جو بالکل صاف، واضح اور روشن ہوتا ہے۔

نوشین اقبال نوشی۔ گاؤں بدومرہان

ایک سگار

ایک بہت موٹے آدمی کو ایک بہت معروف ڈاکٹر نے جلدی جلدی مشورہ دیا۔

"نشاستہ، چکنائی اور مٹھائی بند اور سگار دن میں صرف ایک۔"

سات دن بعد وہ صاحب دوبارہ کلینک آئے تو حلیہ بگڑا ہوا تھا اور خاصے پریشان تھے۔ بے صبری سے بولے۔

"ڈاکٹر صاحب! میں آپ کی منع کی ہوئی چیزوں سے تو مکمل پرہیز کر رہا ہوں لیکن۔"

"لیکن کیا۔؟"

لیکن ایک سگار نے مار ڈالا ہے۔ آدھا بھی نہیں پی سکتا۔ کیا کروں کبھی پیا جو نہیں تھا۔"

عائشہ۔ گوجرہ

اچھی باتیں

- یادیں محبت کرنے والوں سے زیادہ وفادار ہوتی ہیں کیونکہ محبت کرنے والے تو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں پر یاد ہمیشہ ساتھ رہتی ہے۔
- محبت سب سے کرو، لیکن اس سے اور بھی زیادہ کرو جس کے دل میں تمہارے لیے تم سے بھی زیادہ محبت ہے۔
- جب آپ کو محسوس ہو کہ آپ کی طبیعت کو ذکرِ خدا سے محبت ہو گئی ہے تو سمجھ لو کہ اللہ آپ کو پسند کرنے لگا ہے۔
- جو تم کو خوشی میں یاد آئے تو سمجھو تم اس سے محبت کرتے ہو اور جو تم کو غم میں یاد آئے تو سمجھ لو وہ تم سے محبت کرتا ہے!

مشعل جمانی۔ ڈگری کالج ڈہرکی

زمانہ شناس

ایک صاحب نے مشہور زمانہ ریگستان تنہا پار کرنے کا فیصلہ کیا اور وہ اس مہم پر روانہ ہونے سے قبل سفر کا سامان خریدنے کے لیے ایک دکان پر پہنچے۔ انہوں نے نقشے خریدے، کھانے پینے کا ضروری سامان خریدا اور آخر میں دکان دار کو ایک شطرنج لانے کے لیے کہا۔ دکان دار ان کی مہم سے واقف تھا اس نے سخت متعجب ہو کر پوچھا۔

"ریگستان میں شطرنج کی ضرورت واہمیت واضح نہیں ہوتی؟"

"میں جب بھی ریگستان کا راستہ بھٹکوں گا تو کسی جگہ اکیلا ہی شطرنج کھیلنے بیٹھ جاؤں گا۔ اس دوران اچانک ہی کوئی احمق نمودار ہو جائے گا جو شطرنج کا بغور جائزہ لے کر مجھے مشورہ دے گا کہ فلاں مہرہ آگے بڑھاؤ گے تو مخالف کو مات ہو جائے گی۔" ان صاحب نے جواب دیا۔

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

محبت کرنے والی لڑکی

- جیسے تپتے صحراؤں میں گم کردہ راہ مسافر۔
- جیسے خالی رستوں پہ مدتوں سے اٹکی ہوئی نمناک نگاہ۔
- جیسے ویران ہو جانے والا جزیرہ۔
- جیسے وسیع و عریض فضاؤں میں دور دور تک تنہا بدلی۔
- جیسے اجنبی شہر میں اپنوں سے بچھڑ جانے والی بچی۔

آمنہ اجالا۔ ڈہرکی

ووٹ

الیکشن میں ایک امیدوار کو صرف تین ووٹ ملے اس کی بیوی نے نتیجہ سنا تو رونے لگی اور کہنے لگی۔

"میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ تم کسی اور سے بھی عشق کر رہے ہو۔ اب تو ثبوت بھی مل گیا ہے۔ میرے اور تمہارے ووٹوں کے علاوہ تیسرا ووٹ اسی کلموہی کا ہو سکتا ہے۔"

صبا اویس۔ باغ جھنگ

سنہری باتیں

- محنت اور ہنر مندی کے آگے کچھ بھی ناممکن نہیں۔ (سیموئیل جانسن)
- عادت کی اگر مزاحمت نہ کی جائے تو یہ جلد ہی ضرورت بن جاتی ہے۔ (آگسٹائن)
- اپنے آپ پر قابو حاصل کر لینا سب سے بڑی جیت ہے۔ (پلیٹو)
- تمام حیلے بے کار ہو جائیں تو پھر تلوار سے کام لینا جائز ہے (ہلاکو خان)
- جس سے مجھے نفرت ہے اس سے میں کبھی نہیں ملتا۔ (راجرز)
- عظیم خیالات پر جب عمل کیا جاتا ہے تو وہ عظیم کارنامے بن جاتے ہیں۔ (ولیم ہیزلٹ)
- قوانین غریبوں کو کچلتے ہیں لیکن امیر ان پر حکمرانی کرتے ہیں۔ (گولڈ اسمتھ)
- ماہر وہ شخص ہوتا ہے جو چھوٹی غلطیاں نہیں کرتا بلکہ بڑی غلطی کرتا ہے۔
- بیرو پرستی موجود ہے، موجود تھی اور دنیا میں ہمیشہ موجود رہے گی۔ (تھامس کارلائل)
- اگر آپ کسی بھی بے وقوف کی شکل نہیں دیکھنا چاہتے تو آپ کو پہلے اپنا آئینہ توڑ دینا چاہیے۔ (ریب لائیکس)

حیرا مسعود سیال۔ پیراں غائب

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

زرتاشیہ شیرازی ——— جڑانوالہ

اسی سے جان گیا میں کہ بخت ڈھلنے لگے
میں تھک کے چھاؤں میں بیٹھا تو پیڑ جلنے لگے
میں دے رہا تھا سہارے تو اک ہجوم میں تھا
جو گر پڑا تو سبھی راستہ بدلنے لگے

یاسمین کنول ——— پسرور

میری رات کا چراغ
میری نیند بھی ہے تو
غم ہے یا خوشی ہے تو
میری زندگی ہے تو!

نوشی ——— بدرم جان

یہ جو رفاقتوں کی خواہش میں دل منتظر ہے پڑا ہوا
اسے کیا خبر کہ جدائیوں کے عذاب کتنے شدید ہیں

شازیہ رانا ——— دیپال پور

اک شخص کو سوچتی رہی میں
پھر آئینہ دیکھنے لگی میں
تو میرے بنا نہ رہ سکا تو
کب تیرے بغیر جی سکی میں

عروج انجم ——— گاؤں ہیڈ فقیریاں

اپنے خلاف فیصلہ خود ہی کیا ہے آپ نے
ہاتھ بھی مل رہے ہیں آپ، آپ کتنے عجیب ہیں
دائرہ وار ہی تو ہیں عشق کے سلسلے تمام
راہ بدل رہے ہیں آپ، آپ کتنے عجیب ہیں

سحر خان ——— کوئٹہ

بڑی تبدیلیاں آتی ہیں اپنی ذات میں لیکن
تمہیں بس یاد کرنے کی وہ عادت ابھی بھی باقی ہے

اقراء ملک ——— بہاولپور

جانے کیسے جیتے ہیں لوگ یادوں کے سہارے محسن
میں تو کئی بار مرتا ہوں اک بار یاد آنے پہ

زرتاشیہ شیرازی ——— جڑانوالہ

کس منہ سے لڑ سکے گی سپاہ ستم شعار
دشمن کے ہاتھ اپنی ہر اک گھات بیچ کر
اس بادشاہ وقت سے کیسی توقعات
بیٹھا ہے تخت پر جو عنایات بیچ کر

اقراء ملک ——— بہاولپور

سانس تک بھی نہیں لیتے ہیں تجھے سوچتے وقت
ہم نے اس کام کو بھی کل پہ اٹھا رکھا ہے
روٹھ جاتے ہو تو کچھ اور بھی حسین لگتے ہو
ہم نے یہ سوچ کر ہی تم کو خفا رکھا ہے

ارم آفتاب ——— کراچی

یہ جو سرگشتہ سے پھرتے ہیں کتابوں والے
ان سے مت مل کہ انہیں روگ ہیں خوابوں والے
اب مہ و سال کی مہلت نہیں ملنے والی
آ چکے اب تو شب و روز عذابوں والے

فوزیہ سعد ——— کراچی

یہ فاصلہ جو پڑا ہے مرے گمان میں نہ تھا
کہ اب کی بار زمانہ بھی درمیاں میں نہ تھا

یاسمین ظفر ——— لاہور

کبھی یوں بھی تھا کہ ہزار تیر جگر میں تھے تو دکھی نہ تھے
مگر اب یہ ہے کسی مہرباں کے تپاک نے بھی رُلا دیا

رخسانہ ظفر ——— لاہور

وقت رکتا ہی نہیں، خواب ٹھہرتے ہی نہیں
پاؤں جمتے ہی نہیں بہتے ہوئے پانی پہ

شمع مسکان ——— جام پور

جب ملاقات بے ارادہ تھی
اس میں آسودگی زیادہ تھی
نہ توقع نہ انتظار نہ رنج
صبح ہجراں نہ شام وعدہ تھی

عائشہ رسول ——— سرجانی ٹاؤن

دوسروں پر اگر تبصرہ کیجیے
سامنے آئینہ رکھ لیا کیجیے
آپ سکھ سے ہیں ترک تعلق کے بعد
اتنی جلدی نہ یہ فیصلہ کیجیے

شگرف اعجاز ——— کراچی

عشق مجبور و نامراد سہی
پھر بھی ظالم کا بول بالا ہے
موت آئے تو دن پھریں شاید
زندگی نے تو مار ڈالا ہے

منائل لودھی ——— سرگودھا

ہوا کو بہت سرکشی کا نشہ ہے
مگر یہ نہ بھولے دیا بھی دیا ہے
گزرتا ہے ہر شخص چہرہ چھپائے
کوئی راہ میں آئینہ رکھ گیا ہے

مشعل فاطمہ ——— کراچی

اب اتنی رہ و رسم ہے زندگی سے
کہ جیسے ملے اجنبی اجنبی سے

ثمرہ رشید ——— کراچی

مسافرت میں بھی تصویر گھر کی دیکھتے ہیں
کوئی بھی خواب ہو، تعبیر گھر کی دیکھتے ہیں

عائشہ ——— ٹنڈو محمد خان

نہ تکلف نہ احتیاط نہ زعم
دوستی کی زبان سادہ تھی

دعا ہاشمی ——— فیصل آباد

سب کے ہونٹوں پہ تبسم تھا مرے قتل کے بعد
جانے کیا سوچ کے روتا رہا قاتل تنہا

حمیرا اصغر سیال ——— پیراں غائب

اک اداسی کرتی جائے گی سرایت روح میں
اس قدر وابستگی اچھی نہیں ہے شام سے

ماہا انعام ——— کراچی

وہ دن کی زندگی تھی صدیوں کا تھا سفر
ہم کیا بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے

امت العبود

خواتین کی ڈائری

صبا افضل بٹ کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ نظم آپ سب قارئین بہنوں کی نذر۔

یہ شیشوں کے سپنے، یہ دھاگوں کے رشتے
کسے ہے خبر کہاں ٹوٹ جائیں
محبت کے دریا میں تنکے وفا کے
کسے ہے خبر کہاں ڈوب جائیں
لگائے ہیں ہم نے بھی خوشیوں کے پودے
مگر کیا بھروسا یہاں بارشوں کا
یہ ممکن ہے پودے کہیں سوکھ جائیں
جنہیں دل سے چاہا، جنہیں دل سے پوجا
نظر آرہے ہیں وہی اجنبی سے
سنو! اپنا دل مرے کے مضبوط رہنا
کیا خبر لینے والے کہاں بھول جائیں۔

اقصیٰ مریم کی ڈائری سے

میری ڈائری ہمیشہ اداس سی غزلیں اپنے کورے صفحوں پر مجھ سے لکھواتی ہے۔ نفیس ترابی کی تحریر کردہ یہ غزل قراۃ العین بلوچ کی آواز میں آپ نے ضرور سنی ہوگی۔

وہ ہم سفر تھا، مگر اس سے ہم نوائی نہ تھی
کہ دھوپ، چھاؤں کا عالم رہا جدائی نہ تھی

عداوتیں تھیں، تغافل تھا، رنجشیں تھیں مگر
بچھڑنے والے میں سب کچھ تھا بے وفائی نہ تھی

بچھڑتے وقت ان آنکھوں میں تھی ہماری
غزل کبھی وہ جو کبھی کسی کو سنائی نہ تھی

کبھی یہ حال کہ دونوں میں یک دلی تھی بہت
کبھی یہ مرحلہ جیسے کہ آشنائی نہ تھی

محبتوں کا سفر اس طرح بھی گزرا تھا
شکستہ دل تھے مسافر شکستہ پائی نہ تھی

وہ ہم سفر تھا، مگر اس سے ہم نوائی نہ تھی
کہ دھوپ چھاؤں کا عالم رہا جدائی نہ تھی

نمرہ اقراء کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر حبیب جالب کی یہ غزل آپ سب بہنوں کے لیے۔

شعر ہوتا ہے اب مہینوں میں
زندگی ڈھل گئی مشینوں میں

پیار کی روشنی نہیں ملتی
ان مکانوں میں، ان مکینوں میں

دیکھ کر دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ
سانپ ہوتے ہیں آستینوں میں

قہر کی آنکھ سے نہ دیکھ ان کو
دل دھڑکتے ہیں آبگینوں میں

آسمانوں کی خیر ہو یارب
اک نیا عزم ہے زمینوں میں

وہ محبت نہیں رہی جالب
ہم صفیروں میں، ہم نشینوں میں

آپ کا باورچی خانہ

تاہید نور الٰہی

(1) کھانا بناتے ہوئے میں صحت 'پسند ناپسند اور غذائیت کا بے حد خیال رکھتی ہوں 'زیادہ تر بچوں کی پسند کا پکاتی ہوں۔ میاں صاحب تو کہتے ہیں 'جو پکا کر کھلا دو گی 'کھا لیں گے۔

(2) ویسے تو مہمان فون وغیرہ کر کے آتے ہیں تو میں زیادہ تر بریانی اور کڑاہی وغیرہ بنا لیتی ہوں یا پھر مٹن ہرا مسالا بنا لیتی ہوں جو کہ بہت زبردست بنتا ہے۔ اس کی ترکیب لکھتی ہوں۔

مٹن ہرا مسالا

اشیا :

گوشت	ایک کلو (مٹن 'بیف 'چکن کا)
ہری مرچ	15 سے 20 عدد
ہرا دھنیا	ایک گڈی
ادرک لہسن پیسٹ	2 ٹیبل اسپون
لال مرچ پاؤڈر	1 ٹی اسپون
ہلدی پاؤڈر	1 ٹی اسپون
پیاز	آدھا کلو
ٹماٹر	آدھا کلو
گرم مسالا	2 ٹیبل اسپون
نمک	حسب ذائقہ
گھی یا تیل	آدھا پاؤ

ترکیب :

گوشت کو اچھی طرح دھو کر دیگچی میں ڈالیں۔ اوپر سے پیاز کاٹ کر ڈالیں۔ ادرک لہسن پیسٹ شامل کر لیں۔ تیل یا گھی ڈالیں۔ ساتھ لال مرچ پاؤڈر اور ہلدی پاؤڈر ڈالیں اور نمک بھی ڈال دیں۔ ہری مرچ بھی شامل کر دیں۔ ٹماٹر کاٹ کر ڈالیں اور گوشت گلانے کے لیے پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا دیں۔ پہلے تیز آنچ پر ابالیں پھر ہلکی آنچ پر گل جانے تک پکائیں جب دیکھیں کہ گوشت گل گیا ہے اور پانی خشک ہو رہا ہے تو اچھی طرح بھون لیں اور جب تیل یا گھی اوپر آجائے تو چولہا بند کر کے گرم مسالا چھڑک دیں۔ اوپر سے ہرا دھنیا کاٹ کر گارنش کر لیں اور سلاد 'رائتہ

اور نان سے تناول فرمائیں۔

نوٹ: چکن کا گوشت جلد گل جاتا ہے 'اس لیے آپ پہلے دیگچی میں آئل ڈال کر ایک پیاز براؤن کر لیں اور مرغی کو اس میں فرائی کر کے نکال لیں۔ اس کے بعد دیگچی میں تمام مسالے ڈال کر گلا لیں۔ جب مسالا بھن جائے تو چکن ڈالیں اور ہلکی آنچ پر گلا لیں۔ اس کے بعد گرم مسالا اور ہرے دھنیے سے گارنش کر لیں۔

(3) کچن کی تفصیلی صفائی تو ہر ماہ ہوتی ہے۔ ویسے روزانہ صفائی ماسی کے سر پہ کھڑے ہو کر کرواتی ہوں۔

(4) عام طور پر ڈبل روٹی 'مکھن 'جیم کا ناشتا ہوتا ہے لیکن کبھی کبھار اتوار کو حلوہ پوری کی فرمائش کرتے ہیں۔ میرے چار بچے ہیں 'بڑا بیٹا منصور الٰہی کالج اسٹوڈنٹ ہے۔ باقی تین اسکول جاتے ہیں۔ مسرور 'شفق اور ثروت خاص طور پر حلوہ پوری کی فرمائش کرتے ہیں۔ امی کے یہاں بھی جاؤ تو چھوٹا بھائی راحیل اور بھتیجے انس 'سعد اور محب کی بھی یہی فرمائش ہوتی ہے کہ پھوپھو کے ہاتھ کی پوریاں کھانی ہیں اور جس وقت وہ کھا رہے ہوتے ہیں تو بڑے زبردست ریمارکس سننے کو ملتے ہیں کہ "پھوپھو مزا آگیا۔" بقول سعد اور انس کے "مدر" کی پوریاں بھی کیا پوریاں ہوں گی جو ہماری پھوپھو کے ہاتھ کی پوریاں ہیں۔"

(5) میاں صاحب کا موڈ بن جاتا ہے تو باہر کھانا کھا لیتے تھے لیکن اب کراچی کے حالات کی وجہ سے باہر نکلتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔

(6) موسم کو مدنظر رکھ کر پکوان ضرور تیار کرتی ہوں بارش کے موسم میں بچوں کی فرمائش ہوتی ہے پکوڑے 'فنگر چپس اور آلو بھرے پراٹھے ساتھ لہسن کی چٹنی 'کیچپ اور چائے یا کافی ہوتی ہے اور سردیوں کی شام میں چائے کے ساتھ ڈبل روٹی کے رول وغیرہ بنا لیتی ہوں جو کہ سب کو بہت پسند آتے ہیں۔ اسی کی ترکیب لکھتی ہوں۔

بریڈ رول

اشیا :

ڈبل روٹی	ایک عدد درمیانی
آلو	ایک کلو
(ابال کر میش کر کے ایک طرف رکھ دیں)	
انڈے	دو عدد
پسی لال مرچ پاؤڈر	حسب ذائقہ
نمک	حسب ذائقہ
ہری مرچ	4 سے 6 عدد
ہرا دھنیا	آدھی گڈی
پیاز درمیانی	3 عدد

ترکیب :

آلوؤں کو ابال کر میش کر لیں۔ ڈبل روٹی کو بھی موٹا موٹا چورا کر کے ملا لیں۔ لال مرچ پاؤڈر اور نمک بھی ملا لیں۔ ہری مرچ 'ہرا دھنیا اور پیاز باریک چوپ کر کے ملا لیں۔ انڈے پھینٹ کر ایک طرف رکھ لیں۔ اب آلو اور بریڈ کے آمیزے کو رول کی شکل دے کر انڈے میں ڈبو کر بریڈ کرمز لگائیں اور ان کو ڈیپ فرائی کر لیں۔ کیچپ اور شام کی چائے کے ساتھ بہت مزا دیں گے۔

نوٹ: چاہیں تو آپ چکن کا قیمہ یا بیف کا قیمہ بھی ملا سکتی ہیں۔

(7) کھانے اچھا بنانے کے لیے میں واقعی محنت کی قائل ہوں اور اس محنت کا یہ رزلٹ آتا ہے کہ میاں صاحب اور بچوں کے منہ سے تعریفی کلمات سننے کو ملتے ہیں۔

(8) کھانا پکاتے ہوئے میں درود شریف کا ورد بہت کرتی ہوں 'میری زبان پر ہر وقت درود پاک رہتا ہے کھانا پکاتے ہوئے چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے درود پاک کا ورد کریں۔ کھانا بھی ذائقہ دار بنے گا اور ثواب بھی ملے گا۔

✡

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

آم کا اچار

اجزا :

کیریاں	ڈھائی کلو
میتھی دانہ	1 چھٹانک
سرخ مرچ	1 چھٹانک
رائی	آدھی چھٹانک
پسی ہلدی	2 کھانے کے چمچے
سونف	آدھی چھٹانک
سونٹھ	آدھی چھٹانک
کلونجی	آدھی چھٹانک
نمک	حسب ذائقہ
سرسوں کا تیل	ڈیڑھ کلو

ترکیب :

کیریاں دھو کر خشک کر کے چار چار ٹکڑے کر لیں۔ میتھی دانے کے علاوہ تمام مسالے کوٹ لیں۔ زیادہ بہتر ہو گا کہ کوٹنے سے پہلے انہیں (پسی ہوئی اشیا کے علاوہ) اچھی طرح صاف کر کے پانی سے دھو لیں اور خشک کر لیں۔ اس طرح مسالے میں کرکری آنے کا اندیشہ نہیں رہے گا۔ کوٹے ہوئے مسالے میں تھوڑا سا تیل ملا کر آمیزہ سا بنا لیں۔ اس میں کیری کی پھانکیں ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں اور مرتبان میں ڈال دیں اوپر سے باقی تیل اور میتھی دانہ بھی ڈال دیں۔ یاد رہے تیل اتنا ہو کہ اچار ڈوب جائے تیل اگر کم لگے تو مقدار بڑھا سکتی ہیں۔ ململ کے کپڑے سے مرتبان کا منہ بند کر کے پندرہ دن تک دھوپ میں رکھیں۔ تیسرے چوتھے روز کپڑا ہٹا کر چیک کریں۔ کیریاں پک جائیں تو سمجھیں اچار تیار ہے۔

کیری کا مربہ

اجزا :

کیریاں	1 کلو
چینی	ڈیڑھ کلو
چونے کا پانی	1 پاؤ
دار چینی	4 بڑے ٹکڑے

ترکیب:

کیری کو چھیل کر آٹھ ٹکڑے کریں۔ چونے کے پانی میں تقریباً" آدھے گھنٹے تک بھگو کر رکھ دیں' پھر ٹکڑوں کو نکال کر کسی کپڑے پر رکھ دیں تاکہ چونے کا سارا پانی نکل جائے۔ ایک برتن میں چار گلاس پانی ڈال کر چینی ڈالیں اور شیرہ بنانے کے لیے چولہے پر چڑھا دیں۔

جب شیرہ بن جائے تو ٹکڑے ڈال دیں اور اس وقت تک پکائیں جب تک شیرہ گاڑھا نہ ہو جائے' اور کیری کے ٹکڑے بھی اچھی طرح گل جائیں۔ پکنے کے دوران دار چینی بھی ڈال دیں۔ ٹھنڈا ہو جائے تو مرتبان میں بھر کر رکھ لیں۔ احتیاط سے رکھنے پر ایک سال تک استعمال کیا جا سکتا ہے۔

عربی رائس

اجزا:

چکن	1 کلو
چاول	آدھا کلو
لہسن ادرک پیسٹ	2 کھانے کے چمچے
پیاز	2 عدد
لیموں کا رس	4 کھانے کے چمچے
پسی کالی مرچ	1 کھانے کا چمچہ
بادام	آدھی پیالی
کشمش	آدھی پیالی
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

چکن کی بڑی بوٹیاں بنا کر دھولیں اور چھلنی میں رکھ کر ان کا اضافی پانی خشک کرلیں۔ پھر لیموں کے رس میں نمک' پسی کالی مرچ اور لہسن ادرک کا پیسٹ ملا کر چکن پر لگائیں اور ایک گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ فرائنگ پان میں دو چمچے تیل گرم کر کے چکن کو سنہرا کرلیں۔

الگ پتیلی میں تیل گرم کر کے پیاز سنہری کریں۔ پھر اس میں چکن' بادام اور کشمش سمیت چاول ڈال کر بھونیں پھر چار پیالی پانی شامل کر کے درمیانی آنچ پر پکائیں۔ پانی خشک ہونے پر ہلکے ہاتھ سے چمچے کی مدد سے چاولوں کو اوپر نیچے کریں اور دم لگا دیں۔

مٹھیا کباب

اجزا:

قیمہ	آدھا کلو
پیاز	1 عدد
لہسن ادرک پیسٹ	1 کھانے کا چمچہ
ہری مرچ	4 عدد
ہرا دھنیا	تھوڑا سا
سرخ مرچ	1 چائے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	1 چائے کا چمچہ
انڈا	1 عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب:

ایک بڑے برتن میں قیمے میں لیموں کے رس اور انڈے سمیت تمام مسالے ڈال دیں۔ ہری مرچ اور ہرا دھنیا بھی باریک کاٹ کر ڈالیں اور اچھی طرح مکس کر کے ایک گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ (قیمہ چکن کا بھی بنوا سکتی ہیں)۔ اب قیمے کو ہاتھ سے سیخ کباب کی طرح لمبے کباب کا شیپ دیں۔ مٹھی میں دبائیں تاکہ انگلیوں کے نشان آجائیں۔ فرائنگ پان میں تیل گرم کر کے احتیاط سے تلیں۔ سنہری ہو جائیں تو اتار لیں۔ سلاد اور چٹنی یا رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

باتیں تقی احمد سے

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"تقی احمد۔"

2 "پیار کا نام؟"
"تقی ہی کہتے ہیں۔"

3 "تاریخ پیدائش/ شہر؟"
"3 جون 1985ء/ کراچی۔"

4 "اسٹار/ قد؟"
"جیمنائی/ 5 فٹ اور 10 انچ۔"

5 "تعلیمی قابلیت؟"
"گریجویٹ ہوں اور ناپا سے بھی اداکاری کا کورس کیا ہوا ہے۔"

6 "بہن بھائی/ آپ کا نمبر؟"
"بہن نہیں ہے۔ ایک چھوٹا بھائی ہے۔"

7 "شوبز میں آمد؟"
"اپنی محنت سے آیا۔ اجمل مراد صاحب نے ماڈلنگ میں متعارف کرایا اور ڈراموں میں فاروق پریو نے متعارف کرایا۔"

8 "وجہ شہرت؟"
"زونگ کے کمرشل سے مجھے شہرت ملی۔"

9 "شادی...؟"

"ان شاء اللہ دو سال تک۔"

10 "پہلی کمائی کیا تھی اور کیا کیا تھا؟"
"کمرشل کی پہلی کمائی تھی جو کہ چالیس ہزار تھی اور سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ اسے رکھوں کہاں۔"

11 "اپنے چہرے کے خدوخال میں کیا پسند ہے؟"
"پہلے تو کچھ بھی پسند نہیں تھا لیکن ــــ اب بھی کوئی خاص چیز نہیں ہے کہ جسے پسند کیا جائے۔"

12 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"اپنے بستر پہ۔"

13 "شدید بھوک میں آپ کا رد عمل؟"
"غصہ آنے لگتا ہے' بھوک برداشت نہیں ہوتی۔ گاڑی میں بھی کھانے کی کوئی نہ کوئی چیز ضرور رکھتا ہوں۔"

14 "اپنے مسائل کس سے شیئر کرتے ہیں؟"
"کسی سے بھی نہیں۔"

15 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"
"مجھے کوئی اٹھاتا نہیں ہے' جب تک کسی کو کوئی کام نہ ہو۔"

16 "پہلی ملاقات میں شخصیت میں کیا دیکھتے ہیں؟"
"اس کا رویہ' رکھ رکھاؤ۔ کسی میں اپنی ٹیوڈ ہو تو میں خود پیچھے ہٹ جاتا ہوں۔"

17 "کیا آپ اپنی مرضی کی زندگی گزار رہے ہیں؟"
"بالکل میں اپنی مرضی کی ہی زندگی گزار رہا ہوں۔"

18 "اپنے آپ کو کب بے بس محسوس کرتے ہیں؟"
"جب آپ نے سب کچھ پلان کیا ہوا ہو اور سب کچھ پلان کے مطابق چل بھی رہا ہو اور پھر ایک دم ایسا وقت آئے کہ سب کچھ بدل جائے تو بس۔"

19 "زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے؟"
"اپنے چاہنے والوں کے لیے وقت نکالنا بہت مشکل ہے۔"

20 "کس پہ بھروسا ہے کہ برے وقت میں جان بھی دے دے گا؟"
"بہت سے لوگ ہیں اور خاص طور پر فیملی ممبرز۔ پر اللہ نہ کرے کہ برا وقت آئے۔"

21 "غلطی کر کے نادم ہوئے؟"
"غلطیاں ہیں' مگر شیئر نہیں کروں گا۔"

22 "جب نیا پین استعمال کرتے ہیں تو کیا لکھتے ہیں؟"
"اپنا نام ــــ اپنا سائن۔"

23 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"
"اسکول کے زمانے میں ایسی حرکتیں ہوتی تھیں' مگر اب نہیں۔"

24 "اپنی زندگی میں چینج کب محسوس ہوا؟"
"ٹین ایج میں' سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔"

25 "کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟"
"امی کے ہاتھ کا۔"

26 "پسندیدہ ناشتا اور کھانا؟"
"مچھلی' انڈا' توس / اور امی کے ہاتھ کی بریانی۔"

27 "ایک خواہش؟"
"کہ میں انڈین یا پاکستانی فلم میں کام کروں۔"

28 "موڈ کب خراب ہوتا ہے؟"
"جب چیزیں آپ کے ہاتھ سے نکل جاتی ہیں اور آپ کچھ کر نہیں پاتے۔"

29 "پسندیدہ چینل؟"
"کوئی خاص نہیں۔ جس چینل پہ کچھ اچھا آرہا ہو' وہی پسندیدہ ہو جاتا ہے۔"

30 "ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟"
"پورا ملک ہی تبدیل ہو جانا چاہیے۔ کسی ایک تبدیلی سے کام نہیں چلے گا۔"

31 "کیا آپ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟"
"بہت مشکل ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ کر ہی لوں۔"

32 "کبھی مانگ کر تحفہ لیا؟"
"نہیں' مانگنے کی عادت نہیں ہے۔"

33 "کیا محبت ایک بار ہوتی ہے؟"
"بالکل بھی نہیں' بار بار ہوتی ہے۔ یہ تو نہ ختم ہونے والا

سلسلہ ہے۔"

34 "اپنی کس عادت پر قابو نہیں ہے؟"
"غصے کی عادت پر' گمری جانے کی بھی عادت ہے۔"

35 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتے ہیں؟"
"میں اب پیسے نہیں دیتا بلکہ جب بچے بھیک مانگنے آتے ہیں تو میں ان کو پیسوں کے بجائے چاکلیٹ دے دیتا ہوں۔"

36 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"میں نصیحت کے بہت خلاف ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ صرف باتیں نہیں ہونی چاہئیں ۔ کچھ کر کے دکھانا چاہیے۔"

37 "زندگی میں کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟"
"کسی چیز کی نہیں' کیونکہ والد صاحب نے ہر خواہش پوری کی ہے۔"

38 "زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ؟"
"جب میں نے یہ سوچا کہ مجھے کرنا کیا ہے اور پھر ہمت باندھ لی۔"

39 "کب چیخنے چلانے کو دل چاہتا ہے؟"
"اس وقت جب میری مرضی کے مطابق کام نہ ہو رہا ہو لیکن میں چیختا نہیں ہوں۔"

40 "سارا دن میں آپ کا پسندیدہ وقت؟"
"جب کام میں مصروف ہوتا ہوں۔"

41 "کوئی لڑکی اگر مسلسل گھورے تو؟"
"اب تو خیر ایسا بہت ہونے لگا ہے' مگر اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

42 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"
"کسی دوسرے کو تکلیف میں دیکھ کر۔"

43 "شہرت ــــ آپ کے تاثرات؟"
"اب چارم ختم ہو گیا ہے۔"

44 "چھٹی کا دن کیسے گزارتے ہیں؟"
"زیادہ تر سو کے یا انٹرنیٹ پہ بیٹھ کر۔"

45 "آپ وقت کی پابندی کا کتنا خیال رکھتے ہیں؟"
"میں تو بہت رکھتا ہوں مگر اس فیلڈ میں وقت کی پابندی کا کوئی خیال نہیں رکھتا۔"

46 "تہوار جوش و شوق سے مناتے ہیں؟"
"ہمارے یہاں لوگ بہت سے تہواروں پہ خوش ہو رہے ہوتے ہیں' جبکہ خوش ہونے کا حق نہیں بنتا کیونکہ ملک کے حالات بہت خراب ہیں۔"

47 "جھوٹ کب بولتے ہیں؟"
"صرف اپنوں سے بولتا ہوں اور اس وقت بولتا ہوں جب میرا دل چاہ رہا ہوتا ہے کہ بات اب ختم ہو جائے۔"

48 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"
"یہ ٹیکنالوجی اگر نہ ہی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ پہلے بہت سادگی تھی۔"

49 "کن تقریبات میں جانا پسند نہیں؟"
"جہاں زیادہ لوگ ہوں' میں وہاں نہیں جاتا۔ مارننگ شو میں جانا بھی پسند نہیں۔"

50 "موت سے ڈر لگتا ہے؟"
"نہیں' بالکل بھی نہیں۔"

51 "گھر آکر پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟"
"کہ کھانا کھاؤں اور فیس بک چیک کروں۔"

52 "کبھی چھٹی حس ایکٹو ہوئی؟"
"ہاں اکثر۔ مگر مثال نہیں دے سکتا۔"

53 "قسمت پہ کتنا یقین ہے؟"
"بہت زیادہ' سو فیصد۔ جو کچھ آپ کر رہے ہوتے ہیں' وہ قسمت کا ہی لکھا ہوتا ہے۔"

54 "آپ کی شخصیت میں کیا چیز نہ ہو تو آپ پرفیکٹ ہیں؟"
"غصہ۔ غصہ بہت تیز ہے میرا۔"

55 "بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے لڑکے یا لڑکیاں؟"
"آج کل کے زمانے میں تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔"

56 "کس قسم کے رویے دکھ کا باعث بنتے ہیں؟"
"اصل میں اب میں نے لوگوں سے توقعات رکھنا چھوڑ دی ہیں۔ اس لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔"

57 "بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟"
"موبائل پہ گیم کھیلتا ہوں۔"

محسوس کرتے ہیں؟"

"صبح کے وقت۔"

71 "آدھی رات کو آنکھ کھل جائے تو؟"

"سوتا ہی آدھی رات کو ہوں تو آنکھ کیا کھلے گی۔"

72 "پاکستان میں کس چیز کی آزادی ہونی چاہیے؟"

"کس چیز کی آزادی نہیں ہے؟ جتنی آزادی پاکستان میں ہے کسی ملک میں نہیں ہوگی۔"

73 "کس ملک کے لیے کہتے ہیں کہ کاش ہمارا ہوتا؟"

"میرا خیال ہے اس سوال کو رہنے ہی دیں۔"

74 "اچانک چوٹ لگنے پر کیا بولتے ہیں؟"

قہقہہ "کچھ آواز ہی نکلے گی۔"

75 "بستر پر لیٹتے ہی سو جاتے ہیں یا کروٹیں بدلتے ہیں؟"

"اگر تھکاوٹ ہو تو فورا" سو جاتا ہوں ورنہ پھر مشکل سے نیند آتی ہے۔"

76 "انسان کا بہترین روپ مرد/عورت؟"

"مرد میں اور باقی عورت۔"

77 "کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ ڈائننگ ٹیبل یا چٹائی؟"

"چٹائی پہ بیٹھنا مشکل ہو جاتا ہے ڈائننگ ٹیبل ٹھیک ہے۔"

78 "آپ کا ذریعہ معاش؟"

"فی الحال تو شوبز۔"

79 "کون سے الفاظ بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں؟"

"یہ تو دوسرے ہی بتا سکتے ہیں۔"

80 "خواتین کب بری لگتی ہیں؟"

"خواتین کیوں بری لگیں گی..... کیا بگاڑا ہے ہمارا۔"

81 "پیسہ کس شکل میں جمع کرتے ہیں؟"

"بینک میں۔"

"اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں پتا کہ کیا ہوگا۔"

☆

خبریں وسکریں

تبصین نشاط

قیمے آلے پوڑے

"نہ قیمے آلے پوڑے
دوست میرے سارے ویلے نکمے
نہ کھاندے آپ نہ مینوں کھواندے
نہ پروٹھے نہ قیمے آلے پوڑے"

ارے نہیں! ہمیں نہ تو بھوک لگی ہے اور نہ ہی ہمیں شاعری پر کوئی غصہ ہے کہ ہم اس کی ٹانگیں توڑ رہے ہیں۔ یہ تو اس گانے کے بول ہیں جو معروف گلوکار سجاد علی نے حال ہی میں گایا ہے۔ اپنے اس گانے کے بارے میں سجاد علی کا کہنا ہے کہ

"یہ گانا بغیر کسی منصوبہ بندی کے بس اتفاق سے ہی بن گیا۔" (جی ہاں لگ رہا ہے)

یہ گانا کچھ اس طرح بنا کہ ایک دن سجاد علی اپنی بیٹی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ گٹار کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اچانک اس نے سجاد علی سے کچھ گانے کی فرمائش کی۔ اس پر سجاد علی کے منہ سے فورا "نکلا۔

"قیمے آلے پوڑے۔"

کیونکہ "قیمے آلے پوڑے" ان کی بیٹی کی پسندیدہ ڈش ہے۔ (تو اس کی سزا ہمیں کیوں؟) بس پھر انہوں نے اس پر پورا گانا بنا لیا۔ اس گانے پر ہونے والی تنقید کے دفاع میں سجاد علی کا کہنا ہے کہ ایک فنکار جو بھی کام کرے "اس میں کوئی پیغام لازمی ہونا چاہیے" اس لیے اس گانے کے آخر میں انہوں نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو روزانہ بھوک سے مر رہے ہیں۔ (صحیح بات ہے' انسان کر نہ دے تو گز جیسی بات ہی کرلے۔ ہم سوکھی روٹی سے محروم ان لوگوں کو "قیمے آلے پوڑے" کا نام تو سنوا ہی سکتے ہیں ناں..... ویسے سجاد جی! یہ گانا بیٹی کی پسندیدہ ڈش کے نام پر بنا ہے یا ان لوگوں کی بھوک پر؟ بات کچھ پلے پڑی نہیں جی۔)

سفارش

ایک مدت سے سنتے آئے ہیں کہ ایک کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور اگر وہ عورت خود بھی ایک "کامیاب" شخصیت ہو تو پھر کیا ہی کہنے۔ اسی لیے تو آج کل اپنے شعیب ملک کے لیے راوی

چین ہی چین لکھ رہا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ محنت کریں یا نہ کریں، ٹیم میں جگہ تو مل ہی جائے گی کہ ان کی نصف بہتر کی کارکردگی اور شہرت نصف نہیں، بلکہ پوری ہے۔

سننے میں آیا ہے کہ مسلسل خراب کارکردگی کے باوجود ٹیم میں شعیب کے مستقل براجمان رہنے کی وجہ ایک وفاقی وزیر کی وہ خصوصی ہدایات ہیں جو انہوں نے ثانیہ مرزا کی پرزور سفارش پر پاکستان کرکٹ بورڈ کو جاری کی تھیں۔ ثانیہ مرزا نے مذکورہ وزیر کو فون کر کے اپنے میاں جی کی سفارش کی تھی۔ وہ وزیر ان کی بات نہ ٹال سکے اور یوں شعیب ٹیم کا حصہ بن گئے۔ شعیب کی قسمت بھی اچھی ہے کہ پاکستان ایشیا کپ جیت گیا اور "واہ واہ" کے شور میں شعیب کی خراب کارکردگی "منوں نعروں تلے" دب گئی۔ (لیکن شعیب جی! آپ کب تک بھابھی جی کے کندھوں پر چڑھ کر "ٹک ٹک" کرتے رہیں گے؟ ان متعلقہ وزیر کو بھی ہمارا مشورہ ہے کہ بہو کا خیال رکھنا اور اس کی فرمائشیں پوری کرنا اچھی بات سہی، مگر جناب! یہ بھی دھیان میں رکھیے گا کہ آج کل کی اکثر بہوویں سسرال کا بھلا کم ہی چاہتی ہیں اور پھر ثانیہ نے تو اپنی وفاداریاں بھارت کے ساتھ ابھی تک استوار بھی رکھی ہوئی ہیں۔)

فیس بک

معروف ہدایت کار شہزاد رفیق اب تک فلمی صنعت کو کئی شاہکار فلموں کا تحفہ دے چکے ہیں۔ ہم ان کے بارے میں خبر دے نہیں رہے، بلکہ خبر لے رہے ہیں ان کی..... کیوں بھلا؟..... وہ اس لیے کہ شہزاد رفیق ایک نئی فلم بنا رہے ہیں، جس کا نام ہے "عشق خدا"..... نہ جی! اس میں کوئی ایسی بات نہیں۔ چلیں! زیادہ تجسس نہیں۔ اب اصل بات آپ کو بتا ہی دیں کہ شہزاد رفیق نے اپنی اس فلم میں "وائم دہابی" کو شان اور احسن خان کے مقابل ہیروئین کاسٹ کیا ہے۔ وائم دہابی کا تعلق مراکش سے ہے اور توجہ طلب بات یہ ہے کہ شہزاد رفیق نے انہیں "فیس بک" پر تلاش کیا ہے۔ اب شہزاد صاحب سے کوئی پوچھے کہ پانی، بجلی، گیس کی قلت کے بعد اپنے ملک میں کیا اب فنکاراؤں کا بھی کال پڑ گیا ہے کہ فیس بک کی مدد سے ایسی بدیسی فنکارائیں در آمد کی جا رہی ہیں کہ جنہیں دنیا والے تو ایک طرف، خود ان کے اپنے ملک میں بھی کوئی نہیں جانتا۔ وائم دہابی اردو زبان نہیں جانتیں، مگر پھر بھی ہمیں یقین ہے کہ وہ آج کل اٹھتے بیٹھتے کہہ رہی ہوں گی.....

"فیس بک زندہ باد"

ورزش

طبیعت میں چڑچڑاپن اور ضد معمولات کی خرابی کی وجہ سے پہنچتی ہے۔ اگر روزمرہ کے معمولات میں صحت مند مشاغل شامل ہوں تو آپ کی سوچ مثبت رہتی ہے۔ ماہرین نے حالیہ تحقیق سے یہ بات ثابت کی ہے کہ اگر معمولات میں روزانہ تھوڑی دیر کی ورزش شامل کی جائے تو طبیعت کا چڑچڑاپن اور ہٹ دھرمی میں کمی واقع ہونے لگتی ہے، جو رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے۔ خصوصاً بچوں کو کم عمری سے اس کا عادی بنائیں تو وہ جلد ہی اسے اپنا معمول بنا لیتے ہیں۔ اس لیے اگر آپ اپنے بچوں کو صحت مند دیکھنا چاہتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے دن کا کوئی بھی وقت ورزش کے لیے مخصوص کریں، تاکہ آپ کی فیملی کی صحت بحال رہ سکے۔

یہ بیان کالمانہ

☆ روحیفہ بی بی کے بیٹوں کا جرم یہ تھا کہ لال مسجد کے آپریشن کے دوران ان کے تین بیٹوں عبدالصبور، عبدالماجد اور عبدالباسط کے اشاعتی ادارے کے قرآن پاک کے نسخے بڑی تعداد میں ملے۔

(افشاں نوید۔ تحریر اسکوائر)

☆ دو عشروں کے دوران مذہبی، نسلی اور لسانی بنیاد پر تشدد اس قدر بڑھا ہے کہ اس پہلو کو پاکستانیت کے خواص میں شامل کر لیا گیا ہے۔

(عائشہ صدیقہ)

☆ پچھلے چار برسوں میں پاکستان پیپلز پارٹی کی کارکردگی مایوس کن رہی چنانچہ پارٹی کو عوام کی توجہ مایوسی سے ہٹانے کے لیے ایک نیا شہید چاہیے۔

(جاوید چودھری۔ زیرو پوائنٹ)

☆ ہماری حکومت نے تو راجوں، مہاراجوں کے اعمال کے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ دنیا میں کرپشن کی سب سے بڑی یونیورسٹی پاکستان میں ہے۔

(عبدالقادر حسن۔ غیر سیاسی باتیں)

☆ لیاری میں روشنی بانٹنے والے انور بلوچ جیسے محترم استاد کا ملک چھوڑ دینا حکومت کے منہ پر طمانچہ ہے جنہوں نے صرف حکومت کو طول دینے کے لیے کراچی کو دہشت گردوں کے حوالے کر دیا ہے جو دن رات یہاں خون کی ہولی کھیلتے ہیں۔

(طارق حبیب)

عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

انسانی شخصیت کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ایک ناقابل بیان اور ناقابل تشریح چیز ہے اور کچھ باتیں بعض لوگوں میں ہوتی ہیں اور بعض اس سے محروم ہوتے ہیں۔
ماہرین نفسیات نے یہ انکشاف کیا ہے کہ شخصیت کی نشوونما تربیت کے ذریعے کی جاسکتی ہے۔ شخصیت کا انحصار سیکھنے پر ہے۔
شخصیت سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کے ساتھ بھلائی یا خدمت کرنے کی پوزیشن میں ہو تو وہ بھلائی کا کام کرے' دوسروں کی خدمت کرے اور دوسروں کے کام آئے۔ اس طور زندگی گزارنے سے خوشیوں' شادمانیوں اور مسرتوں کی دولت حاصل ہوتی ہے اور قلبی سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

ایمرسن کہتا ہے۔
"مسرت اور شادمانی ایک عطر ہے اور اس کی خوشبو تم دوسروں تک اسی وقت پہنچا سکتے ہو' جب چند قطرے اپنے اوپر ڈال لو۔"
لیکن اصل خوشی' مسرت اور شادمانی اس وقت حاصل ہوتی ہے' جب دوسروں کو مسرت و شادمانی پہنچانے کے لیے کسی صلے اور لالچ کے بغیر کام کیا جائے۔
ایک خاتون میں پژمردگی اور افسردگی کے آثار تھے' اس کا خیال تھا کہ اب وہ بوڑھی ہو چلی ہے اور چہرے پر جھریاں پڑنے والی ہیں۔ دراصل اس کے پاس اب کچھ کرنے کو نہیں تھا۔ اس کی دلچسپیاں بھی کم تھیں اور اس نے اپنے اردگرد کے لوگوں کے بارے میں کبھی بھی نہ سوچا تھا۔
پھر کسی کے مشورے پر وہ چند گھرانوں کی مدد کرنے لگی۔ بعض کی روپے پیسے کی مدد کے علاوہ ان کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے لگی۔ ان کی مشکلات میں ان کا ساتھ دینے لگی اور چند ہی مہینوں میں وہ اتنی مصروف ہو گئی۔ اس کے جسم میں اتنی توانائی آگئی کہ وہ بڑھاپے کے خیال سے باہر نکل گئی اور جوانوں کی طرح کام کرنے لگی اور خدمت اور کام میں ہر وقت مصروف رہنے لگی۔ اسے اس بات کی فرصت ہی نہ تھی کہ کوئی بوڑھا خیال اس کے قریب آئے یا کوئی منفی سوچ اس کے پاس سے گزرے۔

خ۔احمد

میرا مسئلہ پتا نہیں نفسیاتی ہے یا نہیں لیکن میں اس مسئلے کو لے کر بہت پریشان ہوں۔ بس اسٹاپ' گلیوں' بازاروں اور سواریوں میں خواتین کو dis respect کیا جاتا ہے میرے خیال میں دنیا کی کوئی عورت اس سے محفوظ نہ ہوگی۔ مجھے جب کوئی باہر چلنے کو کہتا ہے تو میں خوف زدہ ہو جاتی ہوں کہ کچھ ہو نہ جائے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں ہمیشہ گھر میں رہوں میں گھر سے نکلتے وقت بہت سی دعائیں پڑھ کر نکلتی ہوں اور جب تک گھر واپس نہ آجاؤں دل زور زور سے دھڑکتا رہتا ہے سانس پھول جاتا ہے۔ میں شرعی پردہ کرتی ہوں اپنے ہاتھوں اور پیروں کو بھی چھپا کر نکلتی ہوں مگر پھر بھی ایسی کوئی بات ہو ہی جاتی ہے۔ جو ہمیشہ ہفتہ بھر ذہن سے نکلتی نہیں۔
میری عمر 21 سال ہے اور میری شادی ابھی نہیں ہوئی پڑھنے کا سلسلہ ابھی جاری ہے اسلامیات میں ایم اے کر رہی ہوں۔ ایف اے تک کالج گئی پھر اس کے بعد پرائیویٹ تعلیم جاری ہے۔ یعنی گھر سے نکلنے کا امکان کم ہی ہوتا ہے۔ ایک اور بات میں سوچتی ہوں کہ جس طرح کہانیوں اور ڈراموں میں اکثر شوہر حضرات اپنی بیویوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا انہوں نے کبھی کسی سے شادی سے پہلے محبت کی تھی؟! اسی طرح میں یہ سوچتی ہوں کہ اگر میرے شوہر نے مجھ سے یہ پوچھا کہ باہر کبھی تمہارے ساتھ ایسا کچھ ہوا تو میں اسے کیا جواب دوں گی؟
مجھے کوئی نامحرم چھوتا ہے تو مجھے گناہ کا احساس ہونے لگتا ہے کہ میرے اندر کوئی عیب ہے جو اس کی اتنی ہمت ہوئی۔ عدنان بھائی میری پریشانی دور کیجیے۔ میرے ذہن سے باہر نکلنے کا خوف نکال دیں۔
ج : عزیز بہن! یہ خوف ذہن سے نکالنے کے لیے آپ کو خود کوشش کرنا ہوگی۔ آپ شرعی پردہ کرتی ہیں۔ خود کو چھپا کر رکھتی ہیں۔ بلاوجہ بازاروں میں گھومنے کا بھی شوق نہیں۔ اشد ضرورت کے تحت ہی بازار جاتی ہیں تو ایسی صورت میں اگر کسی نامحرم کی نظر آپ پر پڑ جاتی ہے تو اس کے لیے آپ ذمہ دار نہیں۔ جس فعل میں آپ کی نیت' ارادہ شامل ہی نہ ہو' جس سے آپ نے ہر ممکن بچنے کی کوشش کی ہو۔ اس کے لیے آپ ذمہ دار کیسے ہو سکتی ہیں۔
اللہ تعالیٰ عادل و منصف بھی ہے' وہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔
اس کی رحمت بہت وسیع ہے۔ وہ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے' وہ گناہ گاروں پر بھی رحم کرتا ہے۔ اس کی رحمت پر بھروسا رکھیں۔
جہاں تک شادی کے بعد شوہر کے سوالوں کی بات ہے تو کوئی بھی معقول مرد اس طرح کی باتوں پر توجہ نہیں دے گا اور یہ تو کوئی بتانے والی بات ہی نہیں ہے۔ اسے بتا کر بلاوجہ خلجان میں ڈالنا ہے۔ اس بات کو غیر ضروری اہمیت نہ دیں۔ آپ کی نیت اور عمل صاف ہے دوسروں کی حرکات کے لیے نہ آپ جواب دہ ہیں نہ گناہ گار۔

نوشین

ج : نوشین بہن نے اپنی لمبی چوڑی کیفیت لکھی ہے۔ نوشین بہن کی خدمت میں عرض ہے کہ اس قسم کی کیفیت کچھ لوگوں کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ بار بار ہاتھ دھونا' بستر کی چادریں بدلنا' گھر میں بار بار جھاڑو دینا' دھلے ہوئے برتنوں کو بار بار دھونا اور اسی قسم کی دوسری کیفیات ہوتی ہیں۔
دراصل ایسے لوگوں کے لاشعور میں کچھ باتیں ہوتی ہیں' جو انہیں بے کل اور بے چین رکھتی ہیں۔ اگر وہ بات یا باتیں انسان کے شعور میں آجائیں تو یہ کیفیت جاتی رہے گی اور انسان نارمل ہو جائے گا۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ دانستہ یا نادانستگی میں بعض اوقات کوئی ایسی حرکت یا بات ہو جاتی ہے جو انسان کے دل اور ضمیر پر بوجھ بن جاتی ہے۔ ماہر نفسیات تحلیل نفسی کے ذریعے کھوج وہ بات لاشعور سے شعور میں لے آئے تو یہ کیفیت جاتی رہتی ہے۔ چونکہ ہر شخص کے لیے ماہر نفسیات کے پاس جانا ممکن نہیں ہوتا۔ ایسے میں میرا مشورہ یہ ہے کہ تنہائی میں بیٹھ کر ایک کاپی اور قلم اپنے سامنے رکھیں اور اپنی پچھلی زندگی یعنی عہد گزشتہ کے اوراق رکھیں اور ایک ایک سال کا جائزہ لیں کہ آپ سے کوئی ایسی بات' کوئی ایسی حرکت سرزد ہوئی جس کا آپ کے دل اور ضمیر پر بوجھ ہو' لکھتی چلی جائیں۔
اس وقت سے آج تک جب سے یہ وہم کا عارضہ لاحق ہوا ہے' جائزہ لیتی چلی جائیں۔ شاید کوئی بات یاد آجائے۔ شاید کسی نتیجے پر پہنچ جائیں۔ وہ نتیجہ سامنے آئے تو۔ لکھ بھیجیں۔ ان دس' پندرہ' بیس سالوں کے حالات' واقعات اور اپنے جائزے۔ شاید کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔

امت الصبور

بیوٹی بکس

سیما طاہر۔۔۔۔۔ راولپنڈی

س: میرے بالوں میں خشکی ہے کافی علاج کیا ہے۔ اینٹی ڈینڈرف شیمپو بھی استعمال کیا لیکن بجائے فائدے کے خشکی بڑھتی جارہی ہے کوئی مشورہ دیں۔

ج: کھوپڑی میں دوران خون کی کمی سے خشکی کا مرض پیدا ہو جاتا ہے' اس کے لیے ضروری ہے کہ باقاعدگی سے سر میں مساج کیا جائے۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ بالوں کی صفائی کا خاص خیال رکھا جائے۔ عموماً کنوئیں کے کھارے پانی سے سر دھونے سے بال اچھی طرح صاف نہیں ہوتے' اس لیے کوشش کی جائے کہ بال میٹھے پانی سے دھوئے جائیں۔ بالوں میں خشکی ہونے کے بعد فوری طور پر اینٹی ڈینڈرف شیمپو استعمال نہ کریں۔ کیونکہ وہ بہت تیز ہوتا ہے اور اس سے بالوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ درج ذیل مشوروں پر عمل کریں۔ نیم کے پتوں کا عرق نکال لیں اور اس میں برابر مقدار میں لیموں کا عرق ملا لیں اور اس سے سر پر مساج کریں۔ اس سے سر میں خون کی گردش تیز ہو جائے گی اور غدودوں کی کارکردگی میں اضافہ ہوگا۔ اس کے علاوہ نیم بہت اچھا جراثیم کش بھی ہے۔

(2) آدھا گھنٹہ ناریل کے تیل سے مساج کریں پھر تولیہ کو گرم پانی میں بھگو کر نچوڑ لیں اور اس گرم تولیہ کو سر پر لپیٹ لیں۔ دوسرے دن سر دھوئیں۔ ہفتہ میں دو بار ایسا کرنا کافی رہے گا۔

(3) سرسوں کے تیل میں دو چمچے دہی ملا کر جڑوں میں لگائیں۔ ایک گھنٹے بعد شیمپو کر لیں۔ خشکی غائب ہو جائے گی۔ یہ عمل ہفتے میں ایک بار کریں۔ شیمپو کرنے کے بعد سرکہ اور عرق لیموں برابر مقدار میں ملا کر کھوپڑی پر مساج کرنے سے بھی خشکی کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اگر ان مشوروں پر باقاعدگی سے عمل کرنے کے باوجود خشکی ختم نہ ہو تو اینٹی ڈینڈرف شیمپو استعمال کریں۔ سویابین آئل بھی بالوں کے لیے مفید ہے۔

کنڈیشننگ کے طریقے

آپ کے بالوں کو زیادہ حفاظت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ کام کنڈیشنرز سے لیا جاتا ہے۔ اگر آپ کے بال اچھی حالت میں ہوں تو پھر بھی انہیں اچھی حالت میں رکھنے کے لیے کبھی کبھی کنڈیشننگ کرنا ہی پڑتی ہے۔ کیونکہ آپ جب بھی بال دھوتی ہیں تو ان کے کیوٹیکلز کھل کر پھول جاتے ہیں' جبکہ کنڈیشنرز انہیں دوبارہ بند کر کے ان میں چمک اور صحت پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں' اس کے علاوہ کنڈیشنرز بالوں کو نمی اور پروٹین بھی مہیا کرتے ہیں۔